"ادب علوم کا زیور اور فنون کا سنگار ہے"

عروس ادب

یعنی

ہوش بلگرامی

کے

اخلاقی، ادبی، تاریخی، اور سیاسی مضامین کا مجموعہ

سنہ ۱۹۲۷ء

فہرست مضامین

اخلاقیات

ادبیات

تاریخ

سیاسیات

Syed Nazir-ul Hassan "Hosh" Bilgrami.

تقدیم
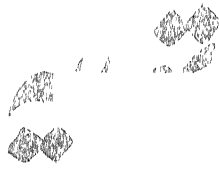
"عروسِ ادب" اپنی فرخندہ بختی پر جتنا ناز کرے کم ہے کہ آقائے ولی نعمت کرنل ہز ہائینس عالیجاہ فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ مخلص الدولہ ناصر الملک امیر الامراء نواب سر سید محمد حامد علی خان بہادر مستعد جنگ جی۔سی۔ایس۔آئی۔جی۔سی۔آئی۔ای۔جی۔سی۔وی۔او۔اے۔ڈی۔سی۔ٹوکنگ امپرر فرمانروائے دارالسرور رامپور کی خسروانہ نظروں نے اسے شرفِ قبول بخشا۔

نازاں منم کہ ہمچو توئی قدردانِ من

ہوش بلگرامی

تعارف

(مولانا مولوی عبدالحق صاحب بی، اے آنریری سکرٹری "انجمن ترقی اردو)
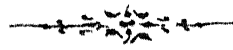
"ہوش" صاحب کے مزاج مین غضب کی جلدی ہے، باتین جلدی جلدی کرتے ہین، جواب جلدی دیتے ہین، پڑھتے جلدی ہین، لکھتے جلدی ہین، اور سوچتے جلدی ہین - انکی عجلت او مستعدی کو کوئی اُس وقت دیکھتا، جب یہ "**ذخیرے**" کے ایڈیٹر تھے - صبح کہین، شام کہین، دوپہر کہین، رات کہین، اور پھر مضمون لکھنے بیٹھے تو جلدی جلدی سب کچھ لکھ ڈالا، نظر ثانی کی نوبت نہین آئی کہ چھپ گیا - یہ اُنکی مستعدی اور تیز قلمی تھی کہ "**ذخیرہ**" **حیدرآباد** کا نامی رسالہ ہوگیا اور اچھے اچھے لوگون کی نظر سے گزرنے لگا - یہ اُسی زمانے کا شوق ہے جسکا سلسلہ ابتک جاری ہے اور اب بھی وہ فرصت کے وقت کبھی کبھی رسالون اور اخبارون مین برابر لکھتے رہتے ہین - یہ کتاب جس کا نام اُنھون نے "**عروسِ ادب**" رکھا ہے، اُنہین مضامین کا مجموعہ ہے۔ مضامین کی ترتیب سے بھی "ہوش" صاحب کا سلیقہ معلوم ہوتا ہے - مختلف مضامین کو خاص خاص عنوانون کے تحت مین جمع کیا ہے، کہین وہ اخلاق پر طبع آزمائی کر رہے ہین، کہین علم و ادب پر گلفشانی فرما رہے ہین، کسی جگہ اپنی سیر و سیاحت کے حالات سے دل لُبھا رہے ہین، او

کسی جگہ میدانِ سیاست مین قدم رکھتے ہوئے نظر آتے ہین - اگرچہ وہ میدانِ سیاست کے مرد نہین، اور نہ کبھی اُنہون نے اسکا غور سے مطالعہ کیا ہے، لیکن ذہن کی تیزی اور مزاج کی عجلت اتنا موقع کہان دیتی ہے، جو خیال مین آیا سپردِ قلم کر دیا - اب ناظرین کے حوالے ہے[1] -

"ہوش" صاحب ناثر بھی ہین اور ناظم بھی ہین اور بڑے مشاق لکھنے والے ہین - انکا طرزِ بیان بہت بیساختہ ہے اور ہر ہر جملہ پکارے بول رہا ہے کہ مین "ہوش" ہون، جسے اس مین شبہہ ہو، وہ "**عروس ادب**" کا دیباچہ دیکھ لے - اسکی عبارت کیسی پاک صاف شستہ اور بیساختہ ہے، طرزِ بیان صاف بتا رہا ہے کہ کسی شگفتہ دماغ کے قلم کا نتیجہ ہے -

عبدالحق

---

[1] غالبًا مولانا نے اِس مجموعہ کے چند مضامین پڑھکر یہ سطرین بہت عجلت مین تحریر فرما دی ہین - مین اپنی فطری جلدبازی کا احترام کرتے اور مولانا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس دائمی مواصلت پر نازان ہون - "ہوش"

تقریب

(مولانا مولوی سیّد عبدالماجد صاحب بی، اے، دریابادی)

ہوش "ذی ہوش" میرے پُرانے عنایت فرما ہین - حیدر آباد مین انکے عروج و زوال دونون کا تماشہ اِن آنکھون نے دیکھا ہے، ایک وقت وہ تھا، جب ہوش کی ہوشمندی کا ہر طرف چرچا تھا، "**ذخیرہ**" کی کنجی انکے ہاتھ مین تھی، اور "ذخیرہ" ادبی لطافتون اور رنگینیون، شاعرانہ نزاکتون اور دلفریبیون کا "ذخیرہ" ہی نہین، پورا "گودام" بنا ہوا تھا - ایک وقت وہ بھی آیا کہ ہوش مع اپنی "ہوش رُبا" کے اس جنت ارضی سے رخصت ہو گئے - اور ایک ظریف کو برجستہ یہ مصرع یاد آگیا - **ع**

"ہوش" رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ !

ایسے ہی واقعات عبرت سے ہم جیسے "بہوشون" تک کے ہوش اُڑ جاتے ہین !

مزاج عاشقانہ پایا ہے، اِس لئے قدرتہً عاشقون کی گردشِ تقدیر بھی لازمی تھی - ارض "فلک نما" پر **خسرو دکن** کے الطافِ کریمانہ سے سرفراز تھے، یمین السلطنتہ **شاد** کی عنایتون سے شادکام تھے، عماد الملک بہادر کے سایۂ تربیت مین پروان چڑھ رہے تھے کہ دفعتہً یہی زمین انکے حق مین آسمان بن گئی - "فلک کج رفتار" کے فرضی افسانے، شاعری کی دُنیا مین، خدا معلوم کتنی بار سُن سُنا چکے تھے، اب وہ "آپ بیتی" تھے لیکن بالآخر سرزمین رامپور کی کشش نے انہین "اپنا لیا" سنتا ہون کہ یہان افواج ریاست کے بخشی ہونے کی عزت انہین بخشی گئی ہے

لیکن انہین تو اُردو کے لشکر کا بخشی ہونا تھا، انکی فوج مین تو انشا کی تلوارین چمکتی تھین، زبان کے پیادے بھرتی ہوتے تھے، ادب کے رسالے نکلتے تھے، فصاحت کی پلٹنین آراستہ ہوتی تھین، بلاغت کے قلعے تعمیر ہوتے تھے، شاعری کے معرکے سر ہوتے تھے اور مشاعرون کی توپین ڈھلتی تھین! ہز ہائنس نواب صاحب بہادر رامپور بالقابہ محض شاعر ہی نہین، بلکہ ماشاء اللہ شاعر نواز بھی ہین، انکے لئے اس مجاز کو حقیقت مین تبدیل کر دینا کیا دشوار ہے!

اُردو کے ایک نامور ادیب نے عرصہ ہوا مجھے ایک خط مین لکھا تھا کہ "ہوش" تو بڑی رقم نکلے"۔ یہ بالکل درست تھا، اور کیون نہ درست ہوتا۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم کی سالہا سال کی صحبت و تربیت تو بیہوشون کو ذی ہوش بنا سکتی تھی، چہ جائیکہ اُسکو جو مجسّم ہوش ہو! اس بزرگ فاضل نے ہوش کو یہی نہین کہ مدتون مثل اپنے عزیز کے رکھا، بلکہ بعض مضامین کو بھی اپنی اصلاح سے مشرف فرمایا، اور غالباً ہوشمندی کے اندازہ کے بعد ہی یہ تخلص "ہوش" بھی عنایت فرمایا تھا! خدا سے ہوش سے دعا ہے کہ اس "ستارۂ بلندی" کی تابش مین اضافہ کرتا ہے!

فاضل دوست، مولوی عبد الحق صاحب کا ارشاد ہے کہ "ہوش کے مزاج مین غضب کی جلدی ہے۔ جلدی ہو یا نہ ہو لیکن تیزی تو یقیناً ہے۔ دل تیز، ہاتھ تیز، پیر تیز، سوجھ بوجھ تیز، قلم تیز۔ خیریت یہ گزری کہ زبان نہین تیز۔ ورنہ اور ہر شے مین تیز! اور محض تیز ہی نہین، بلکہ تیز و طرّار! انکی تیزی و طرّاری، شوخی و رنگینی کے جلوؤن کی آئینہ داری اگر منظور ہو تو بسم اللہ "**عروس ادب**" کے چہرے سے نقاب اُلٹ کر خود ملاحظہ فرما لیا جائے!

خوش سلیقگی اور لطافت پسندی ہوش کے خاص جوہر ہین۔ انکے نمونے اگلے صفحات کے سطر سطر مین ملین گے۔ اِن جواہر پارون کی قدر و قیمت کا پرکھنا مرحوم مہدی حسن صاحب

(افادات مہدی) جیسے اہلِ نظر کا کام تھا ہم تماشائی تو محض اِس بزم رنگین کی سجاوٹ کو دُور سے دیکھکر خوش ہو جانے والے ہین! "عروسِ ادب" کی کائنات مین اُنھون نے اخلاق، ادب، معاشرت، سیاسیات، ہر شعبۂ موجودات کا جائزہ لے ڈالا ہے، اور ہر مَیدان مین گام زنی فرمادی ہے، لیکن انکی پائے نازک کی سُبک خرامیون کے لیے ادبیات ہی کا فرش مخملین کچھ زیادہ مَوزون ہے! خداے پاک انہین زیادہ فرصت و فراغت نصیب کرے کہ زبان و ادب کی زیادہ گران مایہ خدمات انجام دے سکین اور جس عروس کا ڈولہ اپنے گھر لائے ہین، اسکا اور انکا دونون کا نصیبہ بلند ہو!

عبدالماجد

دیباچہ

مجھے اپنا وہ عہدِ طفلی اب بھی یاد ہے، جب مین چھپر کے نیچے بوریہ پر بیٹھکر عربی مین میزان و منشعب اور فارسی مین آمدنامہ و دستور الصبیان پڑھا کرتا تھا۔ والدِ مرحوم (خدا مغفرت کرے) تخت کے چوکون پر گاؤ تکیہ لگائے پڑھایا کرتے تھے اور میری ان کتابون سے غیر دلچسپی کو محسوس فرماتے تھے میرا کمسن دماغ ان خشک مضامین سے اُلجھتا تھا، شوخ طبیعت گھبراتی تھی مگر تادیب کے خوف سے سر جھکائے ہوئے ہل ہل کر آواز سنانے کو پڑھا کرتا تھا گلستان کے پانچوین باب کو شوق سے پڑھتا ہی نہ تھا بلکہ اُسکے سحر آگین جذبات سے متاثر ہوتا تھا جب اس مکتب خانہ سے فارغ التحصیل ہو گیا، اور "کلام مجید" بھی طوطون کی طرح رٹ کر "اندھا حافظ" بن گیا اور حلوائی کی دُکان سے مٹھائی بھی منگوالی اور رند ہب نے اُس پر فاتحہ بھی پڑھ دیا اور معدہ سے بھی تشکر کی آوازین آنے لگین تو تعلیم کا قدم گھر سے باہر نکلا۔ بنچون پر بیٹھنے والے اسکول مین داخل ہوا۔ وہان اقلیدس سے بھی سابقہ پڑا اور ریاضی سے بھی، جن کی میرے دماغ مین سمائی ہی نہ تھی، مگر "مرتا کیا نہ کرتا" جبریہ سعی ناکام کرتا رہا۔ جماعت مین اپنی کمزوری سے نڈھال رہا اور طلبہ کی اصطلاح مین "پھسڈی" مین نے اپنا لقب خود تجویز کر لیا۔ "انوارِ سہیلی" کے اخلاقیات اور گلستان و بوستان کے اخلاق نواز قصے جو ادبیات کے جان ہین اُن سے طبیعت کو لگاؤ تھا، یہی فطری ذوق جماعت مین ممتاز رکھتا تھا اور ساتھیون کو شرمندہ کرنے کے لئے

کاٹی، جون تون کرکے اس زندگی سے بھی نجات ملی۔

قصبہ (بلگرام)، کا باشندہ تھا اور وہ بھی وہ قصبہ جہان کسی زمانہ مین علم کے سمندر بہا کرتے تھے، وہان مجھ بدنصیب کے وقت مین کوئی تالاب بھی نہ تھا۔ حسان الہند آزاد کا کتب خانہ کوڑیون کے مول بنیون کی دُکانون پر پڑیون کے کام آگیا۔ غریب کا گھر تک و بستر زمانے سے محل سے کھیت ہو گیا، نہ وہان کوئی دار المطالعہ تھا اور نہ تعلیم و تعلم کے چرچے بیسوین صدی کے جن بلگرامیون کے علم و فضل کے ڈنکے بجے ہوئے تھے وہ دکن کو آباد کر چکے تھے۔ کوئی وہان ابونصر کی یاد دلا رہا تھا، اور کوئی ابنِ خلدون بنا ہوا تھا بیٹھتا تو کہان، سیکھتا تو کس سے! اور فائدہ پہونچاتا تو کون! ناداری کے اس قحط نے دربدر پھرایا، پہلی جست مین سولہ میل پہونچا اور اپنے ضلع (ہردوئی) کے مشہور ناولسٹ کی ناولین (گورا وغیرہ) مطالعہ کرنے لگا۔ اقلیدس مین ایک منٹ کا بھی چکر نا گوارا تھا مگر ع

"گوری دھیرے چلو گگری چھلک نا جائے"

کا کیف اُس وقت کا اب تک موجود ہے۔ اس مین نہ کبھی جی گھبرایا اور نہ کبھی وحشت ہوئی جب حکیمِ ہردوئی کا ذخیرہ ادب ختم ہو گیا تو مولانا شرر کے "ایام عرب" سے ریگستانی ذرات چھننے لگا جس نے مذاقِ ادب کو سنوار کر مستقل رشتہ جوڑ دیا جو زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔

شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی جب یورپ کی تعلیمگاہون سے فرصت پا کر اور دکن کے خدمات سے وظیفہ یاب ہو کر وطن سے قریب ہردوئی مین اقامت گزین ہوئے تو مجھ ۲۰ سالہ نوجوان کو ہونہار سمجھ کر اپنی علمی خدمتگزاری مین قبول فرما لیا۔ اُس وقت جناب شمس العلماء تمدن ہند کو فرنچ سے اُردو قالب مین ڈھال رہے تھے۔ مین ۲۴ گھنٹے طالب کی خدمت مین حاضر رہتا تھا۔ اُنکے عالمانہ تبحر اور زبان دانی کے شوق پر حیرت ہوتی تھی کہ ایک فاضل بزرگ ساٹھوین سال مین بھی تحصیل علم مین جی لگا رہا ہے۔ افسوس کہ اس زمانہ نے بہت تھوڑی عمر پائی اور مجھکو معیت کا زیادہ موقع نہ ملا۔ ۱۹۱۱ء مین اُنکی حرکتِ قلب

بند ہوگئی اور اُنھون نے ہمیشہ کے لئے آنکھین بند کرلین، اُنکا علم کدہ اُجڑگیا، وہ طالب علمانہ چرچے اُنکی موت کے ساتھ رخصت ہوگئے، آخر اُن کے لٹے ہوئے قافلہ کے ساتھ مجھکو حیدرآباد دکن جانا پڑا۔

حیدرآباد دکن مین شمس العلماء مغفور کے منتخب و بہترین کتبخانہ کی سیر نے میرے دماغ کو متجسس بنادیا۔ ہر فن کی، ہر زبان کی ٹکسالی کتابین سلیقہ سے جمع تھین پھر وہان کے اہل علم کی صحبتین کتب بینی سے زیادہ میرے حق مین اکسیر ثابت ہوئین ہندوستان کے رسائل و اخبار بھی منگانا شروع کردئے زمانہ بھی جاری کرایا اور ادیب بھی، مخزن کی بھی زندہ دلی سے ہشاش بشاش رہا اور نقاد کی بھی دلگیر شوخیان دیکھین، حسن کے بھی عالمانہ مضامین پڑھے اور مخزن الفوائد مین بھی ہوا اور پانی سے[1] دل و دماغ کی تفریح ہوئی۔ دارالمصنفین کے علمی مطبوعات اور معارف کے علمی مضامین میرے دماغ کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھے کثرتِ مطالعہ نے ایک ہیجان پیدا کردیا جس کا نتیجہ ذخیرہ (ماہوار رسالہ) کی صورت مین ظاہر ہوا۔ جو ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ رشک و حسد مشرقی قومون کی فطرت ہے۔ بارگاہِ آصفی مین ذخیرہ کی مقبولیت و رسائی آنکھون مین کھٹکنے لگی، آخر میرے ہی ایک ہموطن کی حکیمانہ تشخیص سے ذخیرہ اپنی عمر طبعی سے پہلے فنا ہوگیا اور مین بھی اعزہ واحباب سے بغلگیر ہوکر دل تھامے ہوئے دکن سے مرخص۔

ڈاکٹر نواب عمادُالملک بلگرامی بالقابہ کی عالمانہ بارگاہ مین مجھے حاضری کا روزانہ موقع ملتا تھا اور آٹھون پہر وہان علم وادب ہی کے چرچے رہا کرتے تھے مین خاموشی سے ہر اُس مسئلہ کو سُنا کرتا تھا جو نواب بلگرامی کے عالمانہ دماغ سے ڈھلکر نکلا کرتا تھا، اِس لحاظ سے مین خوش نصیب ہون کہ مین جو لکھتا تھا نواب بلگرامی مدظلہ کے ملاحظہ مین پیش کردیتا تھا۔ اُنکی ترمیم و اصلاح مجھکو بناتی رہتی تھی۔ علامہ طباطبائی اور سرامین جنگ کی بھی صحبتون سے مجھے بہت فائدہ پہونچا۔ مہاراجہ یمین السلطنۃ بالقابہ کا عزانہ

[1] یہ ڈاکٹر نواب عمادالملک بلگرامی کا مضمون ہے۔

دربار داغ و امیر اور سرشار کی آخری بزم آرائیون کو یاد دلاتا تھا اور وہان یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مرنے والے ابھی یہان سے رخصت ہوے ہین - دکن سے چھوٹنے کا اگر صدمہ ہے تو صرف انھین قابلِ رشک صحبتون کی وجہ سے، ورنہ "امباڑے کی بھاجی" (سن کی پتیان) اور "چگر" (املی کی کوپل) یہان بھی تلاش کرنے سے اگر روز نہین تو فصل پر مل ہی جاتا ہے

رنگین عبارت لکھنے کا شوق مجھکو طالب علمی کے زمانہ سے تھا، مگر اُس وقت کی رنگینی مین عامیانہ پن تھا اس لئے اُسکا تلف ہو جانا ہی اچھا ہوا مضمون نگاری جس سے عبارت ہے اُسکی پیدایش ۱۹۱۵ء مین ہوئی اور ذخیرہ کے سبب سے اس لحاظ سے اگر اسمین کمسنی کی بیباک شوخیان جا بجا نظر آجاین تو عمر کے تکھر رکھاؤ سے تعبیر فرما لیجئے گا۔

دکن سے رخصت ہونے کے بعد سے مین نے تاجدار رامپور کے شاہانہ توجہات کی بدولت مطالعہ کو زندگی کا جزو اولین قرار دیدیا، خلوت خانہ مین بیٹھکر سیکڑون برس پہلے مر جانے والے بوڑھون سے خاموش باتین کرنا اپنا شعار بنا لیا، ذہانت نے برابر ساتھ دیا، معلومات کا دائرہ یوماً فیوماً وسیع ہوتا گیا، دماغ کی جولانی سے اپنے ڈھب کا جو موضوع ذہن مین آجاتا اُسکو لکھکر صفحۂ کاغذ پر محفوظ کر لیتا اور اخبار و رسائل کو بھیجدیتا، وہ پریشان خیالات بڑھتے بڑھتے اس قابل ہو گئے کہ اُن پر نظر ثانی کر کے، سلیقہ سے سنوار کے، مستقل صورت مین ایک لباس مین آپکے سامنے پیش کر دون، نہ یہ مضامین کوئی نئے ہین اور نہ ان مین کوئی ندرت و جدت اور نہ اچھوتے خیالات، مگر بھٹکے ہوے دماغ کی کاوش کا نتیجہ ضرور ہین - دیوان کا ایک شعر شاعر کی حیات کا ضامن ہے، اسی طرح نثر کا ایک فقرہ بھی ناثر کی زندگی کے لئے بس ہے - اتفاق سے اگر کوئی بات نکل آئے تو یہی میری کیلی راتون کا صلہ ہے

رام پور اسٹیٹ - یو - پی
۲۴ - جنوری ۱۹۲۶ء

ہوش بلگرامی

اخلاقیات

العلم قوة

ایک ایسا زبردست اور مشہور مقولہ ہے جسکی صداقت ہر زمانہ مین مسلم رہی اور سبھی ادوار مین اسی قوت سے ممتاز و سربلند ہوئین۔ اگر ہم زمانۂ ماضی کے مختلف اقوام کے غلبہ و عروج کا سراغ لگانا چاہین یا زمانۂ حال مین اقوام یورپ کی قوت کے صحیح اسباب معلوم کرنا چاہین تو اُنکی قوت کا راز نہ تو ہمکو اُنکے قوائے جسمانی کی ساخت مین ملیگا اور نہ اُنکی ماہیت ارضی و طبعی (آب و ہوا) مین۔ بلکہ یہ راز ہمکو اُن کے ذہنی و عقلی ارتقا مین ملیگا۔

جب ہمارا زمانہ تھا اور اس قوت سے ہم زور آزمائی کر رہے تھے تو ابن رشد اور ابو نصر ایسے پہلوانانِ علم اکھاڑون مین نظر آتے تھے، ابن بطوطہ بھی دنیا کی سیر کرتے پھرتے تھے اور ابن خلدون بھی فلسفیانہ موشگافیون مین مصروف رہتے تھے۔ امام غزالی بھی عالمانہ گتھیون کو سلجھایا کرتے تھے۔ اور بو علی سینا بھی "اشارات" مین اشارہ کیا کرتے تھے۔ عرب کا فرزدق بھی فی البدیہہ قصیدے پڑھا کرتا تھا اور ایران کا فردوسی بھی "مانند سنان گیو در جنگ پشن" کی تلمیح صرف کرکے برجستہ مصرع لگا دیتا تھا، خیام کی حکیمانہ شاعری سمجھنے والون کو سر دھنواتی تھی اور مولانا رومی کی "زبان پہلوی" وجد مین لاتی تھی، بغداد کی علمی درسگاہین درس و تدریس کی ضامن تھین، شام کا بیت المقدس اس قوت کا حامی تھا اور مصر کی رود نیل سے بھی فقہ و حدیث کی موجین اور فلسفہ و حکمت کے طوفان اُٹھا کرتے تھے اور ادھر ہمارا ہندوستان بھی اپنے بوریہ نشین علما کو "گنگا جل" پلا پلا کر ذہنی و عقلی پیاس بجھانے مین مصروف تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانون کی ذہنی وعقلی ترقیون کی سطح دیگر اقوام عالم سے مرتفع تھی آنحضرتؐ کے بعد ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ حکماے یونان کی تصانیف کا ترجمہ عربی زبان مین ہوگیا۔ ہارون الرشید کے عہد مین ہر مسجد کے ساتھ ایک ایک مدرسہ بھی قائم ہوگیا اور مامون کا عہد خلافت تو تاریخ اسلام مین عہد زرین بنگیا۔ عظیم الشان کتبخانون کا قیام، دربار مین علما و فضلا، کا اجتماع، بغداد کو علوم وفنون کا مرکز بنائے ہوئے تھا گو اسلامی سلطنتون مین آئے دن انقلاب بھی ہوتے رہتے تھے مگر مسلمانون کی اس علمی قوت کو سیاسی انقلاب بھی نہ گھٹا سکے۔ بنی عباس ایشیا مین، بنی فاطمہ مصر مین، اور بنی امیہ اندلس مین، ایک دوسرے کے سیاسی رقیب بنے ہوئے تھے لیکن علم وحکمت اور ادب و انشا، کی سرپرستی مین ہر ایک کی یہی کوشش رہتی تھی کہ اپنے سیاسی حریفون کو علمی داؤ پیچ سے پچھاڑ دیا جائے۔

تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک مسلمانون کے گھرون مین علوم وفنون کے چراغ جلتے رہے اُن کا ذہنی وعقلی تفوق بھی چودھوین کا چاند بنا رہا اور اُن کا تمدن بھی چمکتا رہا۔ یہ ممتاز برتری جو اُنکو اقوام عالم پر حاصل ہوگئی تھی اُسکا راز اُن کی ذہنی وعقلی تربیت مین پوشیدہ تھا، ذہنی وعقلی کھیتی نہ اُس وقت تک نشو ونما پا سکتی اور نہ اُسوقت تک سرسبز ہوسکتی ہے جبتک وسیع مشاہدات اور مفید معلومات کی "کیمیاوی کھاد" حسب ضرورت اُسمین نہ پڑتی رہے جب تک یہ "کھاد" پڑتی رہی، پیداوار کی کثرت ذخیرۂ تاریخ مین اب بھی موجود ہے جیسے اسمین کمی ہوئی وہ لہلہاتی کھیتیان مُرجھا گئین وہ شاداب زمینین خشک ہو کر بنجر ہ گئین۔

متمدن اور ترقی پزیر اقوام نے اپنے اپنے افراد قوم کی ذہنی وعقلی نشو ونما کے لیئے اس "کیمیاوی کھاد" کو قدم قدم پر اکھٹا کر کے ہر فرد کو زحمتون سے بچا دیا تاکہ عقلی وعلمی آزادی سے ہر شخص مستفید ہوتا رہے۔ یورپ وامریکہ مین تعلیم کی ارزانی وعمومیت، کتب خانون، دار المطالعون، اور مدرسون کی بہتات سے دیکھ لیجیے اور آج یورپ کی ترقی اسی "کیمیاوی کھاد" اور اسی "تثلیث" ہی کی کثرت پر ہے، یورپی اقوام کے

دور ترقی مین یہی وہ قوّت "تثلیث" ہے، جس نے اُنکے تخیلات، احساسات اور جذبات کو قوی تر بنا دیا ہے۔ لاکھون کتابین، ہزارون روزانہ اخبار، اور سیکڑون ماہانہ رسالے مختلف علوم و فنون پر شایع ہو ہو کر آناً فاناً اطرافِ عالم مین خوشبو کی طرح پھیل جاتے ہین اور قوم کے دماغون کو معطر کرتے ہوئے خیالات کو سنوارتے اور بہتر بناتے رہتے ہین۔

اسی علم کی قوت نے قومیّت کا احساس پیدا کیا، اسی قوت نے حقوق شناس بنایا، اسی کی قوت سے ہم بھی قوی ہو سکتے ہین، اسی کی قوت سے ہم بھی دنیا مین پنپ سکتے ہین، اسی کی قوت سے ہماری بھی نکبت و فلاکت دور ہو سکتی ہے، اسی کی قوت سے ہمارا بھی پردۂ جہل اُٹھ سکتا ہے، اسی کی قوت سے ہم نیک و بد مین تمیز، کھرے کھوٹے مین فرق اور سونے و پیتل مین امتیاز کر سکتے ہین، یہی قوت ہم کو سچائی کے راستہ پر چلا سکتی ہے، یہی قوت ہمارے قومی شیرازے کو درست کر سکتی ہے، یہی قوت ہمکو خود دار بنا سکتی ہے، یہی قوت ہم مین محبّت کا حقیقی جذبہ پیدا کر سکتی ہے، یہی قوت ہمکو تہذیب و متانت سکھلا سکتی ہے، یہی قوت ہمکو ضبط و صبر کا سبق پڑھا سکتی ہے۔ غرضکہ یہ قوت زمانہ کی تمام قوتون سے قوی ترین اور ممتاز ترین ہے، اسکو جتنا بڑھاتے جاؤ گے بڑھتی رہیگی، نہ اس قوت کو چور چُرا سکتے ہین اور نہ رہزن لوٹ سکتے ہین، نہ پانی بہا سکتا ہے نہ آندھی اُڑا سکتی ہے، جس نے اس پر قبضہ کر لیا وہ شاہنامہ کا روئین تن رستم داستان بن گیا، اسکی زندگی زندگی ہے اور اسی کی قوت قوت ہے۔

کامیاب زندگی

دنیا مین کامیابی کا راز ہمت کی سچائی، استقلال کی پامردی اور کوشش کی جفاکشی مین پوشیدہ ہے، انسان اُسوقت تک اپنے ارادون مین کامیاب نہین ہو سکتا، جبتک انکو اپنا حقیقی دوست اور سچا مصاحب نہ سمجھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک جاہل و سست آدمی کوشش و جفاکشی کے بغیر ترقی کے دشوار گزار منازل طے کر سکے اور اس عامیانہ خیال پر اعتقاد جمالے کہ اگر خدا چاہیگا تو میری خواہشین بغیر دوڑ دھوپ کے پوری ہو جائینگی، خدا نے اعضائے جسمانی کے ساتھ عقل و شعور بھی عطا کئے ہین اور یہ قوت اس لئے دی ہے کہ انسان ضرورت کے وقت اُن سے کام لے، نہ اس لئے کہ اپاہج بنا بیٹھا رہے اور اسکی پھر آرزو بھی رکھے کہ اپنے مقصد مین کامیاب ہو، مذہبی نقطۂ نظر سے خدا کی قدرت کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہین، مگر خدا عالم الغیب ہے وہ اپنے بندون کے رگ و ریشہ سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ بغیر چلے پھرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہنا چاہتا ہے اور بغیر محنت و کوشش کے اپنے مقصد مین کامیابی کا بھی متمنی ہے۔ خدا اُس وقت تک انکا ساتھ نہین دیتا جب تک وہ اپنے کامون مین اپنی امکانی کوشش اور دوڑ دھوپ سے کام نہ لین اور اسکو اپنی زندگی کا ایک لازمی و واجبی فرض نہ سمجھین۔

دنیا مین جن لوگون نے شہرت و ناموری، عزت و وقعت، بھروسہ و اعتماد اور علم و فضل حاصل کیا ہے۔ اُنہون نے کون سے ایسے غیر معمولی طریقے اختیار کئے تھے جنکی بدولت آج اُن کا نام

چار دانگ عالم مین مشہور ہے، ایسے بھی مشاہیر گزرے ہین جنکی ابتدا تو پست تھی مگر ابھرنے والے مادّے نے ظاہر ہوکر بلند کردیا، انھین لوگون سے ہمکو سبق ملتا ہے جنکی ابتدائی حالت پر غور کرنے سے اسکا سان و گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ انکی زندگی کامیابی کی اس حد پر پہنچکر ناز کریگی، اُنکی ہمت و کوشش اور محنت و جفاکشی کے صلہ مین خدا نے بیڑا پار کردیا اور آج دنیا مین کون ایسا ہے جو اُنکے کارنامون اور اُنکے مفید کامون پر حیرت نہین کرتا۔

اگر انسان چند واجبات پر نظر رکھے اور اُسکو اپنا مآلِ زندگی سمجھے تو اُنکے سہارے سے اپنی زندگی کو کامیاب و خوشگوار بنا سکتا ہے۔ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے پہلی کوشش علم کے لئے ہے، اگر علم کی لازوال دولت پر قبضہ ہوگیا تو زمانہ سے شرمسار نہ ہونا پڑیگا، کیونکہ علم مفلس کے لئے دولت اور دولتمند کے لئے مایۂ عزّت ہے، علم نوجوانون کا معاون و مددگار اور ضعیف کا سہارا و آسرا ہے، علم ایسی دولت ہے جو واقفکارون اور ہنرمندون کے ہاتھون مین دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور ناعاقبت اندیش اور ناسمجھ اشخاص کے بے ڈھنگے ہاتھون مین ضرر رسان ڈنڈا ہے، علم کو اپنی جیبی گھڑی کی طرح جیب مین محفوظ رکھو، نمود نمایش کے لئے باہر نہ نکالو، اگر کوئی وقت دریافت کرے تو بتادو، مگر سنتریون کی طرح ساعت بساعت اور بلا دریافت وقت کا ڈھنڈھورا نہ پیٹتے پھرو، علم کے ذریعے سے صانع قدرت کی شان کریمی پر نظر رکھکر کسی کام کو کرنے کے لئے ہمہ تن مستعد ہوجاؤ۔ اور ناکامیون کا جو درمیان مین حائل ہون مردانہ وار مقابلہ کرو اور استقلال کو اپنا پیشوا و رہنما بناکر کامیابی سے بغلگیر ہو لو۔

علم کی تحصیل اگر صحیح طریق سے کیجائے، تو اس سے نوجوان صاحب غور و فکر، محنت کش، اعتمادِ نفس کے خوگر، ہوشیار و محتاط، و توجہ کے عادی ہوجاتے ہین اور ضعیف ہشاش بشاش اور نفع رسان بنجاتا ہے، علم خوشحالی مین زیور، تنگحالی مین ماوا و ملجا اور ہر حال مین ایک پر سکون

تفریح ہے۔ تنہائی اسکی فرحت اور یکسوئی اسکی مسرت ہے، طبیعت مین اس سے اعتدال پیدا ہوتا ہے اور فطرت اسی سے جِلا پاتی ہے، جو لوگ دنیائے علم مین ھل من مزید کے قائل اور ہر آن علم کی جستجو مین رہتے ہین، اُنکی تلاش ناکامی کا مُنہ نہین دیکھتی۔ بلکہ تلاش کی زیادتی اُنکے دامن تمنا کو گوہر علم سے بھرتی رہتی ہے، یہ وہ خوش قسمت اشخاص ہین جو ہر وقت کچھ دیتے اور لیتے رہتے ہین، داد وستد کا یہ مد و جزر ہی انسانی خوشی کا ماحصل ہے جسکی نشاط انگیز کیفیت سے وہی آشنا ہو سکتا ہے، جو تحصیل علم کا خواہان ہو علم عقل اور آنکھ کا ایک ایسا نور ہے جو آنکھ سے پوشیدہ چیزون کو نہایت آسانی سے دکھا دیتا ہے، خدا کو سب نے علم کی مدد سے، عقل کی رسائی سے پہچانا ہے، جبتک انسان علم کے زیور سے اپنے دل و دماغ کو آراستہ نہ کریگا، اس کا وجود بے بنیاد اور اسکی زندگی بے سود ہے۔

دوسری چیزین جو کامیاب و کامگار کر دیتی ہین، وہ عمدہ اخلاق و عادات ہین۔ یہ اوصاف ایسے بے بہا اور انمول ہین جنکی دنیا مین قیمت ہی نہین ہے، اُن سے دنیوی کاروبار مین سہولت کے علاوہ آخرت کا اعمال نامہ بھی سیاہ نہین ہوتا اور انجام کار یہ بیش بہا جواہر اپنی اصلیت و سچائی کو ظاہر کئے بغیر نہین رہتے۔

دریا مین وہی شخص آگے بڑھتا ہے جو اپنے سینے اور بازوؤن کی طاقت سے اپنے لئے راستہ نکالتا ہے بعض وقت خوش قسمت لوگ ایسے حالات مین بھی پیدا ہوئے ہین کہ انھین ابتدائے عمر سے عزت و دولت پیدا کرنے کے وسائل میسر تھے۔ تاریخ کی ورق گردانی بتاتی ہے کہ اگلے زمانے والون کی زندگیان عیش و عشرت سے بسر ہوتی تھین، وہ رنج و دُکھ سے ناواقف ہوتے تھے اگر اتفاقاً کسی تکلیف نے اپنی منحوس صورت دکھا بھی دی، تو وہ لوگ شیرون کی طرح مقابلہ کے لئے فوراً طیار ہو جاتے تھے۔ ہمارے پاس نہ عیش و عشرت کے سامان ہین اور نہ مصائب کے مقابلہ کی ہمت خیالات مین پستی اور دل کی کمزوری ہماری سرشت کا جزو ہے ہم جس منزل پر پہنچنا چاہتے ہین اسکا راستہ اگر کٹھن ہے اور مہینون برسون کا، تو

راستہ کے قُرب و بعد کا خیال ہی پست ہمتی ہے، وہ راہین جن مین اگلے لوگ مسافرت کر کے منزل مقصود پر پہنچ گئے ہین، اب تک کھُلی ہوئی ہین اگر ہم اُنکے نشاناتِ قدم پر چلین گے، تو کوئی وجہ نہین کہ ہماری سانس بھی وہین جا کر نہ رُکے۔ بفرضِ محال اگر وہان تک قدمون نے نہ ساتھ دیا، جہانتک انکی رسائی تھی، تو جہان تک ہم پہنچ سکین وہ بھی ہمارے لئے کچھ کم منفعت بخش نہ ہوگا۔ دنیا مین ابھی ایسے لوگ موجود ہین جنکی سیرت کا مطالعہ ہماری اصلاح کر سکتا اور ہمین منزلِ مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔

دنیا کے سربرآوردہ لوگون نے اکثر نہایت غربت و فلاکت سے بلند مرتبون تک ترقی کی تھی۔ نپولین اعظم کو فرانس مین دیکھئے، امیر تیمور اور نادرشاہ کو ایران کے آتش خانون مین تلاش کیجئے۔ اور انکی ابتدائی حالت مورخون کی زبان سے سُنئے، اینڈرو کارنیگی اور مسٹر سیسل روڈز جنکے نام زبان زدِ خاص و عام ہین اُنکی ابتدائی تنگی و پریشانی سے ہم ناواقف نہین ہین، سر ٹامس لپٹن مشہور تاجر چاے، جو چار دفعہ کئی کئی لاکھ روپیہ کے خرچ سے کشتیان بنوا کر امریکہ کی مشہور بحری دوڑ مین حصہ لے چکے ہین۔ پہلے پہل نصف کراؤن (عہ) فی ہفتہ کی تنخواہ پر ایک دُکان پر سامان اُٹھانے اور خطوط رسانی کی نوکری کر چکے ہین۔ امریکہ کے مسٹر اڈیسن آج اپنی برقی ایجادات کی بدولت و ایسان ریاست کی برابر آمدنی رکھتے ہین، لیکن اُنھون نے ریلوے ٹرین پر اخبار بیچنے والے لڑکے کی حیثیت سے اوقات بسر کرنی شروع کی تھی اور پھر تار گھر مین ملازم ہوئے تھے۔ سر ہیرام میکسم جنکی کلدار توپین گزشتہ لڑائیون مین انسانیت کا صفایا کر چکی ہین، ساٹھ برس پہلے نیو انگلینڈ کی جھاڑیون مین ننگے پاؤن پھرنے والے لڑکون کی طرح گشت لگاتے اور گاڑی سازی کی دُکان مین خراد کا پہیہ پھراتے تھے۔ تجلی پرست لارڈ ریڈنگ (ہندوستان کے موجودہ ویسرائے) لڑکپن مین جہاز پر ادنی ترین حیثیت سے رہ چکے ہین اور ہندوستان کے ساحل پر اسی حیثیت سے جہازون کو دھو چکے ہین۔ اُنکی پہلی تقریر نے کپتان جہاز کے جذبات مین سطحِ آب پر تلاطم برپا کر دیا تھا جبکہ کھانے کی خرابی سے سب نے "اسٹرائک"

کردی تھی، یہ اپنی اس پہلی وکالت میں کامیاب ہوکر ترقی کے پہلے زینہ پر قدم رکھتے ہین اور لندن مین برسون "قانون وانصاف" کی کرسی کو زینت دیکر ہندوستان کی مخلوط قومون کی بلند گردنین انکے "مساعی" کے سامنے خم ہوجاتی ہین۔ برطانیہ کے لارڈ چانسلر لارڈ ایلڈن اور انکے بھائی لارڈ سٹویل نیوکیسل کے ایک کوئلہ والے کے لڑکے تھے۔ لارڈ سینٹ لیونارڈ ایک ایسے شخص کے بیٹے تھے جس نے لندن مین حجامت بنانے کی دُکان کھول دی تھی اور لارڈ ٹینٹرڈین تو زمانۂ طفولیت مین اپنے باپ کو ایک ایک آنہ اجرت پر لوگون کا خط بنانے مین مدد دیتے تھے۔

یہ وہ واقعات ہین جن پر تحسین و آفرین کی صدائین بلند ہوتی ہین اور دل سے انکی قابلِ رشک کامیابیون پر بیساختہ مبارکباد نکلتی ہے اور اُنکی ہمت و جرأت کی داد دینی پڑتی ہے، کاش ہمارے دل مین بھی اسکا مستقل جوش پیدا ہوجائے اور ہم بھی ان کے نقش قدم پر چلنے لگین۔ انکی ترقیان، انکی ذاتی محنت و قابلیت کی بدولت ظہور مین آئین، کیا ہم انھین ذرائع سے کام لیکر ترقی نہین کرسکتے؟ اسی قسم کا ایک اور واقعہ سُن لیجئے۔ ایک آہنگر وزارت کی جلیل القدر کرسی پر دکھائی دیتا ہے۔ خدا اُنھین کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہین اور یہی وجہ ہے کہ اس لوہار کے لڑکے نے اپنی عزیز زندگی کو کامیاب بناکر چھوڑا۔

۵۰ سال قبل شہر گلاسگو کے بازارون مین ایک غریب لوہا ڈھالنے والا لڑکا پھرا کرتا تھا۔ آج وہ لوہا ڈھالنے والا لڑکا زندگی کے کئی مرحلون سے گزرکر اور واقعات کی کئی منزلین طے کرکے اٹھاون سال کے بڑھاپے مین ہے، آج وہ برطانیہ کے پولیٹکل حلقون مین خاص شہرت و امتیاز رکھتا ہے اور گورنمنٹ کا مرکزی رکن ہے، اِسکا نام آرتھر ہینڈرسن ہے، مسٹر ہینڈرسن نے ترقی کے راستون مین لمبی لمبی چھلانگون سے کام نہین لیا، بلکہ وہ بتدریج ترقیون کی ایک روشن اور زندہ مثال ہے، اسکا قدم بامِ ترقی کے ہر ایک ڈنڈے اور سیڑھی سے گزرا ہے اور آخرکار اب وہ آسمان شہرت

جلوہ گر ہے، اس نے اپنی طاقت اور قابلیّت کے ذریعہ ظاہر ہونے والے نتائج کا مفید پھل پایا،
پہلے وہ آہستہ آہستہ نیوکیسل کی سٹی کونسل ڈارلنگٹن برگ کی کونسل اور مزدورون کی انجمن وغیرہ مین
داخل ہوا اور وہان سے پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوگیا اور اپنی سرگرمیون کے باعث حاکم شہر بنایا گیا۔
غرضکہ اس نے اپنی زندگی مین مختلف اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ ان سب فرائض کی انجام دہی
کوئی معمولی کام نہ تھا۔ آخر کار وہ اپنی زوردار کوششون اور قابلِ رشک محنتون سے ایک وزیر پریوی
کونسل مین نظر آگیا اور شاندار تقریرین کرکے اپنی شخصیت کو منوا دیا۔ اس سے بات چیت کرنے سے یہ
معلوم ہوتا تھا کہ اس مین قدرت کی عطا کی ہوئی وہ لازوال طاقت موجود ہے جو عبارت ہے مستحکم ارادے
عمدہ چال چلن، پختہ مقصد، عمدہ خصلت و عادت، راستی و راستبازی، اتحاد و اعتماد، تحریر و تقریر، تحمل و
برداشت، اور دیانت کی طاقت سے غرضکہ اُن خداداد طاقتون نے اسکے حوصلون کو بلند
کرکے کامیابی کے آسمان پر بٹھا دیا۔

دنیا مین ہزارون لوگ ایسے موجود ہین جو بتدریج کامیابی حاصل کرنے کے خواہان ہونگے جو
لوگ اس پر عمل درآمد کرنے پر مستعد ہین اُنکو چاہئے کہ کمر ہمت باندھ لین اور کاہلی و سہل انکاری کو خیرباد
کہہ کر کسی مفید کام مین کوشش شروع کردین، لیکن پوری تندہی ہمت، جرأت اور پورے استقلال و
وثباتِ قدم کے ساتھ اگر وہ ایسا کرینگے تو انھین یقیناً کامیابی کا بہترین ثمرہ حاصل ہوگا اور اُن کا
مقصد اُن کی محنتون اور جانکاہیون سے شرمندہ نہ رہیگا۔ خدا کسی کی محنت و کوشش کو
رائگان نہین کرتا۔ ارادہ مین پختگی اور خیالات مین دلجمی پیدا کرکے دیکھو کہ پردہ خفا سے کیا ظاہر ہوتا ہے
اور کیسے کیسے سربستہ راز کھل جاتے ہین۔

دُنیا ترقی کر رہی ہے اور ہم کو شرکت کے لئے بلاتی ہے کہ آؤ ہمارا ہاتھ بٹاؤ، ہم مین جذب ہو جاؤ
ہمارے ہم خیال بنجاؤ، محنت سے مستعدی سیکھو اور کوشش سے کامیابی کا درجہ حاصل کرو، خدا کی

ذات پر سوتے جاگتے بھروسہ اعتماد کرو، اپنے عقیدے کو یقین کا درجہ دیدو، پھر دیکھو خدا تمہاری کیسی مدد کرتا ہے اور تم کامیابی کا سہرا کس طرح سر پر باندھوا لوگے۔ صانع قدرت کی نیرنگیاں بزرگان سلف کی لکھی ہوئی تاریخیں بہ آواز بلند پکار پکار کر کہہ رہی ہین کہ اے غفلت پرست انسان! کیا تو کامیاب زندگی کا متلاشی ہے؟ کیا تو حیاتِ جاودانی کا طالب ہے؟ کیا تیری یہ خواہش ہے کہ کہ آیندہ آنے والی نسلون کے لئے تیرے کارنامون کی فہرست کارآمد ہو؟ اگر واقعی تیرا ایسا خیال ہے تو بلا ضرورت دوسرون کی اعانت اپنے لئے باعث ننگ سمجھ، کمر ہمت مضبوطی سے کس لے، میدان مین بلا خوف و خطر قدمون کو بڑھا، اپنی مدد آپ کر، پھر نیرنگیٔ قدرت کا اپنی آنکھون سے تماشہ دیکھ۔ تجھکو خود ہی معلوم ہوجائیگا کہ تیرے مستقل ارادون نے تیری زندگی کو کامیاب بنانے مین کس قدر حصہ لیا ہے۔

ثابت قدمی اور استقلال کا مادہ پیدا کرنا، امور مذہبی مین سرگرم رہنا، قول و فعل مین مطابقت رکھنا، فرض کی پابندی، راستبازی مین سختی، ایثار کی عادت اور اعتبار و اتحاد کے خیالات پر عمل، یہ زندگی کے جزو اولین ہین، راستبازی ہو یا پرہیزگاری، دیانت داری ہو یا ہمدردی، یہ ایسے صفات نہین ہین جنکو انسان بے منت حاصل کرلے۔ وہ خوش نصیب ہین جنکی ذات مین یہ ستودہ صفات مرضی اور ارادے کی پختگی کے ساتھ جمع ہوجائین، وہ ایک ایسی غیر معمولی طاقت کا شہ زور ہوجاتا ہے جسکے زور و اثر کو دنیا بغیر منوائے مان لیتی ہے۔

کامیاب زندگی حاصل کرنے کے لئے اسکے بھی جاننے کی پہلے ضرورت ہے کہ اصلی و حقیقی کامیابی کہتے کس کو ہین، بعض لوگون کے نزدیک کامیاب وہ شخص ہے جو بڑا زمیندار اور جسکے پاس بے قیاس دولت ہو اور امیرانہ ٹھاٹھ کے جملہ سامان بکثرت موجود ہون، عالی شان محل مین رہتا ہو شب و روز اُسکے یہان سونے چاندی کی ریل پیل ہو گاڑی گھوڑے، موٹر، ہاتھی اور نوکر چاکر غرضکہ وہ تمام چیزین جنکی موجودگی ایک امیر کے یہان لازمی ہین مہیا ہون۔ اصلی و حقیقی کامیابی ایک ایسی

زندگی سے پیدا ہوتی ہے جس مین فرض کی ادائی اور اچھے و نفیس اصول کی پابندی کا اُس کے
دل مین ہر وقت خیال رہے ۔ فرض کی ادائی مین اس نے مصیبتین اُٹھائی ہون سخت سے سخت
خطرات کا جوانمردی سے مقابلہ کیا ہو، استقلال و ہمّت سے ایک کام کی بجاآوری مین لگاتار کوشش
کی ہو اور اپنے ایک ہی خیال و ارادے کو دل مین جگہ دی ہو - ایک ہی خیال کے مختلف پہلوؤن پر
نظرِ تعمق ڈالنے اور اُنکو سوچنے مین اپنا وقت صرف کر دیا ہو، جس نے کبھی ایسا کام ہی نہ کیا ہو جسکا
انجام خجالت و شرمندگی پر ختم ہوتا ہو، اور اپنی کمزوریون پر نظر ڈالتا اور اُسکے دور کرنے کی کوشش کرتا ہو
جو بہترین خیالات اور پاکیزہ عادات کا تابع ہو اُسکی زندگی قطعی ناکامیاب نہین رہ سکتی - ایک ایسا مدعا قرار
دینے کے بعد جسمین کسی کی کوشش صرف ہو سکتی ہو اُسکے حاصل کرنے مین اپنی تمام طاقت صرف کر دو
اور تمام ضروری و جائز وسائل مثل دیانت داری، راستبازی، خودداری، سرگرمی اور اخلاقی جرأت کو
دکھلا دو بیشک تمکو تمہارے سچے اور جائز ارادون مین کامیاب کئے بغیر نہ رہینگے ۔

کچھ شبہ نہین کہ زندگی کی راہین کامیابی و عزّت سے طے کرنے کے لئے اُن لوگون کے سفرنامے
اُن لوگون کے حالات نہایت مفید ثابت ہوتے ہین جو ہوشیار اور معزز رہ نورد اور اپنے ملک و قوم
کے ایک درخشان زیور خیال کئے گئے ہین اُنکی زندگی سے دل مین جوش اور عمدہ اصول سے زندگی
بسر کرنے کا ایک شوق پیدا ہوتا ہے، وہ سچے اور عبرت خیز واقعات جو کسی ہیرو کی زندگی کا نتیجہ ہین -
ہمارے لئے راہ ہدایت ہین - ایسے واجب التکریم لوگون کی تصویرین ایک قیافہ شناس اور باریک
بین شخص کے جذبات و خیالات مین انقلاب پیدا کر دیتی ہین کیونکہ تصویر سے صاحبِ تصویر کے تدبّر،
اخلاق و عادات، چال و چلن اور علم و فضل کا آسانی سے پتہ چل جاتا ہے جس سے دل مین جوش
و ترقی کی اُمنگین اُٹھنے لگتی ہین ۔ غرضکہ اچھے لوگون کے اقوال و افعال نہایت ہی بیش قیمت اور
قابلِ قدر ہوتے ہین اور لائق تقلید ۔

زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے دوسری احتیاطون کی بھی ضرورت ہے گفتگو ایسی نہ کرو جس سے کسی کی دل شکنی ہو یا کسی کو صدمہ پہونچے، نہ کسی کی بدقسمتی پر مضحکہ اُڑاؤ اور نہ کسی کی خوش قسمتی پر ملول و رنجیدہ ہو مفلسون محتاجون کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرو، اُنکے طرفدار رہو، جو مدد کا مستحق ہو اُسکی مدد کرو ۔ مفید موقعون اور اچھے وقت کو ضایع نہ کرو، شایستگی اور سنجیدگی کو اپنی طبیعت کا ایک جزو لاینفک سمجھو۔ انسانی بزرگی کے اہم اجزا کو اپنا ہمراز بناؤ، مستقل مزاجی ہمدردی، بُردباری، خودداری سے خود فائدہ اُٹھاؤ اور اپنے ابنائے وطن کو بھی اس طرف مائل اور کاربند ہونے کی ترغیب دلاؤ۔ تاکہ وہ ان مفید اور کارآمد باتون کے شروع ہی سے عادی ہو کر آخر عمر مین اُنکے مفید ثمرات سے بہرہ مند ہون ۔

اسراف

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ

اسراف یا دوسرے لفظون مین فضول خرچی وہ غذا ہے جو پہلے میٹھی اور بعد (انجام مین) کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ اسراف وہ چند روزہ راحت ہے جس کا سلسلہ تکلیف و رنج کی سرحد سے ملے بغیر نہین رہتا، اسراف وہ نمایشی عمارت ہے جسکو ہوا کا معمولی جھونکا منہدم کردیتا ہے۔ اسراف وہ بدپرہیزی ہے جس سے انسان کا دل و دماغ معطل اور مختلف امراض روحانی مین مبتلا ہوجاتا ہے، اسراف وہ نسیم دلربا ہے جسکے ابتدائی جھونکے تو خوشگوار معلوم ہوتے ہین مگر آگے چل کر جیٹھ بیساکھ کی جھلسانے والی لپٹین ہوجاتی ہین۔ اسراف وہ چمکتا ہوا ظاہر فریب ملمع ہے جو چند روز مین اُتر کر اپنی اصلیت ظاہر کردیتا ہے۔ غرضکہ اسراف وہ مقدمہ ہے جو خرابی و بربادی کا نتیجہ اور سزائے ہلاکت پر زندگی کا فیصلہ کردینے والا ہے۔

مُسرف کی آنکھون سے گو روشنی کی بارش ہوتی رہتی ہے، مگر اُسکو یہ نظر نہین آتا کہ اس کی بوچھار کدھر پڑ رہی ہے۔ یہ ایسا مست ہوتا ہے کہ باوجود عقل و شعور کے اپنی گرتی پڑتی حالت سے متاثر نہین ہوتا، بلکہ اُس نشئہ مستی مین نتیجہ سے بے خبر ہوکر جو چاہتا ہے کرگزرتا ہے۔ حالانکہ فطرت نے نیک و بد اور حُسن و قبح کا مادّہ اُس سے سلب نہین کیا ہے اور اُن ساعات مین جبکہ وہ ہوش و حواس کے قبضہ مین ہوتا ہے اپنے افعال و کردار کا موازنہ اور اُن پر نظر واپسین ڈالنے کی قابلیت رکھتا ہے

مگر اُسکو پرواہ ہی نہین ہوتی ۔ منشاء فطرت کے لحاظ سے ہر شخص کو دور اندیش ہونا چاہیئے ۔ اُس کو اپنی موجودہ حالت اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے ۔ آج کی خبر رکھ کے کل سے بے خبر رہنا ہی تو ناعاقبت اندیشی ہے ، اسکو ناقص اور غافل انسان نہین سمجھ سکتا ۔ زندگی و موت ، نیکنامی و بدنامی ، خوشی و غمی ، اور عروج و زوال ، غرض کوئی شئے نہ اعتبار کے قابل ہے اور نہ اسکی پائداری کا یقین ۔ مگر رونا تو اس بدنصیب پر ہے جسکے ذہن مین یہ خیال خام سما گیا اور دل مین یہ نقش ہو گیا کہ یہ قارونی دولت اور امیرانہ شوکت زندگی کی ساتھی اور ہمیشہ جلیس و انیس رہیگی ۔ جس نے یہ سمجھ لیا اُسکی حالت رحم کے قابل ہو گئی ۔

روزمرّہ کے واقعات ، آنکھون کے مشاہدات ہمارے لئے کچھ کم ادب آموز نہین ! ہم نے دیکھا ہے کہ امارت غربت مین تبدیل ہو گئی ۔ قصر نے جھوپڑے سے بھی محروم کر دیا ، جن گھرون کو سونے چاندی کا معدن کہنا چاہیئے وہان تانبہ بھی نظر نہین آتا ۔ جہان پر خوبصورت جھاڑ ایوانون کو روشن کئے ہوے تھے وہان چراغ کا تیل بھی میسّر نہین ، ذی وقار خاندان تباہی کے جہازون مین سوار ہو کر غرق ہو گئے ، زمانہ کی محشر انگیز رفتار نے جن لوگون کو محتاج اور دست نگر کر دیا اُنکی حالت دیکھکر عبرت ہوتی ہے ۔ جن کی بدولت ہزارون بندگان خدا پرورش پاتے تھے آج اُن کا ہاتھ دوسرون کے سامنے پھیلا ہوا ہے ۔ دولت ایک وقت معلوم تک اپنی لذتون سے خوش رکھتی ہے جس نے اسکے قیام پر بھروسہ اور اُسکی لذتون کو مستقل سمجھا وہ نادان ہے ، اگر آج ہم دولت مند ہین تو ہم کو خدا کی دین کا شکر بجا لانا چاہیئے اور اس پر غور کہ ہماری حیثیت کن ضروریات کی مقتضی ہے اور کن شرائط کی بجاآوری کے بعد ہم اپنے فرائض سے سبکدوشی حاصل کر سکین گے ۔ کیونکہ دنیا مین جس قدر چیزین انسان کو میسّر ہوتی ہین وہ سب امانت ہین جنمین بیجا تصرف لائق مواخذہ و باز پرس ہے ۔ ہم کو دولت اس غرض سے نہین دی گئی ہے کہ خرافات کامون اور بے نتیجہ باتون مین صرف

کردین، اسکا مصرف اپنی مناسب ضروریات کے رفع کرنے کے بعد مستحقین کی حاجت برآری ہے ؎

کانٹون پہ ہے وہ راہ تو آنکھون پہ پیستہ　　اک وادی اسراف ہے اِک ہگز رفیض

کیا اہلِ قناعت کو غرض اہلِ غنی سے　　ہمکو سرِ فیض اور نہ اُنھین و دسرِ فیض

نیک کامون مین صرف غربا و قابل رحم لوگون کی مدد، محتاجون، بیواؤن اور یتیمون کی خبرگیری اور اُنکی ضروریات پر نظر، یہ دولت کا حقیقی مصرف ہے، ناپسندیدہ کامون مین روپیہ کو برباد کردینا نمایش کے ساتھ ساتھ حماقت ہے، فی زماننا اسراف کا ایک سبب تشیُّن بھی ہے اور باوجودیکہ اپنی آنے والی تباہی کا منظر خود دیکھ رہے ہین، مگر دوسرون پر اپنا سکہ بٹھانا بھی عقلمندی کے ثبوت مین پیش کرتے جاتے ہین۔ خود غرض اور مطلبی لوگ اپنی چکنی چُپڑی باتون سے مُسرف کو از خود رفتہ کردیتے ہین اُسکو محاسن و ذمائم مین امتیاز مشکل ہوجاتا ہے اکثر صحبتون مین خوشامدیون کا ہجوم اور خوشامد کی بھرمار ہوجاتی ہے، اور بیجا تعریف سنتے سنتے طبیعت خودستائی کی عادی ہوجاتی ہے۔ وہ لوگ جو خود غرضی سے کہتے ہین اُسکو وہ من وعن درست وصحیح باور کرنے لگتے ہین کسی خوشامدی نے جو یون کہنا شروع کیا کہ فی زماننا فیاضی کا خاتمہ آپ کی ذات پر ہے۔ آج ساری خدائی آپکی عقلمندی وسیرچشمی وعالی حوصلگی کا دم بھرتی ہے چارون طرف آپ ہی کا نام وردِ زبان ہے، تو حضرت مُسرف کا اسراف اور اُچھلنے لگتا ہے اور وہ ہمنشینون کی لن ترانی سے سمجھ لیتے ہین کہ "ہمچو من دیگرے نیست" خوشامدیون کو اپنا حقیقی ہمدرد، سچا خیرخواہ، دلی دوست بغیر سوچے سمجھے سمجھ لیا، جو تھوڑی بہت عقل فطرت نے عطا کی تھی اُس سے کام لینے کی قسم کھا چکے تھے۔ علم کے نام سے کانون پر ہاتھ دھرتے تھے اُن کی ناتجربہ کاری، اور پھر صحبت کی خرابی، ایسے حالات مین بیوقوفی اور نادانی کے افعال اُنکی قسمت ابلا چھ شان وشوکت کے اظہار مین سَو کی جگہ دو سَو خرچ کردینا عقلاً اسکو حماقت سے تعبیر کرینگے، گنج قارون بھی ایسی حالت مین کفایت نہین کرسکتا، اِسی اسراف کی بدولت قرضہ کی بلائے بے درمان مین پھنسکر

جائداد کا زوال و انتقال ایک بدیہی بات ہے اور معمولی کرشمہ آخرکار دولت نے تدریجاً کنارہ کشی اختیار کرنی شروع کی اور اس بے رخی سے نگاہیں پھیر لیں جیسے غروب آفتاب کے ساتھ دھوپ سمٹتی چلی جاتی ہے۔ اب حضرت مسرف کا نہ کوئی پرسان حال ہے اور نہ کوئی پاس آتے تک روادار اگر کہین رستے گلی مین محبت دیرینہ کے کسی آشنا سے سامنا ہو گیا تو یہ وہ دونون نظر بچا کر اس طرح کترا کر نکل جاتے ہین جیسے آیندو روند کی اچٹتی نظرین بیگانگی کا پیام دیتی چلی جاتی ہین جو ہمدردی اور جان نثاری کا دم بھرتے تھے، جو پسینہ کی جگہ خون بہانے کے لیئے تیار رہتے تھے طرفۃ العین مین قلب ماہیت ہو گئی نہ دوستی رہی نہ چاپلوسی کی باتین، یہ حضرت کوڑی کوڑی کو محتاج دربدر کی خاک پھانک رہے ہین۔ اُن سے اب کوئی بات تک کرنیوالا نہین ہے اور نہ اُنکی حالت پوچھنے والا۔

زمانہ کے تغیرات اور حالت کے انقلاب کے بعد در و دیوار سے بھی مخالف صدائین آنے لگتی ہین۔ دوست نما دشمن کی باتون پر اگر نہ آتے، اُنکی خوشامد کو اگر خود مطلبی سمجھتے تو آج یہ روز بد دیکھنا کیون نصیب ہوتا۔ اسی لئے تو کسی نے کہا ہے کہ — ع

"کوئی کسی کا نہین دوست سب کہانی ہے"

انسان کو ہر وقت اپنی حالت پر غور کر کے اپنے اُس آنے والے زمانہ کا خیال رکھنا چاہئے جسکے نزول کے وقت سے وہ ناواقف و بے بہرہ ہوتا ہے بعض لوگ اس خیال کے بھی دلدادہ پائے جاتے ہین۔ اور یہ سمجھکر بھی دولت کو پانی کی طرح بہا دیتے ہین کہ ہم اپنی زندگی کو کیون عیش و آرام سے محروم رکھین۔ اولاد کا خدا مالک اور اُنکی حالت کے وہ خود ذمہ دار۔ اولاد پر والدین کے عادات و اطوار اور حرکات و سکنات کا پورا اثر پڑتا ہے اور وہ بھی اُنھین عادتون کے شکار ہو جاتے ہین جو وہ ایک مدت سے اپنے گھر مین دیکھا کرتے ہین ایسی صورت مین اولاد کے ہاتھون مین کاسۂ گدائی کے سوا اور کیا نظر آ سکتا ہے۔ علم و ہنر نہ خود سیکھا اور نہ اولاد کو سکھایا یہ بے ہنری دروازون پر صدائین

ہی لگا سکیگی اور وہین سے اپنے خاندانی اسراف کا انتقام لیگی۔

اخراجات کی تقسیم تین طریقون پر کیجا سکتی ہے:-

(۱) وہ خرچ جو اعتدال و سمجھ بوجھ سے کیا جاتا ہے اُس سے مطمئن زندگی گزرتی ہے اور دولت بھی جائز حدود کے اندر صرف ہوتی ہے جو شخص تونگری کی حالت مین بھی اپنے ضروری اخراجات مین جادۂ اعتدال کو مدِ نظر رکھتا ہے اُسکا شمار عقلمندون مین ہے۔

(۲) خسّت ایک خطرناک مرض ہے خسیس دولت کو اکٹھا کرتے ہی کرتے مر جاتا ہے اور آخر وقت تک اسکی یہی حسرت ہوتی ہے اور یہی اُسکی آرزو کہ دولت کے ڈھیرون مین اضافہ ہی ہوتا جائے، نہ دولت سے خود فائدہ اُٹھاتا ہے اور نہ دوسرے اُس سے منتفع ہو سکتے ہین اُسکا نصب العین صرف دولت کا حصول ہوتا ہے اُسکی اصلی حسرت دولت کے اجتماع مین مضمر ہوتی ہے خسیس کو تو مین گنہگار کہونگا اس لئے کہ جب اُس سے نہ خود فائدہ اُٹھایا اور نہ دوسرے مستفید ہو سکے تو ایسی دولت کا عدم وجود برابر ہے، نہ دولت اس واسطے دی گئی ہے کہ اس کو زیر زمین دفن کرکے فاتحہ پڑھتے رہین اور پنہان کرکے گاہے ماہے اسکے اعمال کو یاد کرکے حسرت و مسرّت کے جذبات کو اُبھارین۔ دولت ہوتے ہوئے عزیز و اقارب، دوست احباب اور بندگانِ خدا کو تکلیف کی حالت مین دیکھنا ایسا اخلاقی جرم ہے جو کسی طرح قابلِ معافی نہین اور نہ اس لئے ہے کہ فضول خرچیون کے نذر کردین اور پھر محتاج بن کر دوسرون کی امداد کے متمنی رہین اور نہ اس لئے ہے کہ تفوق و خود نمائی کا اسکو ذریعہ قرار دیا جائے ؎ ع

"گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی"

(۳) اسراف ہے جسکی قلعی کھول دی گئی ہے اور جسکی نبض کی ہر حرکت سے اُس کے اعراض ظاہر کر دئے گئے ہین۔ اگرچہ ہم اس سے پہلے کہہ چکے ہین کہ خسیس ہونا بھی بُرا ہے مگر

خسیس کی زندگی مسرف کے مقابلہ مین اچھی حالت مین گزرتی ضرور ہے۔ کیونکہ اسکی زندگی یکسان اور اطمینان بخش ہوتی ہے اگر کوئی فکر ہوتی ہے تو صرف اسکی کہ دولت جون کی تون باقی رہے، جس کا وہ چوکیدار ہے۔ حالانکہ اس خست کی حالت مین خسیس کو بہت سی تکلیفون کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر خوگر ہو جانے کی وجہ سے وہ ایسی تکلیفون کو خاطر مین نہین لاتا۔ برخلاف اس شخص کے جو چند روزہ عیش و عشرت کے بعد پھر اُن مصائب مین گرفتار ہو جائے اور اپنی زندگی کے دن پورے کرنا دوبھر ہو جائین۔ عادتین بگڑی ہوئین، خیالات بلند، محنت و مشقت سے ناواقف، امیرانہ کروفر سے دماغ خراب، نہ کوئی فن جانتے ہین اور نہ کوئی کام، لڑکپن مین اگر کچھ سیکھا بھی تھا تو عیش و آرام نے اُسکو بھی ذہن سے امارت کے ساتھ ساتھ غائب کر دیا، اگرچہ خسیس ہونا مذموم ہے مگر فضول خرچ سے اسکی حالت یقینی بہتر ہوتی ہے، اس لئے انسان کو وہ روش اختیار کرنی چاہیے جو اِن دونون کے بین بین ہو جسکو اعتدال سے تعبیر کرتے ہین۔ یہ ہر حالت مین سچا مشیر اور اسکی رفاقت ہر شخص پر واجب ہے۔

نیرنگیِ دہر

دنیا گزر رہی ہے اور اپنے گزرنے کا اعلان کر رہی ہے نہ اسکی دلبستگیون کو قیام ہے اور نہ اسکی دلچسپیون کو بقا۔ باوجود اپنی بے ثباتی کے ہر شخص کو اپنا گرویدہ، ہر شخص کو اپنی ہی دلچسپیون مین محو، اپنی ہی تلاش و جستجو مین سرگرم، اور اپنی ہی طرف متوجہ رکھنا چاہتی ہے۔ جو اسکے جال مین پھنسا رہتا ہے۔ جو اسکی آرائشون مین دل لگا لیتا ہے۔ اُنھین سے یہ لاپروا اور اُنھین سے بے خبر ہو جاتی ہے۔ جو اس سے لاپرواہی اور بے خبری کا برتاؤ کرتا ہے اور اسکی دلچسپیون کو بے وقعت سمجھتا ہے وہ انجام بین ہے اور اسکی حقیقت واقعی کا جاننے والا۔

عالم کے کارخانے کسقدر حیرت انگیز ہین۔ بچہ جب تک بچہ رہتا ہے سب اُسکو پیار کرتے محبت کی نظرون سے دیکھتے آغوش مین لئے لئے پھرتے اور ہر شخص خواہ عزیز ہو یا بیگانہ بچہ کے ساتھ محبت ہی کا برتاؤ کرتا ہے۔ مگر جب وہی بچہ بڑا ہو کر سن و شعور کو پہونچنے لگتا ہے، دنیا کے نشیب و فراز سے واقفیت پیدا ہونے لگتی ہے تو گودیون مین کھلانے والی خواتین اسکے سامنے بے پردہ ہونے کی بھی روادار نہین ہوتین۔ حجابِ شرم کے نقاب انکے منہ پر پڑ جاتے ہین۔

دنیا کی بے ثباتی و ناپائداری اُن شگفتہ پھولون کی زندگی ہے، جن کو شاخ سے جدا ہوتے دیر نہین لگتی کہ کہین گلون کے ہار ہین کہین کسی کے مشام جان کو معطر کر رہے ہین کمسن ہو یا بچہ، بوڑھا ہو یا جوان، سب اسکی دلآویزیون پر مفتون اور دیوانے رہتے ہین۔ مگر ہوا کا رُخ پلٹتا تھا، زمانہ کا

رنگ بدلنا تھا، بادِ مخالف کا جھونکا چلنا تھا اور اسکے نفیس جسم کا کمھلانا تھا، اسکی نزاکت آب پنکھڑیون کا منتشر ہونا تھا اسکی شگفتگی اور خوش رنگی کا مٹنا تھا اسکی بہار پر خزان کا آنا تھا۔ غرضکہ اُسکے حسین جسم کا مضمحل ہونا تھا کہ نوچ نوچ کر اُسی بستر خاکی پر ڈال دیا گیا۔ جہان سب کا آخری ٹھکانا ہے کہان اس نے حسینون کے خوبصورت کانون مین جگہ پائی تھی، گلون کی زینت تھا، اب اسکی یہ حالت ہو گئی اس لیے کہ اب اس مین وہ رنگ و روپ وہ شان دلربائی اور بھینی بھینی خوشبو نام کو بھی باقی نہ رہی تھی۔

دنیا کی عبرت خیز نیرنگیان ہمارے لئے روزمرہ کے مشاہدات ہین یہ اپنی اصلیت کو روز روشن کی طرح ظاہر کرتی رہتی ہے، نہ اس کو کسی قسم کا پس وپیش ہوتا ہے اور نہ تامل۔ صبح کے بعد شام، غروبِ مہر کے ساتھ ماہِ تابان کا نمودار ہونا اور بتدریج ترقی کے منازل طے کر کے بدر کامل ہو جانا، مگر اس انتہائی نقطۂ ترقی پر پہونچنے کے بعد انجام کار اسکی عمر کی گھڑیون کا گھٹنا اور فنا کے سمندر مین ڈوب جانا پھول کا کھلنا اور کمھلا جانا، شبنم کا پڑنا اور غائب ہو جانا، موسم بہار کے ساتھ خزان کا آنا، محفل نشاط کے بعد گھر کا ماتم کدہ نظر آنا، چہ میگوئیون کے بعد سکوت، چہل پہل کے بعد سناٹا، رعنائی کے بعد پژمردگی، زندگی کے بعد موت، یہ روزمرہ کے مشاہدات کسی دلیل و برہان کے محتاج نہین اور بآوازِ دہل اسکا اعلان کرتے رہتے ہین کہ اس ہستی بے ثبات کے جلوے محض عارضی و نمایشی ہین یہان اس طرح رہنا چاہیئے جیسے سرائے مین مسافر۔ یہان سیاح ہو کر متوطن نہ بن بیٹھنا چاہیئے۔ اور مسافر ہو کر مقیم نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارے کانون مین دنیا کی بے ثباتی کے پُرحسرت قصّے گونج رہے ہین۔ اسکی عبرت انگیز داستانین صفحۂ کاغذ پر پھیلی ہوئی ہین باوقار خاندانون اور نازک و لطیف ہستیون کو خاک مین ملانے والی یہی دنیا ہے۔ ہر آنے والی اور موجودہ ہستی اسمین نیست و نابود ہو جانے والی ہے۔ بابِ دنیا مستی و فنا کی طرف رہنمائی کرتا رہتا ہے اور خضرِ طریقت کی ڈیوٹی انجام

دیتا رہتا ہے۔ اسکی دلفریبیون کو اگر ذرا بھی قیام ہوتا تو آج مشاہیر زمانہ اور دوسری پاکیزہ ہستیون کا کچھ تو سراغ لگتا۔ اسی دُنیا نے نازک اندام حسینون کو اپنے آغوش محبت مین ناز و نعم سے پالا جوانی کی منزل پر پہنچایا، عقل و شعور سکھلایا، مذہب و ملت سے آشنا کرایا، الفت و محبت کی تعلیم دی، ناز و ادا، عشوے، غمزے حیا و شرم کے سبق دئے، کامیاب حربون مین مشاق بنایا زندہ رہ کر سحر زندگی کے کُل فنون سکھائے مگر انکے ساتھ بھی وہی سلوک کیا اور وہی روش اختیار کی جو اسکی فطرت کا شعار تھا۔ ان پروردگان ناز کو بھی انقلاب دہر کے پنجۂ ظلم مین اس سنگدلی سے دیدیا کہ آج ان کا نشان بھی با وجود ڈھونڈھنے اور تلاش کرنے کے بھی نہین ملتا۔ انقلاب زمانہ کے بیدرد ہاتھون سے نہ کسی فرد بشر کو رہائی ملی ہے اور نہ مل سکتی ہے، پیاری پیاری صورتون کے جسم مور و مار کے دہنون مین تقسیم ہو چکے اُن کی قبرون مین بیکسی و تنہائی اور حسرت و ارمان گزرے ہوئے واقعات و حالات کو یاد کر کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہے ہونگے۔

موجودات عالم کا فلسفہ ہم کو سبق دیتا ہے کہ دنیا کی دلچسپیان مٹے بغیر نہ رہین گی۔ یہ رنگا رنگ صورتین سب خیالی تصویرین ہین۔ یہان جو کچھ ہو رہا ہے تخیل کا ایک عجیب و غریب کرشمہ ہے دنیا کے نقش و نگار مین رنگ فنا کی ہلکی ہلکی جھلک نمودار ہے اسکی نیرنگیان غضب اور اسکی ہر ادا اور کرشمہ نرالا ہے دنیا کی خودداری اور ہماری دلدادگی خدا معلوم کیا شے ہے جسکو سمجھنے کے لئے عقل حیران ہے۔ حیات و ممات کی کشمکش کو دیکھئے تو ایک دلفریب تماشہ معلوم ہوتا ہے اور اس تماشہ کا ہر متنفس شیدائی ہے نہ اسکی حقیقت معلوم ہوتی ہے اور نہ اسکے کنہ تک دماغ رسائی کرتا ہے یہ ہنگامہ آرائی خاموشی کی عین دلیل ہے۔ ہماری زندگی کا سرسبز و شاداب باغ ایک دن تاراج ہو جائے گا، اور صفحۂ ہستی سے ہمارا نام بالکل مٹجائیگا۔ ہمکو دنیا نے یہ بھی نہ بتایا کہ ہمارا جب یہان سے سفر ہوگا تو ہمارے رہنے کا ٹھکانا کہان اور کس جگہ ہوگا۔ اللہ اکبر۔ کیسے کیسے مایوس کُن واقعات کا سامنا ہے جن سے عقل کے

حدود بھی گھبراتے ہین ۔ خدایا تو مجھکو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کر اچھے کامون کے کرنے کی توفیق دے ۔ اور دل کو صفائی و پاکیزگی کا عنصر لطیف عطا فرما ۔

اے سرائے فانی کے ٹھہرنے والو! کس سوچ مین ہو کس گہرے خیال مین غرق ہو کون سی ایسی مصیبت آپڑی ہے جسکی وجہ سے سرنگون ہو آنکھین کھولو، دنیا کے عبرت خیز منظر پر نظر غائر ڈالو پچھلے واقعات کو یاد کرو کہ کیسے کیسے ذی کمال لوگ گذر گئے، اُنھون نے کیا کچھ نہ کیا، مگر وہ بھی تو پیوند زمین ہو گئے بڑے بڑے عالم بڑے بڑے مورخ بڑے بڑے شاعر بڑے بڑے حکما، وفلاسفر گو اپنے اپنے کارنامون سے زندہ ہین مگر نیرنگی دہر کی شکایت مین سب کے ہونٹ متحرک ہین ۔ شیرین و کوہکن، وامق و عذرا، لیلےٰ و مجنون کے بس افسانے ہی افسانے باقی رہ گئے ہین، ہر ایک اسی کے تیرون کا نشانہ بنا سب کو اس نے اپنی دلفریبیون پر مفتون کر کے اپنی تلخکامی کا مزہ چکھایا ہے، غرض ع

"ہر کہ آمد بہ جہان نقش خرابی دارد"

چند روزہ دلکشی نہ غرور کے قابل ہے اور نہ بھروسہ کے ۔ سحر و طلسم کا یہ نقشہ ہے ذرات پر یہ دُنیا تھمی ہوئی ہے ۔ زراسی ٹھیس، معمولی اشارہ، ہلکی جنبش اسکے انہدام کا پیام ہے اور یہ ضرور گرے گی اور باقی رہنے والی وہی ذات ہے جو ہم سے پہلے بھی تھی اور ہمارے بعد بھی رہیگی ۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ

احتیاج

احتیاج منعم کو بھی ہوتی ہے اور مفلس کو بھی، مگر محتاجون مین شمار اُنھین کا ہوتا ہے جو مفلسی کی صف مین اپنی بدنصیبی یا اپنے کرتوت سے شامل ہو چکے ہین، منعم کی حاجتین مفلس سے زیادہ ہوتی ہین مگر باوجود دنیاوی کے منعم کی حاجتون کا باب اجابت ہر وقت کھلا رہتا ہے اور مفلس کے لئے اگر کھلتا بھی ہے تو اسی قدر، جس قدر کہ چلمن کی تیلیون سے روشنی کا جھلملایا ہوا انعکاس، دنیا مین مفلسون کی کثرت اور منعمون کی قلت سے مفلسون کی بوسیدہ جیب خلو سے نڈھال رہتی ہے اور منعمون کی جیبین نہین بلکہ تھیلیان اپنے تن و توش پر نازان رہتی ہین مفلسون کی ضرورتین بے زری کا مُنہ تکتی رہتی ہین اور منعمون کی ضرورتین اور عیش و عشرت کی خواہشین ہر وقت خیر مقدم کے لئے طیار رہتی ہین منعمون کی حاجتین بدپاشیون کی وجہ سے بہتی رہتی ہین اور مفلسون کی بے زری اور اہل زر کی بے توجہی سے خشک سالی کا نوحہ پڑھتی ہین، ایک منعم دوسرے منعم کی توجہ سے مستغنی، اور ایک مفلس دوسرے مفلس کی اعانت سے مجبور ہوتا ہے، مفلسون مین اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہے۔

تاریخی ورق گردانی کیجئے یا صورت حال کا مشاہدہ، تو غرض مند زیادہ اور بہت زیادہ نظر آئین گے اہل زر کی خود غرضی اُنکے لئے اتنی مضر نہین ہوتی جتنی نو دولتون کی خود غرضی مفلسون کے حق مین نقصان رسان ہوتی ہے۔ ایک نو دولت (جو افلاس کی تلخیون سے واقف ہے) اگر مفلس کی دامے، درمے سخنے، قدمے، حصہ رسدی بھی اعانت نہ کر سکے اور اپنی ہی مطلب برآری مین منہمک رہے تو افلاس کی

افزونی مفلسوں کو ہمیشہ کے لئے محتاج ہی بنائے رکھیگی، دنیا کے کام چلتے ہیں کسی کی دولت اور کسی کی محنت سے اور سچ پوچھو تو محنت ہی کا نتیجہ دولت ہے، مگر زمانہ کی حالت یہ ہے کہ منعم مفلسوں سے لاپروا رہتے ہیں، جو مفلس اپنی محنت سے دولت اکٹھا کر لیتا ہے وہ بھی اُس وقت مفلسوں سے ایسا بے پروا ہو جاتا ہے جیسا کسی وقت اس سے اہل دولت بے خبر تھے، وہ اُس وقت انتقام لیتا ہے، اور یہ بزدل انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے کمزور سے انتقام لیکر اپنے دل کا بخار اور اپنی پچھلی ناکامیوں کی یاد کو اس طرح تازہ کرتا ہے۔ دولتمند کا اگر خزانہ بھرا ہے تو ہوا کرے، اُسکی دولت سے غریب انسان کو کیا راحت مل سکتی ہے، جب تک اسکا مصرف انسانی محنتوں، مشقتوں اور انسانی ریاضتوں کی شکل میں نہ حاصل کیا جائے۔

منعم تو دولت کے نشہ میں اپنی عیش و عشرت کی رنگ رلیوں میں منہمک رہتے ہی ہیں، لیکن اگر مفلسوں پر نظر ڈالی جائے تو وہ بھی اپنی ہی موجودہ حالت کی فکر میں نظر آئینگے اسی نااتفاقی اور خودغرضی کی بدولت افلاس و فلاکت ایک بڑی جماعت کی جماعت کو احاطۂ تنزل سے باہر قدم نکالنے نہیں دیتی، منفردہ کوشش فلاح نہ ایک فرد ہی کو آرام پہنچاتی ہے اور نہ افراد ہی کے کچھ کام آتی ہے۔ خودغرضی و نااتفاقی کے جراثیم نے محتاجی کو ایک عالمگیر مرض بنا دیا ہے اس خطرناک مرض کے دفعیہ کی تدبیر، تقدیر سے متعلق نہیں ہے تقدیر کا سہارا دنیوی معاملات میں مفید نہیں ہوتا جبتک اسباب نہ پیدا کئے جائیں، اس میں خاموشی، موت کی خاموشی ہے، اس میں تدبیر کی چہل پہل ہونی چاہئے اس میں خاص لوگوں کی توجہ اور عام لوگوں کی متفقہ سعی کی ضرورت ہے تاکہ عوام کے ساتھ خواص بھی مستفید ہو سکیں، اگر اتفاق میں عوام کے ساتھ خواص شامل نہونگے تو انتفاع کی زیادہ توقع نہیں ہو سکتی، ایک دوسرے کی ممکنہ اعانت محتاجی کا سدباب کر سکتی ہے، دوسروں کی حاجت روائی کے ضمن میں اپنی حاجت برآری عمدہ بات ہے اور اس طرح حاجتیں پوری بھی ہو جائیں تو ان کا شمار خودغرضی میں نہیں

کیا جا سکتا۔ بنی نوع انسان کے ساتھ احسان اپنے حق مین احسان ہے مگر اسکو سمجھنے کی کون کوشش کرتا ہے، اِس لئے اپنے کام بھی دشوارین سے خالی نہین رہتے اور دوسرون کی بھی احتیاج باقی رہ جاتی ہے، لطف یہ ہے کہ اپنے ساتھ اگر دوسرون کا بھی کام نکل جائے تو یہ نور علیٰ نور ہے۔ جس طرح لوگ دوسرون کے کام پر اپنے کام کو ترجیح دیتے ہین اور دوسرون کا کام ہوشیاری سے روک کر اپنی خود مطلبی کا ثبوت دیتے ہین، اسی طرح دوسرے بھی اسی فکر اور اسی گھات مین لگے رہتے ہین جسکا نتیجہ نااتفاقی اور دوسرے معنون مین محتاجی نکلتا ہے۔

احتیاج کو اگر مٹانا ہے تو اتفاق کا مطمئن لباس پہننا چاہیے اور اس لباس پر ہمدردی کا برش پھیرنا چاہیئے تاکہ نااتفاقی اور محتاجی کی گرد کے ذرات تک باقی نہ رہ جائین۔ جو لوگ آسایش و آرام کی آغوش مین مطمئن کروٹین بدل رہے ہین وہ مصیبت زدون اور غرض مندون کے حالات پر غور بھی نہین کرتے، اس سے زیادہ قابل افسوس بات یہ ہے کہ جو لوگ مصیبت کے بعد راحت پاتے ہین وہ بھی اپنے مصیبت زدہ بھائیون کو بھول جاتے اور ان سے غافل رہتے ہین۔ اسی کا نام بے دردی اور انتہائی سنگدلی ہے۔

یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ دنیا مین شادی و غم توام ہین۔ رنج کے ساتھ مسرت، تکلیف کے ساتھ راحت، اور عسرت کے ساتھ یُسر ہے، لیکن یہ ضرور نہین کہ ایک کے ختم ہونے کے ساتھ ہی دوسرے کا بھی دورہ ہو جائے۔ ہم نے دیکھا ہے اگر خوشی کا دورہ ہے تو وہ ایک عرصہ تک رہا ہے، اگر کوئی مصیبتون سے کراہ رہا ہے تو یہ آواز بھی ہر حرکت کے ساتھ برسون تک آئی ہے اور رحم و سپید نے اس صدا کو خاموش کیا ہے، اگر مرفہ الحال لوگ ضرورت مندون کی تکلیف و رنج کا احساس اور وقت پر اعانت سے دریغ نہ کرین تو اگر غم سے بالکلیہ نجات بھی مل سکے تو کم از کم تھوڑا بہت دکھ تو کم ہو جائیگا۔

احتیاج سب کو ہے اور دنیا کے کل کام ایک دوسرے کی امداد سے چلا کرتے ہین جسکو اپنے

ہی کام سے کام ہے تو دوسرے کو کیا پڑی کہ اُسکا خیال رکھے۔ خود غرضی کی وجہ سے روپیہ سے کام تو نکل جاتا ہے مگر اطمینان جس سے عبارت ہے وہ خود غرض کو میسر نہین ہوتا۔ ایک دوسرے کو آرام پہونچنے کا واحد ذریعہ ہمدردی اور صرف ہمدردی ہے، حاکم اگر ہمدرد ہے تو محکوم کا اطاعت و ہمدردی سے پیش آنا لازمی ہے جس سے دونون کو آرام اور دونون کا اطمینان ہے۔

خود غرضی ایک طرح کا ظلم بلکہ دوسرون کے حقوق کا خون ہے اور یہ ایک ایسا عام ظلم ہے کہ بیشمار اشخاص دن رات لوگون کے حقوق کے خون مین اپنے ہاتھ رنگتے رہتے ہین مگر باوجود اسکے بھی اپنے فعل کو ظلم نہین سمجھتے۔ جب یہ مسلّم ہے کہ خود غرضی بُری چیز ہے جس سے حقوق العباد تلف ہوتے ہین تو پھر خود غرض انسان اس گناہ سے کیونکر بری الذمہ ہوسکتا ہے۔ خود غرضی کے ظلم سے اگر کام نکل بھی گیا تو حقیقی مسرت سے ہمکنار ہونا معلوم۔ یہی تو ظلم ہے جسکی وجہ سے کثیر التعداد بندگان خدا محتاج ہین اور محتاجی کے طوفان مین مبتلا ! جیسے ہندوستان کا قابل رحم زراعت پیشہ طبقہ ہے جنکی تنہا محنتون اور مشقتون پر حکومتون کی سربفلک عمارتین کھڑی ہوئی ہین اور اپنی زندگی پر نازان، وہ غریب زمینداروں اور شقی القلب متاجرون کے مظالم سے تباہ و برباد اور روٹی کے لئے بھی محتاج ہین۔ خود غرضی مین چونکہ ہمدردی کی آمیزش تک نہین ہوتی، اس لئے خود غرضی مین کام نکالنے مین محتاجون کو بڑی بڑی تکلیفون کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے کو صرف محتاج ہی نہین سمجھتا ہے بلکہ محتاجی کی بدولت تمام عیوب سے متصف بھی ہوجاتا ہے اسی سبب سے کہا گیا ہے کہ ؎

آن کہ شیران را کند روبہ مزاج　　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

فی الحقیقت محتاجی بڑی ذلت ہے، احتیاج کے وقت انسان کے کمال پر تاریکی کے پردے پڑ جاتے ہین عزت نفس خاک مین مل جاتی ہے، خودداری کا خاتمہ ہوجاتا ہے، غرض محتاجی کے عجب کرشمے ہین مگر احتیاج کے اثرات سے وہ حضرات متاثر نہین ہوتے جو راضی بہ رضا شاکر و صابر اور اللہ والے

ہوتے ہین یہ صرف اُسی معبود حقیقی کے محتاج ہوتے ہین جسکا ہر ذی روح محتاج ہوتا ہے، خدا ایسون کی حاجت برآری کرتا ہے اور اسطرح پہنچاتا ہے کہ دنیا حیرت مین رہتی ہے مفلس ہون یا منعم سب فقیر و محتاج ہین دنیا مین جس طرح منعم کم ہین اور مفلس زیادہ، اسی طرح پاکیزہ صفات کے لوگ تو انگلیون پر شمار کیے جاتے ہین اور برون کی تعداد تو حشرات الارض سے کم نہین ہوتی - اچھون مین اللہ والے تو شاذ و نادر ہی ہوتے ہین اور وہ بھی نظرون سے دور ہی وہ لوگ ہین جو خدا کی عبادت اور اُسکے واجب الاحترام احکام کی تعمیل اپنا فرض سمجھتے ہین اس لئے وہ اپنی ضروریات سے مستغنی ہوکر اسکو خوب سمجھے ہوے ہین کہ ؎

کارساز ما بہ فکر کار ما فکر ما در کار ما آزار ما

بحث تو اُن لوگون سے ہے جو معاملات دنیوی مین اپنا زیادہ وقت صرف کرتے ہین، جنکو دین سے زیادہ دنیا ہی کی فکر ہوتی ہے اگر خود غرضی دلون سے اُٹھ جائے یا کم از کم اسی مین نمایان تخفیف ہو جائے اور ہمدردی بیدردی پر غالب آجائے تو دنیا مین احتیاج کے معاملات مین اتنی مصیبتین اُٹھانی پڑین جتنی محتاجون کو اُٹھانی پڑتی ہین ہمدردی دلون مین پیدا ہونے کے لئے درستی اخلاق کی ضرورت ہے جو شخص عقل سلیم رکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اچھی باتین ضرور فائدہ بخش ہوتی ہین تو مفید امور سے اعراض کرکے مضر امور کی طرف رغبت و رجحان عقلمند آدمیون کا کام نہین ہے - عاقل وہی ہے جو خود بھی بچے اور دوسرون کو بھی بچائے ورنہ جاہل و نادان نہ تو خود آفت سے بچ سکتا ہے اور نہ دوسرے کو بچا سکتا ہے اگر جاہل زردار ہوا اور عالم بے زر ہے تو عالم جاہل کے پاس ضرورت و احتیاج لیکر جائیگا، اس وجہ سے کہ وہ زر کی قدر و منزلت سے خوب واقف ہے مگر جاہل عالم کے یہان علم کی دولت حاصل کرنے کے لئے اس وجہ سے نہین جاتا کہ وہ اپنے جہل کے باعث علم کی فضیلت سے ناواقف ہوتا ہے محتاجی تو عیت اور ضروریات کے لحاظ سے تکلیف و راحت کا باعث ہوا کرتی ہے - اگر محتاج صابر و قانع اور خوددار ہو تو اپنی حاجت برآری مین ہرگز ذلیل و خوار نہوگا - افسوس ہے کہ احتیاج کے وقت خودداری کی خودداری بھی مٹجاتی ہے مفلس ہے تو منعم کی خوشامد کرتے کرتے زبان خشک کر لیتا ہے عالم ہو تو جاہل کی منت کرتے کرتے اپنی

توہین اپنی نظرون مین خود کرلیتا ہے، نادار اُستاد شاگرد کے سامنے زانوے ادب تہہ کرکے بیٹھ جاتا ہے، مرد ہو تو
احتیاج سے عورت کے آگے نامردی کا شیوہ اختیار کرلیتا ہے پھر بھی نہ تو حاجت ہی پوری ہوتی ہے اور نہ عزت ہی باقی رہتی ہے

ع "بات بھی کھوئی التجا کرکے"

محتاجو! تم اپنے کو دیکھو کہ تم مین جوہرِ کمال کیا ہے اور احتیاج کس بات کی ہے، اگر کمال اعلیٰ ہے اور احتیاج ادنیٰ
تو ادنیٰ احتیاج کے لئے اپنے جوہرِ کمال کا سودا سستے دامون نہ کر ڈالو، اپنے گوہرِ کمال کو کوڑیون کے دامون نہ بیچو،
کامل ہو کر ناقص کے آگے ذلیل وخوار نہ ہو، اپنے کمال کی کسادبازاری نہ کرو اس وجہ سے کہ یہ جوہر بہت گران بہا
ہے اور عقل وفہیم لوگ اسکو ہمیشہ مہنگے دامون خریدنے کے لئے طیار ہین۔ کمال کی بدولت تم اس قابل ہو کہ عقل
سلیم تمہاری عزت کرتی ہے، اس لئے جاہلون کی نظرون مین اپنے آپ کو ذلیل اور اپنی وقعت کو کم نہ کرو،
تمہاری خواہشین پوری نہون تو نہ سہی مگر اپنے علم وکمال کی عزت کے پورے طور سے محافظ رہو، تمہاری ضرورتیات
وہی پوری کرنے والا ہے جس نے تمہین اس مرتبہ پر پہنچایا ہے، عزت کی مسند پر بیٹھکر ذلت کا ٹھیکرا نہ لو، تم اہل
جوہر و اہلِ کمال ہو اس لئے تمہارے لئے بھیک باعثِ ذلت وتہتک ہے۔

منعمو! تم دولتمند ہو، خدا نے تم کو ایک بڑی نعمت دی ہے جو تمہین مبارک رہے، مگر خدا کی دی
ہوئی نعمت کے شکریہ مین تمکو چاہیئے کہ خدا کے بندون کو بھی اپنی طرح آسایش وآرام سے محروم نہ رکھو اور خدا کے
احکام پر عمل کرو، اگر تمہارا یہ اعتقاد ہے کہ اس طرح کے سلوک مین تم بھی محتاج ہو جاؤگے تو خدا کے احکام پر عمل نہ
کرنے کے لئے یہ تمہارا ایک حیلہ ہوگا جسکے جواب کے لئے تم کو طیار رہنا چاہیئے۔ ع

"کس بشنود یا نہ شنود من گفتگوئے می کنم"

مقصدِ حیات

ارادہ کی پختگی اور خیالات کی استواری انسانی زندگی کے مقصد کے لئے نہایت ضروری ہے کسی کام کی ابتدا کر کے انتہا کو پہنچا دینا پختگی کا ثبوت ہے، زندہ قومیں ترقی کی دوڑ میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتی ہیں اور اپنی انتھک کوششوں سے اپنے مقصدِ حیات کو شرمندہ نہیں ہونے دیتیں۔ حیات کا مقصد جیسا ایک بادشاہ کا ہے ویسا ہی ایک فقیر کا، لیکن دونوں میں فرق ایسا ہی ہے جیسا بادشاہ و گدا میں، مگر یہ فرق صرف زندگی تک محدود ہے، مادرِ زمین دونوں کو اپنی آغوش میں خاموش لوریاں دے دیکر سلا دیتی ہے اور اُسی یکسانیت کا برتاؤ کرتی ہے جس طرح ماں اپنی تمام اولاد سے کرتی ہے۔

یوں تو دنیا میں ہر انسان کا مقصدِ حیات طبایع کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہوا کرتا ہے لیکن مقصد جس سے عبارت ہے اُسمیں غریب بھی جسارت کر سکتے ہیں اور امیر بھی حصّہ لے سکتے ہیں خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ دولتمندوں کی دولت اُنکی عیش و عشرت ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے، بلکہ غربا و مساکین کا بھی اسمیں عام حق ہے گو ہر زمانہ کا رنگ ایک جُدا گانہ طرز رکھتا ہے اور زمانہ والے وہی روش اختیار کرتے ہیں جسکی زمانہ میں مانگ ہو، موجودہ زمانہ اور اسکی ضرورتیں وہ نہیں ہیں جو پچھلے زمانوں میں تھیں، انسانی جذبات بدستور موجزن ہیں مگر اُنکی حالت بدلی ہوئی ہے، خیالات میں تغیر اور تہذیب معاشرت میں انقلابِ عظیم ہو گیا ہے، لوگوں کو اپنے اسلاف کی قائم کی ہوئی شاہراہ پر چلنا مشکل بلکہ ناممکن ہو گیا ہے، اِس لئے عقلمندوں کے مسلّمہ اصول کے موافق ہمکو بھی اپنا مقصدِ زندگی قرار دینا چاہئے ہمیں زندہ قوموں کے

اُصولِ ترقی پر غور کرنا اور عملاً یہ ثابت کر دینا چاہئے کہ مشرق بھی اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے
اصلاح پذیر ہو سکتا ہے اور دنیوی ترقیون کی گتھیون کو اپنے ناخن تدبیر سے کھول سکتا ہے۔

ہندوستانی مدت سے اپنے مقصدِ حیات کو بھولے ہوئے ہین اور اس بھولنے کا خمیازہ جیسا بھگت
رہے ہین اسکو کچھ دل ہی محسوس کر رہا ہے گزشتہ عالمگیر جنگ نے ہندوستانیون کو بیدار تو کر دیا ہے مگر بیداری
صبح کی محبوب نیند سے کم نہین ہے کہ آنکھین کھول کھول کر بند کر لیتے ہین اور اُٹھتے اُسی وقت ہین جب
پڑوسی منزلِ مقصود پر پہنچکر اور کاروبار مین مصروف ہو کر ہم سے آگے ہو جاتے ہین، گزشتہ جنگ نے یہ ثابت کر دیا
کہ زندگی کا مقصد وحید قوم اور مُلک کا تحفظ ہے، ہم دیکھ رہے ہین کہ یورپین قومین اپنی حفاظت کے لئے
تجارت سے دولت جمع کر رہی ہین، ملکی حفاظت کے لئے جدید آلاتِ حرب کا اضافہ کر رہی ہین اپنی قوم کو زندہ
رکھنے کے لئے ہر قسم کی دماغی تدبیرون سے کام لے رہی ہین، قوم و مُلک کو باقی رکھنے کے لئے میدانِ جنگ
مین قیمتی جانون کا سودا سستے دامون مین کر رہی ہین، یہان تک کہ دوسرون کے جائز حقوق کی پامالی
وہ اپنی ڈپلومیسی کی کامیابی سمجھتی ہین، وعدہ وعید کی پابندی کو وہ ایک کھلونا سمجھتی ہین مسیحیت یا دہریت
کے سوا ہر مذہب و ملت کو رقیبانہ نظرون سے دیکھتی ہین، غرضکہ ہر پہلو سے اپنی زندگی کی ہر ادا سے اپنے
مقصدِ حیات کو پیش پیش رکھتی ہین اور بیداری ہو یا خواب ہر وقت مقصدِ حیات ہی کے نقشے پر متجسسانہ اُنگلیان
پڑی رہتی ہین۔

زندگی اس سے عبارت نہین ہے کہ شب و روز آرام و آسایش اور نا و نوش مین مبتلا رہ کر صبح سے
شام یا شام سے صبح کر دین یا مغربی قومون کی طرح ہوس کو اتنا بڑھائین کہ دُنیا کی ساری دولت ہر ممکن
تدبیر سے اپنے قابو مین لے آئین، برگزیدہ انسانون نے ایسی حریصانہ زندگی کی مذمت کی ہے، انسان
قارون کا جانشین بنکر صحیح معنون مین نامور ہر دلعزیز نہین ہو سکتا، ہر دلعزیزی کی جڑ اُسیوقت مضبوط
ہو سکتی ہے جب زندگی کے مقصد کو پہچان لیا جائے، جڑ کی مضبوطی ہی سے شاخین پھوٹ سکتی ہین اور

... خبر رہ سکتا ہے، حیات کے مقصد کا پہچاننا جڑ ہی کی تو پائداری ہے اور خدا کا پہچاننا عقل ہی کی پختگی کی علامت ہے۔ جب اسکی پختگی مین شبہ رہیگا تو مقصدِ حیات بھی قائم ہو جائیگا۔ پیدایش موت کی خبر دیتی ہے، جسم فنا ہو جاتا ہے، مگر اعمال باقی رہ جاتے ہین، عادات و خصائل دنیا کے کارنامے صفحۂ روزگار پر باقی رہ جاتے ہین، جنکو دُنیا غور سے دیکھتی ہے اس لئے فریضۂ انسانی ہے کہ وہ خود کو پہچانتے ہوئے اسکو بھی یاد رکھے کہ وہ کس لئے خلق کیا گیا ہے اور اسے کیا کرکے اپنی مخلوقیت کی یادگار چھوڑنا ہے، اگر کوئی بہتر یادگار (اعمال حسنہ) نہین چھوڑی تو سمجھنا چاہیے کہ زندگی کا مقصد ہی پورا نہین ہوا۔

آج ہندوستان مغربی تہذیب کے زیر اثر ہے اور بہت کچھ اُسکی وضع و معاشرت مین فرق آگیا ہے اور اب تو ہندوستانیون کا ظاہر مقصدِ حیات "وَالنَّاسُ عَلیٰ دِینِ مُلُوکِھِم" پر قایم ہے اور اسکو سب نے بلا غور و فکر زندگی کا کامیاب مقصد سمجھ لیا ہے، چنانچہ تبدیلِ وضع و معاشرت کی تبدیلی سے خطِ استوا کے باشندے بھی گورے یوروپین معلوم ہونے لگین، جیسا کہ ہمارے آزاد خیال ترکون نے چھجے دار یوروپین ٹوپیان زیبِ سر کرکے یہ سمجھ لیا ہے کہ اس تبدیل ہیئت و وضع مین مُلک و قوم کی فلاح ہے۔ مسلمانون کا وجود اُنکی ترقی نہ بھیس بدلنے سے ہوئی ہے اور نہ معاشرت کی تبدیلی سے، بلکہ مذہب کے میدان مین اُنہون نے اپنے اصیل گھوڑے دوڑائے ہین، جب تک انمین مذہبیت باقی رہی یہ دنیا مین بڑھتے رہے، اُنکے فتوحات سے تمام عالم لرزتا رہا، آنحضرتؐ اور اُنکے محترم جانشینون نے نہ وضع بدلی اور نہ معاشرت، نہ عرب کا لباس چھوڑا اور نہ عرب کے خواص ترک کئے، وہی عرب کے رسم و رواج تھے، وہی عرب کی ہمدردی و محبت تھی، وہی عرب کی غیرت و خودداری تھی اور وہی عرب کی شجاعت و بہادری تھی، اُنہون نے اسکو اپنے سامنے مرنے والون اور اپنے سر سے اُٹھنے والے بزرگون سے سیکھا تھا اور "قرآن مجید" نے بتایا تھا یا پیغمبرِ اسلام کی زبان سے، نشست و برخاست سے، تحمل و برداشت سے، ایثار و قربانی سے، وعظ و پند سے، ہمت و استقلال سے، غرضکہ انہین کے حرکات و سکنات سے سب کچھ سیکھا تھا اور اسی تعلیم نے

عرب و عجم، مصر و شام، ہند و افغانستان اور روم و ترکستان کو زیرنگین کرلیا تھا، جب تک ہماری وضع باقی رہی ہم بھی ممتاز رہے، جب تک ہمارا مذہب برقرار رہا، ہم بھی جنبش نہ کرنے والے کوہ ہمالیہ بنے رہے جب سے یہ چھوڑا دُنیا نے بھی بے رخی اختیار کرلی اور مقصدِ حیات بھی پہاڑوں سے سر ٹکرانے لگا، مسلمانوں کا مقصد حیات تو یہ ہے کہ وہ مذہب کے پابند رہ کر علمی و صنعتی ترقیاں کریں، خیالات و جذبات میں اعتدال رکھیں، اسراف سے بچیں، تعلیم میں بڑھیں، فرائض کو یاد رکھیں، اپنی برادرانہ رشتی میں اپنے تمام بھائیوں کو مضبوطی سے کس لیں، ایثار و رحمدلی کے دامن کو وسیع کریں، وطن کی محبت کا جامہ سر اقبال کے ہمنوا ہو کر سطرح پہن لیں کہ

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا ہندی ہیں، ہموطن ہیں، سارا جہان ہمارا

دنیا کی قومیں اُس وقت بنی ہیں جب اُنکا مقصدِ حیات مقرر تھا، اُس وقت بگڑی ہیں جب اُنھوں نے مقصدِ حیات کو جہالت کے نذر کردیا اور بے اصول زندگی پر جانوروں کی طرح سانس لیکر زندگی کے غلط مفہوم کو سمجھنے لگے مسلمانوں کا جب مقصدِ حیات منضبط تھا تو وہ ترقیوں پر ترقیاں کر رہے تھے اور یوروپین قومیں جھاڑیوں میں اُلجھ اُلجھ کر چھانک رہی تھیں، مسلمانوں کے مقصدِ حیات میں جب تزلزل واقع ہوگیا، تو اب یہ یورپ کو حسرت سے دیکھنے لگے، یہ انقلاب ہماری غفلتوں کا نتیجہ اور ہماری بے اصول زندگی کا خمیازہ ہے، جب تک ہم مذہبی رہ کر زمانے کے موافق نہ بنینگے اور اُن باتوں سے احتراز نہ کرینگے، جو زندگی کو تلخ اور ناگوار بنا دیتی ہیں اُن امراض کا علاج نہ کرینگے، جن سے ہماری قومی صحت خراب ہو رہی ہے، اُس وقت تک نہ ہم صحت سے ہمکنار ہوسکتے ہیں اور نہ قعرِ مذلت سے اُبھر سکتے ہیں، سعی جد و جہد ہمیں کامیابی کے دروازے پر پہنچا سکتی ہے، تعلیمی ترقیاں ہمیں نمایاں و ممتاز بنا سکتی ہیں، انہیں کنجیوں سے مقصدِ حیات کا دروازہ کھُل سکتا ہے۔

نہ قوموں کے پنپنے کا کوئی قانون ہے اور نہ ملکوں کے سنورنے کا کوئی ضابطہ۔ قوموں کا مدوجزر ملکوں کے انقلاب بتاتے ہیں، کہ چند روز اُدھر جو قومیں آسمان پر حکومت کر رہی تھیں، اب اُنکو زمین پر حشرات الارض بھی مُنہ نہیں لگاتے، دنیا کی حالت ایک ہنڈولہ کی سی ہے، جھولنے والے اسکی گردش میں تہ و بالا ہوتے ہیں

پچھلے انقلابات، گزشتہ واقعات ہمارے کانون مین اب بھی گونج رہے ہین اور صفحاتِ تاریخ مین باقی، اس کو جانتے اور سمجھتے ہوے مقصدِ حیات کو بھلا دینا اپنی زندگی کو خیرباد کہدینا ہے۔

ترقیان دُنیاوی ہون یا رُوحانی، یہ بغیر استقلال و کوشش کے کسی سے بھی حاصل نہ ہوسکین دُنیاوی ترقیون کا میدان گل ریز نہین ہوتا، کہ انسان گلچینی کرتا اور اُنکی خوشبو سے دماغ معطر کرتا ہوا چلا جائے اور نہ رُوحانیت کی منزلین ایسی سہل و آسان ہین کہ انسان برسون کا راستہ مہینون مین، دنون کا راستہ گھنٹون مین طے کرکے منزلِ مقصود پر پہنچ جاے، ہم نے اس میدان کی بھی گلچینی کی ہے اور ان رُوحانی منزلون پر بھی ہمارے ہی بزرگون کے نشاناتِ قدم ابتک اُبھرے ہوے ہین، بزرگون کی یہ ریاضت اور مصائب زندگی کے مقاصد مین تھے، جسکو اُنھون نے اس طرح برداشت کیے کہ آج دُنیا حیرت کرتی ہے۔

جو لوگ غافل ہین وہ حصولِ ترقی سے ناواقف اور اپنی زندگی کی غایت سے بھی ناآشنا، اُنکی زندگی جانورون کی زندگی ہے، جس دل مین نہ جوش ہو اور نہ امنگ، جس قوم مین نہ استقلال ہو نہ صبر اور نہ مصائب برداشت کرنے کی ہمت، وہ اپنے مقصدِ حیات کو کیا سمجھ سکیگی، عرب کے ریگستان مین پیغمبرِ اسلام کا پیامِ توحید سنئے کربلا کے بیابان مین حسینؑ کا مقصدِ حیات دیکھیے، اجمیر کے کفرستان مین خواجہؒ کو نماز مین مصروف پائیے ایران کے بہارستان مین کوہکن کی شیرین پرستی کو یاد کیجیے، کولمبس کو نئی دُنیا مین ڈھونڈھ لیجیے، نپولین کا فرانس مین شاہانہ اقتدار دیکھ لیجیے، یہ تھے مقصدِ حیات، جن پر قومین جتنا بھی ناز کرین تھوڑا ہے

منزلِ مقصود پر وہی پہونچتا ہے، جو نہ پہاڑون کو دیکھتا ہے اور نہ صحراؤن کو، نہ درندون کا خوف ہوتا ہے اور نہ بھوت پریت کا خطرہ، خدا پر تکیہ کیے ہوے اپنی تدبیرون مین مصروف اور اپنی منزلون کی مسافت کا شمار کررہے ہین، وادیِ طلب کی رُکاوٹون کو دور کرنا، پیچیدار راستون مین نہ بھٹکنا، اپنے مقصد کو پیشِ نظر رکھنا، نہ آندھی کا گرد و غبار آنکھون کو کھلنے کی زحمت دیسکتا ہے، نہ بجلی کی چمک خیرگی پیدا کرسکتی ہے اور نہ بادل کی گرج دلون کو ہلا سکتی ہے، مصائب کا مقابلہ یون کیجیے کہ ؎

سر شمع سان کٹائیے پر دم نہ ماریئے — منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے (آتش)

کام کو شروع کرنا اور مشکل سمجھ کر ادھورا چھوڑ دینا، مقصدِ حیات کا بودا پن ہے، مشکلین جب ہی آسان ہو سکتی ہین، جب اُنکا مستعدی سے مقابلہ کیا جائے، مہلک امراض جب ہی زائل ہو سکتے ہین جب اُن کا مسلسل اور صحیح تشخیص سے علاج کیا جائے۔ ایک ہی مرض کے دو مریض ایک اپنی بد پرہیزی سے مر جاتا ہے، دوسرا اپنی احتیاط سے بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔ ایک مین مقصدِ حیات کا اصلی جوہر تھا، دوسرا صرف جوہر کی چمک کو زندگی کی روشنی سمجھ رہا تھا، اچھے ہونے والے نے مصائب کا مقابلہ کر کے اپنے صبر و استقلال کی سکت دکھلا دی، مرنے والے نے آنکھین بند کر کے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا، مقصدِ حیات کوئی ہنسی کھیل بھی نہین ہے اور نہ کوئی معمولی سودا ہے، جو بازار کی ہر دکان سے مل سکے علوم و فنون کی ڈگریان حاصل کرنے مین کیسی کیسی محنتین اُٹھانی پڑتی ہین، کیسے کیسے روح فرسا مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے، فتوحاتِ ملکی مین دانتون پسینہ آجاتا ہے، روپیہ کی بربادی اور جانون کی قربانی، یہ تو اسکا معمولی صدقہ ہے، مگر کامیابی کے بعد جو مسرت ہوتی ہے، وہی مقصدِ حیات کی حقیقی فتح ہے۔

ہم بھی آج کل "سوراج" کے مقصدِ حیات کا دنیا مین اعلان کر رہے ہین اور اس سیاسی پل صراط سے گذر رہے ہین، بڑھ بڑھ کر ٹھہرتے ہین اور ٹھہر ٹھہر کر ٹھوکرین بھی کھاتے ہین، ٹھوکرین کھانا اور پھر سنبھلنا عربی الاصل گھوڑے کی فطرت ہے، اتحاد و اتفاق کی لگام چونکہ ابتک ڈھیلی ہے اس لئے ہر قدم پر ٹھوکرین کھانا ہمارے منصوبون کی اُچٹتی ہوئی شکست ہے۔ ہندی نژاد ٹٹو اپنے مقصدِ حیات کو سمجھتا ہوا اپنی منزلین کامیابی سے طے کرتا چلا جاتا ہے اس لئے کہ دانہ گھاس اُسکی پیٹھ پر لدا ہوا ہے، ڈلکی پوئی اور سرپٹ کی تعلیم وہ اپنے صدیون کے عربی الاصل ساتھیون سے بہت پہلے سیکھ چکا ہے۔ اُسکو ناز ہے کہ مہاتما گاندھی اپنے چرخہ و کھدر کو اس پر لادے ہوئے دنیا کے ہر گوشہ مین اپنے مقصدِ حیات کا ڈھنڈھورا پیٹتے پھرتے ہین، اُسکو فخر ہے کہ پنڈت مالویہ اسکی پیٹھ پر بنارسی دوپٹون کی زین کستے اور سنکھ بجاتے ہوئے نماز مغرب کے وقت عربون کی مسجد کے سامنے اُسکو

ٹہلانا اور سنگی تکان دور کرنا چاہتے ہیں اور سنکھ کی مذہبی موسیقی اور ٹٹو کی فطری موسیقی (ہنہنانا) سے نمازیوں کو وجد میں لانا چاہتے ہیں، بھولے مسلمان نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور گاندھی جی کی روحانیت پر اعتقاد، شیر پنجاب کی زندہ دلی پر یقین اور دیوتائے بنارس کے جوتشی علم پر ایمان رکھتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا یہ مقصد حیات پختگی کی حد پر پہنچکر گنگا کی لہرون میں جذب ہو گیا تو وہ دن دور نہیں کہ سوراج نہیں بلکہ ہندوراج میں ہولی دیوالی کے موقعون پر گایون کے بجائے انکی بھینٹ (قربانی) چڑھا کرینگی اور انکے ریگستانی خون کے قطرے تمازت آفتاب سے منجمد ہوکر پیشانیون پر قشقہ کا کام دینگے، یا عربی خون کا سیلاب "گنگا مائی" کو مہا جلے میں عروسی غسل کرادے گا۔

لسان العصر اکبر نے بہت پہلے اس مسئلہ پر حکیمانہ نظر ڈالی تھی اور مرنے سے پہلے کہہ گئے تھے

"گائے کا تو کچھ ٹھکانا بھائی گاندھی نے کیا"
"شیخ جی کا اونٹ کس کل بیٹھتا ہے دیکھئے"

شیخ جی کے اونٹ کو بغیر ایک کل پر بٹھائے ہوئے نہ زندگی کا مقصد پورا ہو سکتا ہے اور نہ بغیر اسکے شیخ جی کی زندگی صحیح معنون میں زندگی سمجھی جا سکتی ہے، جب شیخ جی کا کوئی مقصد حیات ہی نہیں تو انکی زندگی افریقہ کے وحشیون سے بدتر اور انکی زندگی دنیا کے لیے باعث ننگ اور انکی آبائی ناقہ سواری پر افسوس ہے۔

موت

ہر اک کو موت کا اک دن پیام آئیگا
خدا کا نام لئے جاؤ کام آئے گا (اکبر)

دُنیا مین زندگی ہی ایک ایسی نعمت ہے جسکا ہر کہ و مہ شیدائی ہے، ہر ذی روح اپنے لئے عمر نوح کی دعائین مانگتا ہے بوڑھا ہو یا جوان کمسن ہو یا بچہ، ہر ایک تندرست رہکر زندہ رہنا اپنی زندگی کا حق سمجھتا ہے دُنیا کی لذتون کا مزہ چکھنا اور اسکی آرائشون مین پھنسا رہنا بھی اہل دُنیا کا فطری مذاق ہے باری تعالی نے گلشن عالم مین ایسی ایسی مختلف النوع چیزین خلق فرمائی ہین جنکو دیکھکر محدود عقل کا انسان حیرت کرتا اور اسکی حکمت و صناعی کی بیساختہ داد دینے پر مجبور ہوتا ہے گویا گونا گون نعمتون اور کثیر التعداد الوان کے ساتھ ذی روح کے زعم باطل کو توڑنے کے لئے موت کو پیدا کیا ہے جس سے ہر متنفس پناہ مانگتا اور اسکا نام سُنتے ہی خوف زدہ ہو جاتا ہے اور بدحواس رنجیدہ ہو جاتا ہے اور آبدیدہ کانپتا ہے اور لرزتا، یہی موت تو ہے جو زندگی کی لذتون اور مسرتون کو خاک مین ملانے والی ہے اس سے بڑھ کر نہ کوئی ڈراؤنا منظر ہے اور نہ دل آزار بات!! اس نے بہادر سے بہادر، اور دلیر سے دلیر شخص کو لمحون مین پچھاڑ دیا ہے اسکے داؤ پیچ استادانہ اور اسکی قوتین لامحدود۔ کوئی نہ اس سے زور آزمائی کر سکا اور نہ اسکی سخت گرفت سے نکل سکا، شاہنامۂ ایران کا رویین تن رستم داستان اسکے سامنے ایک خاک کی چٹکی اور کوہ قاف کے قوی ہیکل خیالی دیو اسکی خدائی قوت سے شرمندہ اور پست، زندگی کا طوفان گمراہ اور سرکش بنکر صراط مستقیم کی تلاش کرتا ہے مگر یک بیک ہستی سے عدم مین پہنچکر خاموش ہو جاتا ہے۔

اے موت تجھ سے زمانہ تھراتا ہے دنیا لرزتی ہے اور کون ہے جو تیرے تیر بخطا کا نشانہ نہین بنتا،

روزِ ازل سے تیرا طریقہ، تیرا ڈھنگ، تیرے تیور، تیرا مزاج قاتلوں کے مانند ہے، تو جہان کی بربادی کا سبب ہے، تو چمنستان کی بے رونقی کا باعث، تیرے احکام خشکی پر بھی نافذ ہیں اور تری پر بھی، زمین کا ہر گوشہ اور سمندر کا ہر قطرہ تیرا لوہا مانے ہوئے ہے۔ سائنٹیفک دماغ تیرا مقابل کوئی نہیں پیش کر سکا، اُنکی دماغی ترقیاں تجھ سے پست اور اُنکو بھی تیری تیغِ فنا سے امان نہیں۔ شہرِ خموشاں تیری جاگیر اور اُسکے ٹوٹے پھوٹے مکان تیری آباد بستیاں ہیں، نہ تو بچہ پر رحم کھاتی ہے اور نہ جوان و بوڑھے پر ترس، آغوش میں ہو یا گہوارے میں، جوانی کی منزل میں ہو یا بُڑھاپے کی سرحد پر۔ نہ تو کسی میں فرق کرتی ہے اور نہ امتیاز، تیرا دل رحم سے خالی اور تیرا قلب ہمدردی سے ناواقف ہے، نہ تجھکو کسی سے محبت ہے اور نہ مروت، تیری طوطا چشمی ازل سے مسلّم اور تیری قاتلانہ اداؤں کا ہر متنفس زخمی، تیرے قہر و غضب کی بجلی انسان پر بھی گرتی ہے اور حیوان پر بھی، شجر بھی نہیں بچتا اور حجر بھی، ہستیِ ناپائدار کو خاکِ سیاہ کرنے کے لئے صرف تیری تڑپ کافی ہے۔

دُنیا جو سوگواری کے لباس میں ہر وقت ملبوس رہتی ہے یہ تیرے ہی توجہاتِ بے پایان کا نتیجہ ہے۔ ہر گھر جو ماتم کدہ نظر آتا ہے وہ تیرے ہی قدموں کی برکت ہے گاؤں ہو یا قصبہ، شہر ہو یا مُلک، اُنکی ویرانی میں تیری ہی التفات نے حصہ لیا ہے، تو مختلف صورتوں سے آتی اور بھیس بدل بدل کر نظر کو فریب دیتی ہے، تو سمندر میں غوطے دے دے کر روح کا آخری غسل دیکھتی ہے، تو ریلوں کو ٹکرا کر عالمِ غربت کی بیکسی پر ہنستی ہے، تو ہوائی جہازوں کو دھکا دیکر جوِّ سما پر قہقہہ لگاتی اور پٹریوں کا انتشار دیکھتی ہے، تو بجلی گرا کر آہ کی ایک آخری آواز سُن کر اپنے کامیاب حملہ پر خوش ہوتی ہے، تو گولیاں چلا کر اپنا شکار بناتی ہے، تو تلوار کے حملوں کا لطف تڑپنے سے اُٹھاتی ہے، تو دیواریں گرا کر زندہ درگور کر دیتی ہے، تو آندھیاں چلا کر قومِ عاد کی تباہی کو یاد دلاتی ہے، تو زلزلوں سے ہلا کر چکنا چُور کر دیتی ہے۔ غرضکہ تو ہر صورت میں موجود اور ہر شکل میں جلوہ گر ہے، بجھ کو وقت کا حیلہ درکار ہے یہ آیا اور تو نے اپنا کاری نشتر چبھو دیا۔

کیسی کیسی ہستیوں کو تو نے خاک میں ملایا اپنے آہنی پنجہ کی گرفت میں کسا اور پھر نہ نکلنے دیا، آج ہمارے

لئے جنکے افسانے عبرت و بصیرت کے سبق ہین ۔ وہ تیرے ہی ستم و جور کا مرثیہ قیامت کے انتظار مین پڑھ رہے ہین ۔ وہ اپنے اپنے دلون مین کیسے کیسے ارمانون کو لے گئے ہین ، کیسی کیسی حسرتون پر آہین بھری ہین ، مگر تیرے لئے یہ سب کھیل اور سب تماشے ہین ۔ تو غریب الوطنی کی حالت مین بھی تو رحم نہین کھاتی ، تو اُن سے بھی تو مرعوب ہوئی اور اُن کو بھی تخت شاہی سے اُتارے بغیر نہ رہی جنکا راج پاٹ مشرق سے مغرب تک تھا اور جنکو خورشید خاور بھی خراج دینا اپنا فرض سمجھتا تھا ، نہ شاہان اُولو العزم رہے نہ اُنکے خوش تدبیر وزیر ، نہ رستم کا نشان ہے نہ اسفندیار کا پتہ ، نہ افلاطون و بقراط ہین ، نہ نیوٹن و بیکن ، نہ فردوسی و ہومر ہین نہ شیکسپیر و اڈیسن نہ وہ عظیم الشان سلطنتین باقی ہین ، نہ اُن حکما و فلاسفر کا قابل پرستش جاہ ۔ اور خیر یہ بیچارے کس شمار و قطار مین ہین ، جب خدا کے محبوب ترین نبی اور پھر ان سب کے سرور و سردار علیہ الصلوۃ والسلام تک اس عالم فانی مین باقی نہ رہے ۔

پیر فلک کی نظرون مین یہ کل دن کے کھیل اور تماشے ہین ، یہ نظارے وہ ابتدائے آفرینش عالم سے دیکھ رہا ہے ۔ اُس نے یاس و نامرادی اور ارمان و حسرت کی لڑائیان دیکھی ہین ، اُس نے موت و حیات کی باہمی کشمکش کو دیکھا ہے ، اُس نے روح و جسم کی مفارقت کے آخری اضطراب کا "رقص مضمحل" دیکھا ہے ، اُس نے آخری وقت کی تکلیف وہ غنودگی ، ایڑیون کی پٹک ، اضطرار و اضطراب ، غرضکہ انسان و حیوان کے آخری سفر کے تمام جگر خراش مناظر دیکھے ہین ۔ یہ تمام واقعات اُسکی "گرگ باران دیدہ" آنکھین شمار سے فزون تر مرتبہ دیکھ چکی ہین ، وہ اِس کا عادی ہے اور خوگر ، اسکی تفریح یہی کھیل ہین اور اسکے دل بہلنے کے سامان یہی تماشے اور اسکی بیکار زندگی کے یہ محبوب مشاغل ہین ۔

اے موت ! بہت سے مصیبت زدہ تیری ملاقات کی تمنا بھی رکھتے ہین ۔ حرمان نصیبون اور فراق کے مارون نے تو تجھ پر اپنی عزیز جانین تک قربان کر دی ہین ۔ گو یہ بھی کمتر ہوتا ہے مگر تجھ سے ہر شخص بھاگتا ضرور ہے ، تیرا نام آتے ہی غریب روح گھبرا جاتی ہے ۔ انسانی عمر جسقدر ترقی کرتی جاتی ہے آرزوؤن ، اُمیدون اور حسرتون کی گٹھری تو ہلکی ہوتی جاتی ہے ۔ مگر جینے کی ہوس بڑھتی ہی جاتی ہے اسکی آرزو ہوتی ہے کہ

درازیٔ عمر کے ساتھ مسرت کے سامانون مین بھی خوشگوار اضافہ ہوگا اور ابھی باغِ زندگی کی لطیف ہواؤن سے دل و دماغ کی تفریح کرسکینگے مگر ضعیفی کی زندگی زحمتون کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اعضائے جسمانی کمزور، ہوش وحواس مین ابتری، اُٹھنے بیٹھنے مین تکلف، ذرا ذرا سے کامون کے لئے دوسرون کے دست نگر اور ہر ایک خواہش مین دوسرون کے تابع، یہی اسباب تھے جو سکندر نے ابدی زندگی کے لئے جرعۂ آبِ حیات کو ٹھکرا دیا اور کہدیا کہ ایسی مجبور زندگی سے پُرسکون موت بہتر ہے۔ مگر یہ سکندر ہی کا دل تھا کہ اُس نے موت کو زندگی پر ترجیح دی کسی بوڑھے سے پوچھو جو ضعیفی کی سختیون اور تلخیون کا مزہ چکھ رہا ہو، اُسکی زبان کسی وقت بھی موت کو دعوت دینے کے لئے نہ لڑکھڑائیگی، کیونکہ باوجود ان تمام مصائب کے وہ زندگی کو دنیا کی اولین نعمت اور اسکی افزونی کو اپنی تنہا آرزو سمجھتا ہے۔

مرنے کے بعد انسان اگر اپنے وجود سے اپنے کو زندہ نہین رکھ سکتا ہے تو اپنے نام کو حیاتِ جاوید کے قالب مین ڈھالنا اپنی دماغی صنعت سمجھتا ہے یہ تقاضائے ہوس ہے کہ بقائے نام کے لئے پختہ قبر بنے اور نمایان مقام پر تاریخی کتبہ ہو تاکہ آئندہ زندگی ایک اُچٹتی نظر بھی ہم کو یاد کرے، ذکر گذشتہ کو دل مین تازہ کرلے باوجود دنیا سے رخصت ہوجانے کے انسان کی خام خیالی پر ہنسی آتی ہے کہ وہ لوگ جنکو زندگی مین بڑی بڑی حکومتین تھارونی دولتین تسکین نہ پہنچا سکین، زیر زمین منون مٹی کے نیچے دبے پڑے ہین، خاک مین وہ کاخ و ایوان کہان! زمین کے ڈیڑھ دو گز کے مختصر ٹکڑے پر عوام کی طرح لیٹے ہوے اپنے گناہون سے لرزان یا اپنی کسی نامعلوم نیکی کے بھروسے پر رحمتِ خداوندی پر نازان ہین صرف تھوڑے زمانہ کے لئے فراموشی سے بچانے اور کسی سیاح کی ایک نظر پڑجانے کے لئے کیسے کیسے طریقے کیسے کیسے ڈھنگ اور کیا کیا شکلین و صنعتین اختیار کیجاتی ہین۔

یہ تجربہ ہے اور انسانی فطرت بھی کہ دوست احباب، چیز بست، پالے ہوے جانور، بنائے ہوے مکان، لگائے ہوئے درخت اور اسی قسم کی تمام چیزین جن سے ہر وقت تعلق رہتا ہے اور واسطہ ہمکو اُن سے اُسیقدر محبت ہوجاتی ہے جس قدر کہ وہ ہماری نظرون کے سامنے رہتی ہین، ایک دوست سے انتہائی بےتکلفی کے ابتا ہماری اُسکی یکجائی اور ہمارا اُسکا ہر وقت اُٹھنا بیٹھنا اور ہم صحبت رہنا ہے، ایک مکان مین جو شخص مدت دراز تک

زندگی بسر کرتا ہے تو اُسکے در و دیوار سے محبت کی صدائین آنے لگتی ہین، جب وہ اسکو چھوڑنا چاہتا ہے تو دل دُکھتا ہے جدائی شاق ہوتی ہے فراق ناگوار ہوتا ہے چھوڑنا بُرا معلوم ہوتا ہے کوئی عمارت جسکو بدشعوری دیکھتے چلے آتے ہون اگر اُسکو گرتا ہوا دیکھین گے تو رنج ہوگا اور افسوس صدمہ کی ایک مؤثر کیفیت دل پر طاری ہوجائیگی، یہ واقعات جو زندگی کے مشاہدات ہین، ثابت کرتے ہین کہ یہ ہمارے خمیر مین موجود ہے کہ جسکو متواتر اور ایک طویل زمانہ تک دیکھتے رہتے ہین اُس سے اُنس کا پیدا ہوجانا قدرتی ہے یہی وہ قوی جذبہ ہے جو ہمکو توقع عمر کے لئے دعائین مانگنے کے لئے، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے آمادہ رکھتا ہے اگر یہ نہ ہوتا تو بیماری کے دفعیہ کی کیا ضرورت تھی حکما و ڈاکٹر دنیا مین کیون بنتے اُنکی حکیمانہ کوششین اور طبی تدابیر کیون صرف ہوتین، مالی قربانیان اس جان کو باقی رکھنے کے لئے کیون کیجاتین آلات جراحی کیون ایجاد کیے جاتے، جڑی بوٹیون کے لئے صحرانوردی کیون اختیار کیجاتی، معدنی اشیا کی تلاش مین بیابانون کی کیون خاک چھانی جاتی اور کوہستانون سے کیون سر ٹکرایا جاتا چونکہ زندگی کا بڑا حصہ دُنیا مین گزرتا ہے اس لئے طبیعت گوارا نہین کرتی کہ ہم اس سے الگ ہوجائین اور انکا ساتھ چھوڑ دین اور وہان جا کر بسین جہان کے حالات و واقعات سے ناواقف، طرز معاشرت سے بے بہرہ اور رسوم و رواج سے ناآشنا ہین۔

دُنیا کی ہر شئے مین گو تغیر زمانہ کے ساتھ انہدام کے آثار نمایان ہین مگر ہر چیز اب بھی ویسی ہی خوب ہے اور جاذب نظر جیسی کہ پہلے تھی۔ اسی سبب سے ہم زندگی کے طالب اور اسکی بقا کی آرزو دل مین رکھتے ہین، اور اسے موت! جو لوگ دُنیا کو فانی سمجھتے ہین اور جو درحقیقت فانی ہی ہے وہ دُنیا سے ایسی دلبستگی پیدا نہین کرتے کہ موت کا خیال انہین سوہان روح ہو وہ دُنیا کی خواہشون مین اس طرح مبتلا نہین ہوتے کہ موت سے غافل ہوجائین، وہ زندگی کو ایک قرض سمجھتے ہین جسکو موت "روح" کو جدا کرکے ادا کردیتی ہے پرہیزگار ہستیان خوب جانتی ہین کہ آنے کے وقت یہ کیسے ہونگی۔ اس لئے موت کا وقت اُنکے اطمینان کا ہوتا ہے وہ ہنسی بشاش رہتے اور بخوشی کہتے ہوئے ہمیشہ کے لئے آنکھین بند کرلیتے ہین کہ —

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

حکیم سقراط نے اپنی موت کے وقت وصال کی خوشی مین اپنے دوستون سے کہا تھا:-

"تم کو چاہئے کہ تم میرے درجہ کو "ہنس"[1] کے درجے سے تو نہ گھٹاؤ مجھکو اپنے معبود اور خدا سے ملنے کی خوشی کم از کم اتنی تو ہونی چاہئے جتنی اُس پرند (ہنس) کو ہوتی ہے"

موت کا ڈر انہین لوگون کو زیادہ ہوتا ہے جو دُنیا سے محبت رکھتے اور لہو و لعب مین عمر گو گنوا دیتے ہین، جب موت سر پر منڈلانے لگتی ہے تو سراسیمہ ہو جاتے ہین اور بدحواسی سے افسوس کرتے ہین کہ ہم توشۂ آخرت بھی تو نہ باندھ سکے، دشوار گزار منزلین اور اتنی طویل مسافت کس سہارے سے طے ہو سکیگی۔ گناہون اور معصیتون کا اعمال نامہ انہین خوف دلاتا اور خمیازۂ موت کی ڈراونی تصویرین سامنے کر کے کہتا ہے کہ اپنے ساتھ ہمکو بھی لئے جاتے ہو، دُنیا مین رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، اور آرام و آسایش کے حصول مین تو ہر طرح کی فکرین کین اور کوششین، مگر اب جہان جا کے مستقل رہوگے وہان کے لئے کیا انتظامات کئے، اب تمہارے ساتھ نہ تمہارے عزیز و اقارب ہونگے اور نہ دوست احباب، قبر کے تنگ و تاریک گڑھے مین اکیلے تم ہوگے اور تمہاری زندگی کے ساتھی اعمال۔ جو لوگ تم سے الگ ہونا دم بھر کے لئے پسند نہ کرتے تھے وہ اب تمہین پوچھنے (فاتحہ خوانی) کے لئے بھی نہ آئین گے۔

"مرقع" لکھنؤ۔ مارچ ۱۹۲۵ء

[1] پرندہ (ہنس) اپلون (omsmo) خدائے آفتاب کا پرندہ مشہور ہے اور اس لئے عالم غیب کے اسرار سے واقف ہے جب اسکی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اپنے خدا (اپلون) سے وصال کی خوشی مین نہایت سُر سے گانا شروع کرتا ہے۔

ادبیات

اُردوئے معلّٰی

ہندوستان کی عظیم الشان وسعت میں اس وقت ۱۴۴ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں یہ کل زبانیں پانچ ابتدائی طبقوں میں تقسیم کی گئی ہیں اور یہ طبقات حسب ذیل ہیں:۔

آریہ، ڈراویڈی، کولاری، تبتی، اور کھاسی زبانیں ان السنہ میں پہلا طبقہ "آریہ" تصریفی ہے اور باقی السنہ "مزلقہ" یعنی آمیزہ و تصریف "لفظ کے اندرونی تغیر سے نہیں پیدا ہوتی، بلکہ اجزا کے الحاق سے پیدا ہوتی ہے" اخیر طبقے کی چاروں زبانیں بسیط اور غیر مرکب ہیں۔ کہتے ہیں کہ آریہ زبانیں شمالی و وسط ہند میں بولی جاتی ہیں۔ ڈراویڈی زبانیں جنوب ہند میں کولاری زبانیں اُن مخصوص و محدود طبقوں میں جو جزیروں کی صورت میں مشرق اور وسط ہند میں واقع ہوئے ہیں تبتی زبانیں ہمالیہ کی گھاٹیوں میں اور کھاسی زبانیں آسام کے ایک حصہ میں بولی جاتی ہیں سنسکرت جو آریہ طبقہ کی علمی زبان تھی اور جس میں ہند کی قدیم کتابیں لکھی گئی ہیں اب مردہ زبانوں میں اسکا شمار ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں جس طرح آریہ تمدن اور آریہ لٹریچر کو کل دیگر تمدنوں پر تفوق و فضیلت حاصل ہے اسی طرح آریہ طبقے کی زبان کو بھی بسبب اُس کے لچکدار ساخت اور وسیع المعانی ہونے کے قدرتی فضیلت حاصل ہے۔ ان آریہ زبانوں میں اُردو یا دوسرے لفظوں میں ہندوستانی، فارسی عربی اور ترکی کے سائنٹفک امتزاج سے ترقی پذیر ہو کر موجودہ صورت رکھتی ہے اسکی حالت اُس پودہ کی سی ہے جو بسبب عمدہ زمین زبردست بیج اور کیمیاوی کھاد کے خود بخود زور شور سے اُگتا اور بڑھتا ہے اور جس قدر کاٹ چھانٹ کرو وہ اپنی قوت خودروی کی بدولت چاروں طرف

پھیلتا ہی جاتا ہے اور "بقائے بہترین" کے قانون کا مصداق ہوتے ہوئے اسکا بڑھنا ناگزیر ہے۔ اسکو جڑ سے اکھاڑ کر پھینکدینا ایک لا حاصل سعی ہے، بشری طاقت اسکو ہستی سے نابود کرنے سے عاجز و معذور ہے۔ دنیا کی ہر چیز پر قدرت کا قانون حکومت کر رہا ہے زبانیں بھی اسی عالمگیر قانون کے ماتحت بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ اُردو یا ہندستانی اس وقت ملک کی وہ زبان ہے جس میں اخبارات چھپتے، کتابیں لکھی جاتیں، اور ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا پارسی، شریف ہوں یا رذیل سب اسکو بولتے ہیں جس طرح یہ کشمیر و افغانستان سے لے کر بلوچستان تک سمجھی جا سکتی ہے اُسی طرح ملابار و ٹراونکور سے لیکر برما تک اس سے مطلب برآری کیجا سکتی ہے ایسے شہر جو مخلوط الاقوام ہیں مثلاً کلکتہ، بمبئی، کراچی، مدراس اور رنگون وغیرہ وہاں تو اُردو ہی ایک ایسی بان ہے جسکا جاننا ہر شخص کے لئے لازمی ہے اسطرح جائز طور پر اسکو ہندستان کی "لنگوا فرنیکا" کہہ سکتے ہیں۔

ہندستان میں اُردو زبان کی بنیاد اُس وقت پڑی ہے جب اسلام کے بڑھتے ہوئے جنگی و تمدنی فتوحات کے سیلاب افغانستان کے سر بفلک کشیدہ پہاڑوں کی بلندیوں سے بہتے ہوئے ہندستان کے میدانوں میں آکر گرے تھے، اسلامی فاتحین کے ہمراہ عربی، ترکی، ایرانی، افغانی، ترکمانی، اور حبشی افواج کثرت سے ہندستان میں آئی۔ ہندوستان نے جو ہمیشہ سے خارجی فاتحین کا خیر مقدم کرنے کا عادی ہے۔ انکا بھی کیا اور سر اطاعت جھکا دیا۔ اس وقت شمالی ہند کے وسیع میدانوں میں سنسکرت زبان عرصہ ہوا کہ "قانونِ فنا" کے تحت میں آچکی تھی یا "مرکزِ حیات" قائم نہ رہنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ زبانوں پر سے اُتر گئی تھی۔ اسکی جگہ "پراکرت" نے لی جو اپنی مقامی خصوصیات کے سبب سے مختلف الاقطاع ملک میں مختلف تھی، صدیاں گزر جانے کے بعد وہ "پراکرت" بھی معدوم ہوگئی اور اسکی جگہ "برج بھاشا" نے اس وجہ سے لی کہ ملک کے زیادہ حصہ میں بولی جاتی تھی اس لئے "ہندی بھاشا" کہلائی۔

اُردو اس طرح پیدا ہوئی ہے۔ جب اسلامی افواج کے جرار لشکر شمالی ہند کے میدانوں پر چھا جاتے ہیں اور آبادی کے بڑے بڑے مرکزوں پر اسلامی افواج کی چھاؤنیاں قائم ہو جاتی ہیں اُس وقت اسلامی فوجیں

مین توران ایران اور عرب کے سپاہی تھے جو ہند کی زبان سے محض نابلد اور بے بہرہ۔ اہل ہنود سے لین دین اور بات چیت مین بہت دقت اور دشواریون کا سامنا ہوتا تھا اس لئے اہل فوج اپنی زبان مین بھاشا کے الفاظ شریک کر کے اپنا کام نکال لیا کرتے تھے جب اسلامی سلطنت کو استحکام ہوا تو اہل فوج کا میل جول ہندؤن سے بڑھنے لگا یہان تک کہ آپس مین شادی بیاہ بھی ہونے لگی۔

یہ یقینی امر ہے کہ اُردو کا دار و مدار بھاشا کے مصدرون پر رکھا گیا ہے جب یہ بجائے خود ایک زبان ہو گئی اور اسکا رواج بھی بخوبی ہو گیا تو اس مین عربی فارسی اور ترکی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہونے لگے اور بھاشا کی ترکیبین کم ہونے لگین، اس ترکیبی زبان نے کچھ ایسی مقبولیت پیدا کی کہ ہند کی تمام زبانون پر اسکو تفوق حاصل ہو گیا اور یہ حالت پہونچی کہ بھاشا کے سوا اور کہین کچھ تھا ہی نہین اگر اس زبان کو اسی وقت عوام کے ساتھ خواص بھی بولنے لگتے تو ابتدا ہی سے ترقیون کے دروازے کھل جاتے مگر خواص نے کوئی توجہ نہین کی صرف فوجی سپاہی بضرورت اسکو بولتے رہے۔

بعضون کا خیال ہے کہ اس زبان نے اکبر کے عہد مین رواج پایا بعض جہانگیر کے لشکر کو اسکا ماخذ قرار دیتے ہین۔ قادر صاحب نے شاہجہان کا زمانہ تاریخون مین بتلایا ہے شیکسپیر الیٹ سکر نے اپنی تصنیفات مین اکبر سے پہلے نابت کیا ہے۔ زمانہ موجودہ کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ اُردو کا وجود اکبر سے بھی پہلے کا ہے سولھوین صدی کے سلطان قلی قطب شاہ کے اُردو نوحے اور غزلین وغیرہ "انجمن ترقی اُردو" کی تلاش نے شایع کر دیے ہین، یہ بھی مشہور ہے کہ اُردو کی بنیاد عجمیون نے ڈالی مگر قرینہ نہین کہتا اس لئے کہ اہل فوج کل عجمی نہ تھے ہان یہ ممکن ہے کہ اس طریقہ کو پہلے عجمیون نے نکال کر اور اس مین عربی کے الفاظ و محاورات شریک کئے ہون ایسی صورت مین عجمی اس طریقے کے موجد بن سکتے ہین نہ کہ اُردو زبان کے۔ اکثر یہ بھی کہتے ہین کہ اُردو جہانگیر کے لشکر سے پیدا ہوئی اور سب سے پہلے ولی نے اس زبان مین شعر کہا۔ حالانکہ سلطان غیاث الدین بلبن اور فخرالدین کیقباد کے زمانہ مین یہ زبان مشہور ہو چکی تھی جس کی امیر خسرو کی مثنوی "قران السعدین" شاہد ہے نیز خسرو کی

ایک دوسری مثنوی کے ایک شعر سے پایا جاتا ہے کہ اُس وقت امیر خسرو کی عمر ساٹھ برس سے تجاوز کر چکی تھی وہ لکھتے ہیں کہ

مرا عمر کز شصت بالا گزشت ہمہ پیش شاہانِ والا گزشت

سلطان محمد کی ابتدائی سلطنت میں امیر خسرو نے اس دنیا کو خیرباد کہا "عدیم المثال" اور "طوطیِ شکر مقال" یہ دونوں امیر کے وفات کی تاریخیں ہیں ان تاریخوں سے ۱۳۲۵ء نکلتے ہیں - امیر نے اپنے ابتدائی زمانہ میں اُردو کو بہت ترقی دی، انکے کلام سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُردو زبان اُن سے پیشتر نکل چکی تھی، بہرحال اسمیں شک نہیں کہ امیر خسرو، فیضی، فیاضی، اور بیدل جیسے نامور باکمال شعرا کی بدولت اس زبان میں جان پڑ گئی - اکبر کے عہد میں راجہ ٹوڈرمل کی وجہ سے اُردو کو بہت ترقی ہوئی، جہانگیر کے عہد میں فارسی اور بھاشا کے اختلاط سے بتدریج ایک زبان بنتی گئی جس کا نام شاہجہان کے عہد میں اُردو رکھا گیا- اورنگ زیب اور اُسکے جانشین کے عہد میں بھی اس زبان نے آہستہ آہستہ ترقی کرلی تھی اور فارسی حروف میں لکھی جاتی تھی مگر دفاتر سرکاری سب فارسی میں تھے-

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں جبکہ دہلی معراجِ کمال پر پہنچی ہوئی تھی ہر قسم کے عیش و سرور کے سامان اور فارغ البالی و بیفکری کے اسباب افراط سے موجود تھے، وہاں کے قلعہ معلیٰ میں جب اُردو کی رسائی ہوئی تو اسکے خزینۂ الفاظ و محاورات میں کافی ترقی ہوئی حتی کہ اِسکو "دولتی" زبان ہونیکا شرف انگریزی عہد میں نصیب ہوا جس وقت سرکار برطانیہ کا ہند پر تسلط ہوا تو لارڈ بنٹنگ نے ۱۸۲۳ء میں دفاتر فارسی کے بجائے اُردو کر دئے اُس وقت سے اُردو، اُردو ہو گئی اور اسکی مقبولیت و ہر دلعزیزی نے قصرِ ترقی میں پہنچا دیا- گولکنڈہ و بیجاپور اسکے گہوارے رہے، اور دہلی اسکا پرورشگاہ تھا، اور اب تو ہند کا کوئی شہر کوئی گاؤں اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں یہ بولی نہ جاتی ہو- یونیورسٹیوں پر اسکا قبضہ ہے اورنگ آباد، علی گڑھ اور لکھنؤ کی انجمنوں میں اسکا جلوہ ہے پنجاب میں اسکی مقبولیت، بمبئی میں اسکا رواج، مدراس میں اسکے اشارے کنائے اور کلکتہ میں اسکے راگ صبح و شام گائے جاتے ہیں، کانگریس میں یہ آزادی کا پیام دیتی ہے اور لیگ میں یہ

بے تکلف ہوکر مشورے دیتی ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کو اپنی طرف بلاتی ہے اور مسلم یونیورسٹی کو سمجھاتی ہے کہ تعلیم کا گر اور اسکی بہوتیں مجھ مین پوشیدہ ہین غرضکہ اردو کی عالمگیر حکومت کا لوہا ہندوستان کا گوشہ گوشہ مانے ہوئے ہے۔

سب سے پہلے کتاب اردو نثر مین "چہار درویش" ہے جو ۱۷۹۶ء مین ختم ہوئی اسکے بعد ۱۷۹۹ء مین "آرایش محفل" اور ۱۸۰۵ء مین میر امن دہلوی نے "باغ و بہار" اردو مین تصنیف کی "اخلاق محسنی" کا اردو مین ترجمہ کیا گیا۔ جان گلکرسٹ صاحب نے میر تقی سے "قواعد اردو" تالیف کرائی "بیتال پچیسی" کا عام فہم اردو مین ترجمہ کیا گیا ظریف الملک میر انشاء اللہ خان نے بھی ۱۸۰۸ء مین "قواعد اردو" مرتب کی۔ اردو کی عالمگیری اور عام فہمی دیکھکر شاہ عبد القادر محدث دہلوی نے ۱۸۰۳ء مین قرآن شریف کا اردو مین ترجمہ کیا۔ مولانا اسمعیل نے کئی ایک مذہبی رسائل اردو مین تالیف کیے اور اب تو ہزارون سے بھی زیادہ علمی کتابین اردو کے دامن سے وابستہ ہین اور ہر سال اردو کی مطبوعات اسکی تعداد مین خوشگوار اضافہ کرتی رہتی ہین۔

۱۸۳۵ء مین سرکاری دفاتر مین بھی اردو داخل ہو گئی اور تھوڑے ہی دنون مین انگریزی گورنمنٹ کے تمام دفاتر مین اردو ہی اردو نظر آنے لگی اسی سنہ مین اخبارون کو بھی آزادی کا پروانہ ملا ۱۸۳۶ء مین دہلی سے پہلا اردو اخبار جاری ہوا گورنمنٹ نے اردو کو ملک کی قومی زبان قرار دیا ۱۸۷۱ء مین "لارڈ میو" کے عہد مین قرار پایا کہ اردو عام فہم زبان ہے جہان تک ممکن ہو تمام ممالک محروسہ مین اسکو رواج دیا جائے۔

چنانچہ ہم اردو کی اس زندگی پر جو دولت انگلشیہ کے دامن مین بسر ہوئی ہے غور کرین تو اس امر کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ اس قلیل عمر مین جو قبولیت عام کیا بلحاظ طرز تحریر اور کیا بلحاظ اظہار خیالات اسکو نصیب ہوئی ہے دنیا کی کوئی زبان اسکی نظیر نہین پیش کر سکتی ؎

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(۱۶۔ جون ۱۹۱۵ء مطبوعہ رسالہ "تاج")

دیوانِ اُردوئے غالب

اور

حضرتِ شوکت میرٹھی

جبتک حضرت شوکت میرٹھی نے دیوان غالب کی ایک نامکمل شرح نہین چھاپی تھی اُس وقت تک نسخون مین ہندو مسلمانون کی طرح اختلاف نہ تھا، اُنکا اپنے اجتہاد شاعری پر اعتماد کرکے شرح کو چھپوانا تھا، کہ دُنیائے شاعری مین اختلاف پھیل گیا، جناب شوکت غالب کے شعرون مین تصرف ہی کرکے خاموش نہین ہوئے بلکہ اِس حد تک اصلاح دی کہ غالب کو مرنے کے بعد اپنے تلمذ ہونے کا خود ہی شرف بخش دیا، پھر دو ایک جگہ کے سوا کہین یہ بھی ظاہر نہین فرماتے کہ مطبوعہ نسخون مین یہ لفظ تھا، مین یہان پر دوسرا لفظ مناسب سمجھتا ہون، یہ اخلاقی جرم اگر غالب کی روح معاف کردے تو شاید معاف ہو جائے۔ اِس قسم کی جسارتون سے واقف ہو کر اجتہادات شوکت کا پردہ مقلدین غالب کے لئے اُٹھانا پڑا تاکہ غالب پست میرٹھی اجتہاد پر ایمان نہ لے آئین۔

غالب مرحوم کا صحیح کیا ہوا نسخہ جسکے آخر مین وہ فرماتے ہین کہ "اسکے پروف اور کاپیان سب میری نظر سے گزرے ہین" پیدا کیا اور شوکت صاحب کی شرح بھی قیمتاً منگوا کر اپنی مالیات پر بلا قصور جرمانہ کیا، اوّل سے آخر تک دونون نسخون کو ملایا اور مقابلہ کیا جس نے یہ ثابت کردیا کہ شوکت صاحب نے جو جو "من گڑھت" تحریفین کی ہین وہ ۱۸۶۵ء کے میرٹھی نسخہ کے سوا کسی مین نہین پائی جاتین، ان تحریفون کے جوابدہ قوم کے سامنے حضرتِ شوکت ہی ہو سکتے ہین مگر دلدادگانِ اُردو کو کیا غرض کہ وہ اجتہادات شوکت مین دخل دے کر اپنی شاعری کا ایمان بگاڑین۔

دیوان غالب کے کئی نسخے اس وقت میرے پیش نظر ہیں اور وہ سب کے سب اپنے اتحاد و مطابقت سے بغلگیر ہیں۔ اُمید ہے ناظرین ان تحریفوں کو ملاحظہ فرما کر شوکت صاحب کی " روح شاعری " پر فاتحہ پڑھینگے، یہیں ۳۰ شعر غالب کے یہاں ایسے پیش کرتا ہوں جس میں شوکت صاحب کی تحریفوں نے مطلب تنگ خبط کر دیا ہے اور جو معنی اُسکے شوکت صاحب نے غدر سے گھبرا کر گڑھے ہیں وہ بھی پیش کرتا ہوں تاکہ ناظرین کا ذوق شاعری شوکت صاحب کے اُستادانہ دل و دماغ سے مرعوب ہو جائے، اُمید ہے کہ زبان اُردو کے ہوا خواہ اور غالب مرحوم کے معتقدین خود بھی قلم اُٹھائینگے، تاکہ تحریفات شوکت کا استیصال ہو سکے۔

اختلافات و تصرفات ''

مشہور نسخے اور معنی		شوکت صاحب کی تحریفین
مانع وحشت " خرامی " ہائے لیلےٰ کون ہے خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا	(۱)	مانع وحشت " خرابی " ہائے لیلےٰ کون ہے خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
شوکت صاحب " وحشت خرامی " کو نہیں سمجھتے اِسی اُردو دیوان میں ایک جگہ " ناز و خرامی " بھی آیا ہے اور " فتنہ خرامی " و " محشر خرامی " تو مشہور لفظ ہیں مگر جناب شوکت کو وہم گزرا کہ لیلیٰ تو معشوقہ تھی اُسکی طرف " وحشت خرامی " کی اضافت کیونکر درست ہو سکتی ہے۔		پہلے شعر کے معنی لکھتے ہیں کہ " اے خرابی ہائے لیلیٰ تمہارے سوا مجنون کی وحشت کا کوئی مانع نہیں " پھر شرح میں جولانی دکھاتے ہیں کہ " حالی نے اس غزل کو بے معنی لکھدیا، انکو شرم نہ آئی کہ اپنے اُستاد کو مہمل قرار دیدیا ہمارے شعراء میں نازک کلام سمجھنے کی لیاقت نہیں " مولانا حالی کے انتقال کے بعد رسالہ نظارہ میں تحریر فرماتے ہیں " ہم نے حضرتِ حالی کو اسی غزل کی شرح دکھائی حیرت میں رہ گئے اور عذر و معذرت کرنے لگے "۔

(مشہور نسخے اور معنی)

(شوکت صاحب کی تحریفین)

(۲)

نہ دے "نامہ" کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ "حسرت" سنج ہون عرض ستم ہائے جدائی کا

سیدھی سی بات ہے اور کھلا ہوا مطلب کہ خط کو کیون طول دو، یہ لکھدو کہ بیان کی "حسرت" رہ گئی

نہ دے "نالے" کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ "حیرت" سنج ہون عرض ستم ہائے جدائی کا

شرح مین فرماتے ہین کہ "اے غالب "نالے" کو اس قدر طول نہ دے، صرف یہ لکھدے کہ مین متحیر ہون کس کس ظلم کا بیان کرون" سمجھ مین نہین آتا کہ "نالے" کو طول دینا کس زبان کا محاورہ ہے۔

(۳)

حنائے پائے خزان ہے بہار اگر ہے "بھی"
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

یعنی بہار ہے بھی تو کیا! مہندی کا رنگ ہے جو اڑ جانے والا ہے، بہار کی ناپائداری کی طرف اشارہ ہے

حنائے پائے خزان ہے بہار اگر ہے "یہی"
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

شرح کرتے ہین کہ "اگر بہار "یہی" ہے جسکو ہم بڑی خوشی سے دیکھ رہے ہین تو یہ درحقیقت خزان کے پاؤن کی مہندی ہے۔

(۴)

بجلی اک کوند گئی آنکھون کے آگے تو کیا
بات "کرتے" کہ مین لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یعنی ایک جھلک دکھا کر ہٹ گئے تو کیا۔ بات کی ہوتی، اس لئے کہ مجھے اسکی بھی تمنا تھی۔ شوکت صاحب نے تو شعر کی مٹی خراب کر دی، بجلی کی کوند سے انکی اگر آنکھین خیرہ ہو جاتین تو ایک اسکا کرشمہ بھی تھا نہ کہ دماغ ہی مختل ہو جائے۔

بجلی اک کوند گئی آنکھون کے آگے تو کیا
بات "کرنے مین" کہ لب تشنۂ تقریر بھی تھا

اسقدر ضعف مجھ پر طاری ہے کہ "جب بات کرتا ہون تو آنکھون کے سامنے بجلی کوند جاتی ہے اور ایسا کیون نہ ہو کہ میرا لب فریاد کا تشنہ ہے اور جب بجلی چمکیگی تو بارش ضرور ہوگی"۔ بجلی کا چمکنا اور بارش کا ضرور ہونا لوازمات سے تو نہین ہے۔

(مشہور نسخے اور معنی)

(۵) رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی ''سے'' عذر نہ کرنا گناہ ہے

یعنی اگر ہم شرمندگی سے توبہ نہ کرین تو کچھ بعید نہین کہ اسکی رحمت اسی بات (سکوت) کو پسند کرے۔ کیونکہ ہنگام تکلم سے سکوت زیادہ بلیغ ہوتا ہے

(شوکت صاحب کی تحریفین)

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی ''ہے'' عذر نہ کرنا گناہ ہے

ہم جو عذر نہین کرتے تو اسی کا بڑا باعث شرمندگی ہے۔ ''سے'' کی جگہ ''ہے'' لگا دینے سے شعر کے معنے کچھ سے کچھ ہو گئے۔

(مشہور نسخے اور معنی)

(۶) دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت مین تمام
مٹ گیا ''گھسنے'' مین اس عقدہ کا وا ہو جانا

زحمت دل کے دور کرنے کی اسقدر کوشش کی گئی کہ دل ہی تمام ہو گیا، گویا ایک ''گرہ'' تھی جو گھس گئی اور رفتا۔ اب کھلنے کی کیا۔

(شوکت صاحب کی تحریفین)

دل ہوا کشمکش چارۂ زحمت مین تمام
مٹ گیا ''کھلنے'' مین اس عقدہ کا وا ہو جانا

سخت گرہ کو جب کھولنا چاہتے ہین تو دست بست رہ کر اور سخت ہو جاتی ہے پس کھلنے ہی مین یہ گرہ لاحل ہو گئی۔

(مشہور نسخے اور معنی)

(۷) مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو مین ''کام''
چلتا نہین ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

دشنہ و خنجر سے ناز و غمزہ کو تشبیہ دیکر ہم کام نکالتے ہین یعنی انکی تاثیر کو سمجھا دیتے ہین

(شوکت صاحب کی تحریفین)

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو مین ''نام''
چلتا نہین ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

فرماتے ہین ''ناز و غمزہ'' کا نام اُس وقت تک نہین چل سکتا جبتک اُنکو دشنہ و خنجر نہ کہا جائے۔

(مشہور نسخے اور معنی)

(۸) فنا کو سونپ ''گر'' مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اگر اپنی حقیقت کا عارف ہونا چاہتا ہے تو فنا فی اللہ ہو کر فروغ معرفت حاصل کر۔

(شوکت صاحب کی تحریفین)

فنا کو سونپ ''کر'' مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

''خاشاک اپنے کو فنا کے ہاتھ مین سونپ کر اپنی حقیقت یعنی فنا ہو جانے کے ادراک کا مشتاق ہے

(مشہور نسخے اور معنے)

(شوکت صاحب کی تحریفین)

پس اُسکے طالع کا فروغ گلخن پر موقوف ہے" شوکت صاحب نے (گر) کی جگہ (کر) پڑھا اِس سے شعر کے معنے گئے گزرے۔

(۹)

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر
"ہون" گل فروش شوخیٔ داغ کہن ہنوز

یعنی داغ عشق اب نہین ہے تو میں اُسکا تذکرہ ہی کرکے دل خوش کرلیا کرتا ہون، مفلسون کا قاعدہ ہے کہ پُرانے زمانہ کی دولتمندی کو یاد کیا کرتے ہین کہ ہم بھی کبھی ایسے تھے۔

ہے ناز مفلسان زر از دست رفتہ پر
"جون" گل فروش شوخیٔ داغ کہن ہنوز

"جس طرح گل فروش اپنے پھولون کی شوخی پر خوش ہوتا ہے اسی طرح مفلس اپنے پُرانے داغ حسرت پر خوش ہین"

(۱۰)

جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع
چرخ "وا کرتا ہے" ماہ نو سے آغوش وداع

یعنی فلک نے آغوش ہلال کو کھولا ہے کہ آفتاب کو وداع کرے۔ ایک جگہ اور غالب نے کہا ہے ؎

چشم وا گردیدہ آغوش وداع جلوہ ہے

جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع
چرخ "ادا کرتا ہے" ماہ نو سے آغوش وداع

"آسمان ماہ نو کو آغوش وداع کی صورت مین ظاہر کرکے رسم معانقہ وداع ادا کرتا ہے" رسم کا لفظ تو آپ ہی نے بڑھایا یہ کہیے کہ آغوش وداع ادا کرتا ہے

(۱۱)

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے
بجلوہ ریزی باد و بہ پر فشانی شمع

یعنی تیرے خیال سے روح پھڑکنے لگتی ہے جیسے یہان شوکت صاحب لفظ اہتزاز کو نہین سمجھے۔

ترے خیال سے روح احتراز کرتی ہے
بجلوہ ریزی باد و بہ پر فشانی شمع

"روح بھی تیرے خیال سے یون احتراز کرتی ہے جیسے شمع" اہتزاز سے شوق نکلتا ہے

(شوکت صاحب کی تحریفین)		(مشہور نسخے اور معنی)
اور احتراز سے خوف۔ دیکھئے ذرا سے تصرف مین شعر کی مٹی خراب ہو گئی		
ہے گریبان "تنگ" پیراہن جو دامن مین نہین	(۱۲)	ہے گریبان "ننگ" پیراہن جو دامن مین نہین
"اگر پیراہن مین دامن نہین تو گریبان تنگ یعنی خود دق ہے۔" شوکت صاحب کوئی پوچھے کہ پیراہن جو دامن مین نہین یہی معنی کیا رکھتا ہے کہ پیراہن مین دامن نہین اور پھر بھی شعر مہمل کا مہمل رہا۔		یعنی جو گریبان کہ چاک ہو کر دامن پر نہ آپڑے وہ پیراہن کے لئے باعثِ ننگ ہے۔
ہو فشارِ ضعف مین کیا ناتوانی کی نمود قد کے جھکنے کی بھی "آسایش" مرے تن مین نہین	(۱۳)	ہو فشارِ ضعف مین کیا ناتوانی کی نمود قد کے جھکنے کی بھی "گنجایش" مرے تن مین نہین
ضعف اتنی بھی مہلت نہین دیتا کہ قد کے جھکنے ہی سے میرا تن آسایش پا سکے۔		ضعف تو چارون طرف سے ایسے دبا ڈالتا ہے قد جھکے تو کیونکر جھکے اور کدھر جھکے یعنی ضعیفی مین پشت کے خم نہ ہونے کا سبب ہجوم ضعف ہے۔
"تماشا کر" اے محو آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہین	(۱۴)	تماشا۔ کہ "اے محو آئینہ داری تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہین
"ذرا اسکا بھی تو تماشا کر کہ جیسا تو آئینہ مین محو ہے اسی طرح ہم تیری صورت مین محو ہین۔" شوکت صاحب نہ سمجھے کہ تماشا کرنا محاورہ کے خلاف ہے یہان تماشا دیکھنا مقصود ہے اور تماشا کرنا دوسری چیز ہے		فارسی والے کہتے ہین "مددے" یعنی مدد کر۔ نگاہے۔ یعنی نگاہ کر۔ تماشائے یعنی تماشا دیکھ۔ اسی محاورہ کے موافق مصنف نے یہان فعل کو محذوف کیا ہے۔

(مشہور نسخے اور معنی)		(شوکت صاحب کی تحریفین)
سُراغ تفِ نالہ۔ لے داغ دل "سے" کہ شب رو کا نقش قدم دیکھتے ہین جس طرح صبح کو نقش قدم دیکھکر شب رو کا سُراغ لگ جاتا ہے کہ ادھر سے آیا اور اُدھر گیا۔ اسی طرح داغ دل سے نالۂ شب کی تاب و تب کا پتہ مل سکتا ہے، نالہ کو شب رو اس وجہ سے کہا ہے کہ نالہ کشی کا وقت رات کو ہوا کرتا ہے۔	(۱۵)	سُراغ تفِ نالہ، داغ دل "لے" کہ شب رو کا نقش قدم دیکھتے ہین غالب استفہاماً کہتا ہے کہ ہم داغ دل کے نالہ کی گرمی کا سُراغ لگا رہے ہین یا شب رو کا نقش قدم یعنی داغ دل کی گرمی، نالہ بن کر اُڑ گئی اب اسکا سُراغ لگانا گویا شب رو کے نقش قدم کا ڈھونڈھنا ہے داغ چونکہ سیاہ ہوتا ہے اس لئے اسکو شب قرار دیا یعنی دونون باتین محال ہین"۔ شوکت صاحب نے غت ربود کر دیا اور یہ نہ بتایا کہ "لے" اس شعر مین کیسا ہے۔ کیا یا امر نہین ہے؟
رو مین ہے رخش عمر کہان دیکھیے تھمے	(۱۶)	"وہ" مین ہے رخش عمر کہان دیکھیے تھکے
عشق و مزدوری "عشرت گہ" خسرو کیا خوب شوکت صاحب نے "عشرت گہ" کی جگہ "عشرت کدہ" چپکے سے بنا دیا ہے، اور یہ سمجھے کہ مصرع ناموزون ہو گیا پھر یہ وزن بھی کوئی مشکل وزن نہین جس کا ناموزون ہو جانا چھپا رہے، آدمیان گم شدند	(۱۷)	عشق و مزدوری "عشرت کدہ" خسرو کیا خوب "کوہکن نے اپنے رقیب کے "عشرت کدہ" بنانے کی مزدوری کی تھی"۔

(مشہور نسخے اور معنی)

(۱۸) کم نہین وہ بھی خرابی مین "یہ" وسعت معلوم
دشت مین ہے مجھے وہ عیش کہ گھریاد نہین

یعنی گھر بھی مثل صحرا کے ویران ہے۔ مگر وسعت اتنی کہان۔

(۱۹) بس کہ روکا مین نے اور سینہ مین اُبھرین پے بہ پے
میری "آہین" بخیۂ چاکِ گریبان ہو گئین

آہ کے بار بار اُبھرنے کو اور بار بار ضبط کرنے کو رشتہ بخیہ گر کی حرکت سے تشبیہ دی ہے۔

(۲۰) دل مین ہے یار کی صفِ مژگان سے "روکشی"

"کاوش مژگان سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ دل مین ہے۔

(شوکت صاحب کی تحریفین)

کم نہین وہ بھی خرابی مین "کہ" وسعت معلوم
دشت ....

"وہ جنگل بھی ویران ہونے مین گھر سے کم نہین، کیونکہ مجھے اسکی وسعت معلوم ہے"

....

میری "آنکھین" بخیۂ چاکِ گریبان ہو گئین

شوکت صاحب فرماتے ہین "معشوق کا سینہ جس قدر اُبھرا اُسی قدر میری آنکھین اُبھرین، بالآخر اسکے چاکِ گریبان کا بخیہ بن گئین"۔ شعر سمجھ مین آیا تو آہین کی جگہ چپکے سے "آنکھین" بنا دیا۔ یہ اخلاقی جرم اس لئے کیا گیا کہ بے اسکے شارح ہونے کا فخر نہین حاصل ہو سکتا تھا۔

دل مین ہے یار کی صفِ مژگان سے "روک سی"

"دل صفِ مژگان کو روکنا چاہتا ہے"۔ دل مین لس کاوٹ سی بولتے ہین۔ "روک سی" نہ سُنا تھا شرح مین آپ لکھتے ہین "تمام نسخون مین "روکشی" لکھا ہوا ہے اور چاہئے تھا "روک سی"۔

پھر ایک مضمون مین "نظارہ" کے آپ ہی یون ھو گا

(مشہور نسخے اور معنی)	(شوکت صاحب کی تحریفین)

دیتے ہین کسی نسخہ مین "کشتی" کی جگہ "رد کسی" ہے
مگر چاہیے تھا رو کئے۔ ہرگز کسی نسخہ مین "رو کسی"
نہین، آپ اپنی پہلی تحریف سے پشیمان ہو کر جھوٹ
موٹ نسخہ کا نام لیتے ہین، غرض پہلے آپ ہی نے
یہ تصرف لغو کیا تھا کہ صفِ مژگان سے "رو کسی"
اب آپ ہی یہ فرماتے ہین کہ صحیح یہ ہے کہ صفِ مژگان کو
رو گئے، یعنی "سے" کی جگہ "کو" آپ خود ہی نبا
رہے ہین کہ کسی طرح رو گئے کی کل ٹھیک بیٹھے غنیمت
ہے کہ اس شعر مین آپ نے اپنے تصرف کا خلاف
عادت اقرار و اظہار تو کیا ورنہ انھین تمام اشعار مین
جو مین نے مضمون مین مقابلہ کر کے پیش کئے آپ کا
یہ اخلاقی جرم "انجمن ترقی اُردو" کبھی نہین معاف
کریگی کہ غالب کے اشعار مین چپکے سے لفظ بدل دیتے
ہین اُور یہ بھی نہین بتاتے کہ اصل کیا تھی اور خود
کیا تصرف کیا۔

	(۲۱)	
غنچہ دتا، شگفتنہا برگِ عافیت معلوم		غنچہ 'نا، شگفتنہا برگِ عافیت معلوم
کلی جبتک کھلے کھلے ساز و برگ عافیتہ کا حاصل ہونا کہاں سے معلوم ہے یہ معنی غالب نے خود ہندی مین بیان کیے ہین		"یعنی نہ کھلنے ہی کا نام غنچہ ہے، پس سامان آسایش کجا"

(شوکت صاحب کی تحریفین)		(مشہور نسخے اور معنی)
ساقی "گرے" کی شرم کرو آج الخ	(۲۲)	"ساقی گری" کی شرم کرو آج الخ
شوکت صاحب نے غت ربود کیا ہے - فرماتے ہین "آج ہمارا بدمستی مین گرجانا اتفاقی امر ہے، پس ہمارا گرجانا تیرے لئے قابلِ شرم ہے نہ کہ جائے طعن" ساقی کو منادی بنا کر یہ بھی نہ خیال کیا کہ اے ساقی شرم کرو - کہان کا محاورہ ہے -		ساقی گری کا لفظ ویسا ہی ہے جیسے منشی گری میلی کہتا ہے ؎ "شرمندہ آدمی گرہیکا توام" طغرا کہتا ہے ؎ "کند حق صوفی گری را دار" ولی دکنی کہتا ہے ؎ ترقی ساقی گری کو لائے باغ کھڑا ہے منتظر ہو جام لیکر
دیتے ہین جنت عبادتِ دہر کے بدلے نشہ	(۲۳)	دیتے ہین جنت حیاتِ دہر کے بدلے نشہ باندازۂ خمار نہین ہے
"ساری عمر عبادت کرو تب جنت ملے، یہ نشہ تو خمار کے انداز کے موافق نہین یعنی بہت کم ہے" شوکت صاحب نے "حیات" کو سہو کاتب سمجھکر "عبادت" کا لفظ بنا تو دیا، مگر یہ نہ سمجھے کہ مصرع ناموزون ہوگیا، اور معنی یہ ہوے کہ عبادت کرنے مین بڑی تکلیف ہے اسکے عوض مین جنت کا ملنا بہت ہی کم ہے لیے وصلہ		یعنی حیات دنیا مین جو تکلیفین ہین اسکی تلافی جنت مین جانے سے نہین ہوسکتی پھر اس کی مثال یہ ہے کہ جس نے خمار کی تکلیف بہت اُٹھائی ہو، اُسے تھوڑی سی شراب ملے تو کیا نشہ ہو گا -
غمِ زمانہ نے مین چھائی "نشاط عشق کی مستی	(۲۴)	غمِ زمانہ نے "جھاڑی" نشاط عشق کی مستی
"اب زمانہ بھر کے غم مین ہم پر نشاط عشق کی مستی چھا گئی" شوکت صاحب "مستی جھاڑنے" کے		یعنی غمِ زمانہ نے سب نشہ اُتار دئیے کسی بدذات لونڈی غلام کو سزا ملتی ہے تو کہتے ہین آج اسکی

(مشہور نسخے اور معنی)	(شوکت صاحب کی تحریفین)
"مستی چھا گئی" یہ زبانِ اُردو کا خاص محاورہ ہے	محاورہ کو نہ سمجھے تو تحریف کردی - یہ نہ سمجھے کہ غم سے مستی دور ہوتی ہے یا چھا جاتی ہے -
کھیل سمجھا ہے کہین چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے	(۲۵) کھیل ....
کاش یون بھی ہو کہ بن میرے "ستائے" نہ بنے	کاش یون بھی ہو کہ بن میرے "بنائے" نہ بنے
یعنی کاش یہی ہو کہ بن میرے ستائے اُنھین چین نہ آئے -	"خدا ایسا بھی کرے کہ بغیر میرے ان کی بن ہی نہ سکے"- شوکت صاحب تو فرمائین کہ ستائے مین کیا قباحت تھی جو آپنے تحریف کردی یہ بھی نہ کہا کہ یون تھا مگر یون ہونا چاہئے -
کیون "رد قدح" کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی "قے" نہین ہے	(۲۶) کیون "رد و قدح" کرے ہے زاہد مے ہے یہ مگس کی "مے" نہین ہے
اے زاہد قدح شراب کو رد نہ کر یہ سا رنگ مکھی کی قے نہین ہے (شہد) جسے تو بڑی نعمت سمجھتا ہے،	فرماتے ہین "زاہد کی رد و قدح شراب کے مقابلہ مین مکھیون کی بھنبھناہٹ سے کم نہین"
بیضہ آسا تنگ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس از سرِ نو زندگی ہو "گر" رہا ہو جائیے	(۲۷) بیضہ آسا "تنگ" بال و پر ہے یہ کنجِ قفس از سرِ نو زندگی "ہو کر" رہا ہو جائیے
قفس سے رہا ہو کر زندگی از سرِ نو ہو جانا محتاج ثبوت تھا، اسے بیضہ آسا کہ کر مصنف نے ثابت کیا یعنی طائر کی نئی زندگی بیضہ سے نکلنے کے بعد شروع ہوتی ہے اسیطرح اس کنج قفس سے یعنی بیضۂ افلاک سے رہا ہونے	"قفس انڈے کی طرح بال و پر پر تنگ ہوتا ہے پس از سرِ نو زندگی پا کر اس قفس (زندگی) سے رہائی پائین اور اذیت سے نکلین"

(مشہور نسخے اور معنی)		شوکت صاحب کی تحریفین
کے بعد تری زندگی عالمِ ارواح مین شروع ہوگی		
نہ پوچھ "سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ کہ زخم روزنِ در "سے" ہوا نکلتی ہے	(۲۸)	نہ "پوچھ" سینۂ عاشق سے آبِ تیغ نگاہ کہ زخم روزنِ در "ہے" ہوا نکلتی ہے
یعنی جس دروازے سے وہ جھانکتا ہے اُسمین روزن نہ سمجھو بلکہ تیغ نگاہ نے زخم ڈال دیا ہے اور زخم بھی ایسا گہرا جس مین سے ہوا نکلتی ہے پھر سینۂ عاشق کی کیا حقیقت ہے جس زخم سے ہوا نکلے اور سانس دینے لگے وہ ضرور مہلک ہوتا ہے۔		"عاشق کے سینہ سے آبِ تیغ مت پوچھ۔ کیونکہ سینہ کا زخم گویا دروازہ کا روزن ہے اس سے ہوا نکل رہی ہے وہ زخم کو خود خشک کر دے گی پوچھنے کی حاجت نہین۔
قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ	۲۹	قمری کفِ خاکستر و بلبل "قفسی رنگ"
قفس بمعنی سید ہے یعنی قمری ایک مٹھی بھر خاک اور بلبل ایک ٹوکری بھر راگ و رنگ ہے۔		"قمری کا رنگ خاکستری اور بلبل کا سیاہ آہنی پنجرے کے ہمشکل ہوتا ہے" پھر کہتے ہین تمام نسخون مین قفس رنگ غلط طبع ہوا ہے بلکہ قفسی رنگ چاہیے"۔ غنیمت ہے کہ یہان اپنے تصرف کا اظہار کر دیا ہے!!
قسمت کھلی ترے قد و رخ "سے" ظہور کی	(۳۰)	قسمت کھلی ترے قد و رخ "کے" ظہور کی
بجلی کو تیرے قد و رخ کا انتظار تھا کہ ایسی شکل ملے تو اس مین ظہور کرون۔		"تیرے قد و رخ کے ظہور کی قسمت کھل گئی۔ وہ تو اس شکل مین ظاہر ہوا"۔

یہان تک تحریفون کا ذکر تھا، اب وہ لغات جو غالب کے کلام مین حضرت شوکت نے پائے اُن کے معانی و مطالب اور "حل لغات" کچھ ایسے دلچسپ کیے ہین کہ قاموس و صراح کے بھی دماغ مین نہ آئے

تھے اور نہ اِن غریب لغویون کے ذہن مین سما سکے تھے:۔

"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

فرماتے ہین کہ "پیرہن ممکن ہے کہ جُداگانہ لفظ بمعنی لباس وضع کیا گیا ہو اور ممکن ہے کہ "پائے ہن" یا "پائے راہن" سے مرکب ہو۔ کیونکہ لباس سر سے پاؤن تک انسان کی برہنگی کو رہن کر لیتا ہے"۔

مین پوچھتا ہون کہ کیا "رہن و راہن" فارسی الفاظ ہین جو اس قدیم فارسی کے لفظ مین مرکب ہوگئے

"دل گذرگاہِ خیال مے و ساغر ہی سہی"

فرماتے ہین "ساغر بکسر تین پیالہ۔ یہ سغر بالفتح مصدر کا اسم فاعل ہے جسکے معنی دُور کرنا ہے چونکہ ساغر بزم مے وغیرہ مین دست بدست پھرتا رہتا ہے اور ایک سے دور ہو کر دوسرے کے جانب جاتا ہے اِس لئے غالبا ساغر پیالہ کو کہنے لگے۔ شعرا اپنے اشعار مین بالفتح باندھتے ہین۔

مین عرض کرونگا کہ اگر ساغر کا مصدر سغر ہے اور بکسر تین نہین بلکہ بکسر عین ہے تو ضرور لاغر کا مصدر لغر ہوگا۔ اور اسکا غین بھی ضرور مکسور ہوگا۔ شاعر بالفتح باندھنے لگے ہین۔

"جو تو دریائے مے ہے تو مین خمیازہ ہون ساحل کا"

خمیازہ کو فرماتے ہین کہ "وہ غالباً خم اور آز سے مرکب ہے یعنی کسی شئے کی حرص کے لئے جو خم انسان مین پیدا ہو"

یہان یہ بھی تو بمقتضائے دیانت لکھنا ضرور تھا کہ یہ حماقت خان آرزو نے کی ہے مگر آز سے کیون مرکب ہونے لگا۔ یا زہ خود ہاتھ بڑھانے کے معنی رکھتا ہے۔

"تھا خواب مین خیال کو تجھ سے معاملہ"

خیال کے معنی بیان کرتے کرتے فرماتے ہین "بعض نے خیال کی جمع "خیول" قرار دی ہے" کاش بعض کا نام بھی لکھ دیتے تو خوب ہوتا۔ لغاتِ عرب مین تو "خیل" کی جمع "اخیال"

و "خیول لکھی ہے۔ نہ کہ خیال کی۔

"آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھُلا"

ممکن ہے اختر۔ ختر بالفتح سے بنا ہو جسکے معنی فریقین کے ہین پس ختر افعل التفضیل بنایا گیا"۔

اب جو کوئی کہے کہ اختر فارسی کا قدیم لفظ ہے اسکو افعل التفضیل عربی کا نہ کہنا چاہیے سراسر غلط ہے۔ اس لفظ کا عربی ہونا جناب نے ثابت کر دیا ہے کسی عرب کے کلام مین نہ پایا جائے نہ سہی۔ کیا شوکت صاحب کسی عربی کے دیوان مین اختر کا لفظ دکھا سکتے ہین؟

"مرے قدح مین ہے صہبائے آتش پنہان"

صہبا کے معنی لکھتے ہین کہ "یہ اصہب افعل التفضیل کی مونث ہے بمعنی سُرخ تر"

مجھے یاد ہے کہ تصریف مین لکھا ہے۔ رنگ کے لئے افعل التفضیل نہین ہوتا۔ اصہب احمر و اصفر و اخضر وغیرہ کو وہی شخص افعل التفضیل سمجھے گا جس نے تصریف تک نہ پڑھی ہو۔

"گر تجھکو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ"

فرماتے ہین "اجابت بالکسر۔ جواب دینا۔ قبول کرنا، کھُل کر دست آنا"

اجابت کے تین معنی لکھے۔ مگر یہ نہین بتاتے کہ غالب کے شعر مین اس "لغتِ غریب" کے کون سے معنی آپ تجویز فرماتے ہین۔

"دشنۂ و خنجر سے کہے بغیر"

شوکت صاحب خنجر کی اصل خنصر کو قرار دیتے ہین یعنی "انگشت کوچک" یہ بھی نئی تاویل ہے۔ ناظرین آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ پیراہن و ساغر و خیال و اختر و صہبا و اجابت و خمیازہ و خنجر کیسے کیسے لغاتِ غریبہ مرزا غالب کے کلام مین تھے جنکو شوکت صاحب نے حل کر دیا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ آئینہ خانہ کو نہ سمجھے۔ بڑے بڑے شہرون مین، امرا کے مکانون مین آئینہ خانے ہوتے ہین۔ جہان جہان

غالب کے کلام میں آئینہ خانہ کا لفظ آیا ہے انھیں معنی پر آیا ہے۔ مگر شوکت صاحب ہر جگہ آئینہ خانہ کے معنی لکھتے ہیں (آئینہ کا چوکھٹا یا گھر) اب بتائیے کہ شعر کی مٹی خراب ہو گئی کہ نہیں۔

غالب کہتے ہیں ؎ وہ شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز

شوکت صاحب نے اِس تشبیہ کو بھی نہ دیکھا۔ آنکھ بند کرکے لکھدیا کہ "آئینہ کا چوکھٹا" طاؤس کی طرح پرواز کر رہا ہے۔

غالب کہتے ہیں ؎

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے　　آئینہ خانہ میں کوئی لئے جاتا ہی مجھے

شاعر نے آئینۂ دل کی شکست سے آئینہ خانہ بنایا ہے مگر شوکت صاحب کہتے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کوئی مجھے آئینہ کے گھر میں لئے جاتا ہے۔

غالب کہتے ہیں ؎

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو　　توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

یہاں بھی شاعر نے آئینہ کے ٹوٹ جانے سے شہر کے برابر آئینہ خانہ بنایا ہے مگر شوکت صاحب لکھتے ہیں کہ تو نے چوکھٹا توڑ ڈالا۔

غالب کہتے ہیں ؎

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے　　کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

شبنمستان کہنے سے آئینہ خانہ میں آئینوں کی کثرت جو شاعر نے ظاہر کی ہے شوکت صاحب اسے بھی نہ سمجھے۔ کہتے ہیں کہ "آئینہ کا پانی خشک ہو کر اُڑ گیا اور صرف خانہ باقی رہ گیا"۔

جب آپ آئینہ خانہ ہی کو نہیں سمجھتے تو شاعر کے اس تخئیل کو کیا سمجھینگے کہ آئینہ خانہ میں ایک شخص جائے تو سیکڑوں شخص اُسے دکھائی دیتے ہیں اور شاعر کی اس تخئیل کو کیا آپ سمجھینگے۔ کہ جب آئینہ کو ٹکڑے کر ڈالو

تو عکس کے ٹکڑے نہین ہونگے بلکہ ہر ہر ٹکڑے مین پورا عکس دکھائی دیگا یعنی آئینہ ٹوٹ کر آئینہ خانہ بنجائیگا
غرض آئینہ خانہ کو آپنے چوکھٹا اور آئینہ کا گھر کہکر غالب کے اشعار کی مٹی خراب کی۔ فارسی و اُردو مین باب کے بھی
معنی آپ نہین جانتے، سنئے، باب کے معنی لائق اور سزاوار اور گون کی چیز۔ زلالی کہتا ہے ؎

بیا زاریکہ لال ست دلدار — متاع نالہ ہم باب ست بسیار

دل پر آبلہ داری بہ نوک مژگان تار — کاین متاع تو باب گہر فروشان ست (غالب)

در مملکت وسیع رحمت — ہر جنس کہ می برند باب ست (صائب)

پھر اُردو مین بھی باب ان معنون پر مستعمل ہوا ہے۔ میر کہتے ہین ؎

مرا حرف رشکِ کتاب ہے — مری بات لکھنے کا باب ہے

دیارِ حُسن مین دل کی نہین خریداری — وفا متاع ہے اچھی پہ یان کے باب نہین

رُو چاہئے ہے اسکے در پر بھی بیٹھنے کو — ہم تو ذلیل اسکے ہون میر باب کیونکر

اب غالب کے کلام مین اسی لفظ کو ملاحظہ کیجئے ؎

"دھمکی مین مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا"

یعنی جو لڑنے کی گون کا نہ تھا وہ دھمکی مین مرگیا۔ مگر شوکت صاحب باب کو دروازہ سمجھے، کہتے ہین "صرف
معشوق کی دھمکی مین خطا ہو گئے۔ حالانکہ دھمکی لڑائی کا دروازہ نہ تھا بلکہ یہ تو ایک نخرہ یا غمزہ تھا"

دوسری جگہ غالب کہتے ہین ؎

"کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا"،

شوکت صاحب شرح کرتے ہین کہ "کل تک تیرا ہی دل مہر و وفا کا دروازہ تھا"

پھر اسی غزل مین غالب فرماتے ہین ؎

"یان زمین سے آسمان تک سوختن کا باب تھا"

یعنی زمانۂ فرقت مین زمین آسمان آگ لگا دینے کے سزاوار تھا، مگر شوکت صاحب نے یہان سوختن کی پوری گردان لکھ دی۔

کہتے ہین " یان میرے لئے زمین سے آسمان تک جلنے کا باب یعنی گردان تھا کہ سوخت، می سوزد، خواہد سوخت، بسوز وغیرہ۔

شوکت صاحب نے غالب مرحوم کے کلام مین جو تحریفین کی تھین اُنکا ظاہر کر دینا تو مجھپر فرض تھا۔ اِس لئے کہ "صلائے عام" اور "مخزن" وغیرہ مین شوکت صاحب نے "انجمن ترقی اُردو" کو مخاطب کر کے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ابھی سو شعر غالب کے اور ہین جو غلط چھپ گئے ہین اور ہم نے اپنی شرح مین سمجھ کر چھوڑ دیئے ہین کہ دیکھین کوئی سمجھتا ہے یا نہین، بس ہم انکو صحیح کر سکتے ہین پچھلے صفحات مین جیسی تحریفین آپنے ملاحظہ فرمائین ایسی ہی تحریفین ابھی سو شعرون مین اور ہونے والی ہین۔ اِس سبب سے کہ غالب کے مقلدین اور معتقدین ہوشیار ہو جائین۔ شوکت صاحب کی چھپی ہوئی تحریفون کو مین نے طشت از بام کر دیا اور یہ بھی دکھا دیا کہ شوکت صاحب نے کلام غالب کے لغات غریبہ کی کیسی تحقیق کی ہے مگر "آئینہ خانہ" اور "باب" کا قدیم محاورہ جہان جہان غالب کے دیوان مین آیا ہے ہان حضرت شوکت چوکھٹے اور دروازہ کو نہین بھولے غرض مشتے نمونہ از خروارے یہ مضمون جن لوگون کی نظر سے گزرے گا وہ بخوبی سمجھ سکتے ہین کہ حضرت شوکت کی سخن فہمی اور سخن سنجی کس پایہ کی ہے۔ مگر اتنا تو آپ ضرور سمجھ چکے کہ تحریف کر دینا بڑی علامت اس بات کی ہے کہ شعر سمجھ مین نہین آیا۔ اب جن اشعار مین اُنھون نے تحریف نہین کی اُنکی شرح بھی اُسی دماغ سے نکلی ہے اُس پر کیا اعتماد ہو سکتا ہے۔ اسکے علاوہ غزلیات غالب کے بہت سے نازک اور پر مضمون اشعار شوکت صاحب نے لکھے ہی نہین۔ جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ آپ اُن اشعار کو صاف سمجھتے ہین۔ قصائد غالب مین سے دو قصیدون کے چند اشعار کی بے سر و پا تفسیر کر کے آخر مین فرماتے ہین "الحمد للہ کہ حل کلیات غالب ختم ہوا باقی قصائد سہل ہونے کے سبب سے چھوڑ دیئے گئے۔

اب اس شرح کے لطیفون سے بھی لطف اُٹھایئے جو جناب شوکت کی لطیفہ پسند طبیعت نے پیدا کئے ہین - غالب فرماتے ہین ؎

لیتا ہون مکتب غم دل مین سبق ہنوز　　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

یہ سب جانتے ہین کہ غم و ہم مین یہی فرق ہے کہ کسی شئے کے فوت ہو جانے سے جو حالت انسان کے دل پر طاری ہوتی ہے وہ غم ہے اور کسی شئے کے حاصل نہ ہونے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ ہم ہے یعنی زمانہ عیش کا کبھی تھا اور اب جاتا رہا یہی رفت و بود میرے سبق مین ہے یعنی مین غم دل کے مکتب کا طفل نوآموز ہون -

شوکت صاحب اسکے معنی یون بیان کرتے ہین " دل غم عشق کا ایک مکتب ہے مگر مجھے ابتک پورا غم عشق الٰہی حاصل نہین ہوا - ابھی تو "ایرا پھیری" کر رہا ہون

اور درحقیقت یہی بات ہے کیونکہ ہر شخص کا دل محبت الٰہی کی جانب راغب ہونے کی ہدایت کرتا ہے مگر نفس "اُڑان گھائی" بتا دیتا ہے (اجی ابھی تو دُودھ کے دانت بھی نہین جھڑے بڑھاپے مین دیکھ لیا جائے گا) بس غالب اسی کا رونا روتا ہے "

خلاصہ یہ کہ رفت گیا اور بود تھا کا مطلب شارح صاحب کے خیال مین نہ آیا ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

شعر کے معنی شوکت صاحب نے جو لکھے ہین اس سے ہمین اختلاف نہین لیکن آخر مین فرماتے ہین " نہ گھر مین دل لگتا ہے نہ جنگل مین - گویا "گھن چکر" بنا پھرتا ہون "

حضرت غالب ہوتے تو اس شرح کی داد دیتے ؎

کیا کرون بیماری دل کی فراغت کا بیان　　　جو کہ کھایا خون دل بے منت کیموس تھا

شوکت صاحب فرماتے ہین " بیماری غم جو میرے دل کو لگی ہوئی ہے اُسکی فراغت کا حال کیا

بیان کرون کہ خونِ دل بے منت کیموس کھا پی چٹ کر فارغ ہو بیٹھے یعنی ایسی بلا نوش ہے کہ طبخ ثانی کی بھی ضرورت نہ رہی ایک ہی دم مین خونِ دل کا صفایا کر گئے"

کگڑ والون کی زبان مین غالب کے دیوان کی شرح کی گئی ہے ؎

کیا بدگمان ہے مجھ سے کہ آئینہ مین مرے　　طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

شعر کے معنی تو صحیح بیان کئے ہین لیکن آخر مین فرماتے ہین "یعنی مین تو اسکے غم مین کسی قابل نہین رہا اور وہ بھی بدگمان ہے کہ غالب نے میرے جلانے کو اپنے پاس کوئی "مسٹنڈی" رکھ چھوڑی ہے۔

سچ فرماتے ہین طوطیِ حقیقت مین "مسٹنڈی" ہوتی ہے ؎

مژدہ اے شوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے　　دام خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

آخر مین فرماتے ہین "صیاد کا دام او خالی رہے آمین تجھ ہمیشہ نئے نئے اُلو پھنستے ہی رہتے ہین" ؎

ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل　　بلبل کے کاروبار پہ ہین خندہائے گل

فرماتے ہین "پھول خندہ زن ہے کہ یہ "ڈھڈو" میرے فریب کا غچا کھا گئی، بھلا گل نے کہین بلبل سے وفا کی ہے ؎

باوجودیک جہان ہنگامہ پیدائی نہین　　ہین چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

کیا خوب معنی بیان فرماتے ہین "پروانہ کے دل مین ذوق کہان وہ خود اندھون کی رونق کا محتاج ہے ادھر کہین محفل افروزی ہوئی اُدھر یہ بھی "جا ڈٹا" اور شمع کے گرد گھما ہین گیا"

مین مضطرب ہون وصل مین خوفِ رقیب سے　　ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب مین

شعر کے معنی پہلے عرض کئے دیتا ہون کہ "شاعر کو گھبرایا ہوا دیکھکر معشوق کو اس وہم مین پیچ و تاب ہوتا ہے کہ کسی اور معشوقہ سے چھپ کر میرے پاس آیا ہے اسی سے گھبرایا ہوا ہے کہ کہین اسکو خبر نہ ہو جائے شاعر اُس سے صفائی کرتا ہے کہ میرے گھبرانے اور مضطرب ہونے کا سبب ہے کہ کہین تمہارے کسی عاشق کو

خبر نہ ہو جائے ہم کو عبث رشک سے پیچ و تاب ہے"۔ یہ معنی جب شوکت صاحب کی سمجھ مین نہ آئے تو ایک حکایت تصنیف کر کے معنی پہنا دئیے فرماتے ہیں :- "ہمکو معلوم ہوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرہ مین پڑھا تو ختم مشاعرہ کے بعد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس شعر مین کیا معنی پہنا دیئے ہین، مرزا صاحب نے کہا کہ مولانا آپ اس شعر کے معنی کیا سمجھینگے نہ آپ نے کبھی رنڈی بازی کی نہ خانگی بازی کی، نہ امرد بازی کی، نہ فاعل بنے نہ مفعول مین نے تو اپنا ایک واقعہ لکھا ہے یعنی جس مسماۃ پر مین فریفتہ تھا بڑی بڑی تدبیرون اور حیلون سے اسکو کسی کونے کھدرے مین فقط پر چڑھایا۔ مگر اس خوف سے کہ کوئی آ کھڑا ہوگا رجولیت چھپ کے بل مین گھس گئی۔ مسماۃ سمجھی کہ "غالب محض نامرد اور عنین ہے" مین نے معذرت مین یہ شعر پڑھا"۔

ناظرین انصاف کرین کہ کیسا صاف شعر ہے جسکے معنی مولوی صہبائی کے خیال مین بھی نہ آئے یہانتک کہ غالب سے مشاعرہ ہی مین پوچھا کہ آپ نے کیا معنی پہنائے ہین۔ غالب کی تہذیب کی صفائی شوکت صاحب کے قلم سے اوجلا پا گئی۔ کیا کہنا! استغفر اللہ اشعار کے سمجھنے کا کیا سہل راستہ اختیار کیا ہے

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے   سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یون

شوکت صاحب نے اس شعر مین تحریف بھی کی ہے (یہ دیکھنا) کی جگہ (نہ دیکھنا) بنالیا ہے، پھر بھی معنی سمجھ مین نہ آئے۔ فرماتے ہین "اس نے ڈھٹائی کی کہ سامنے آ بیٹھا اور میری طرف نہ دیکھا کہ یون بنی۔ حالانکہ یہ غلط ہے، دونون کی خوب ہل کے بجی"۔

ذرا شیخ فانی کی تہذیب ملاحظہ ہو۔

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے   تب امان ہجر مین دی برد لیالی نے مجھے

کہتے ہین "مین اگر فریاد مین گرم نہ ہوتا تو جاڑے مین جدائی کی راتین میرا سلفہ کر لیتین"۔

اس فقرہ سے ناظرین کے دماغ مین کیچڑ کی بو آ گئی ہو تو عجب نہین۔

نظم طباطبائی کا مجموعۂ قصائد و منظومات

مولانا طباطبائی وہ بزرگ ہیں جنکی ذات پر اردو علم وادب کی دنیا جائز طور سے فخر کر سکتی ہے، دنیائے اردو پر مولائے ممدوح نے وہ احسانات کئے ہیں جو کسی وقت فراموش نہیں ہو سکتے۔

بارگاہِ نبوت کے شاعر حضرت عبد اللہ بن رواحہ سے کسی نے پوچھا کہ شعر کیا ہے؟ وہ فرماتے ہیں۔

"یہ وہ چیز ہے جو سینہ میں جب کھٹکتی ہے تو زبان بولنے لگتی ہے"

شعر کی وجدانی حقیقت کو کس خوبی اور جامعیت سے ان چند لفظوں میں بیان فرمادیا۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لکھ پڑھکر اور عروض و قافیہ رٹ کر ہر شخص شعر کہہ سکتا ہے، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ خلیل بن احمد جو فن عروض کا واضع اور بانی تھا وہ شعر ہی نہیں کہتا تھا، لوگوں نے اُس سے پوچھا تو جواب دیتا ہے اور کس قدر بلیغ جواب کہ:۔

"جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں وہ کہنا نہیں چاہتا اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہیں سکتا"۔

اِس سے معلوم ہوا کہ شاعری صرف کلام موزون ہی کا نام نہیں ہے بلکہ شاعری وہ چیز ہے جسکے مزہ سے نہ ہر شاعر لذت اندوز ہوا ہے اور نہ جسکی حقیقت واقعی سے ہر شاعر واقف ہی ہے میرا عقیدہ ہے کہ علامہ طباطبائی فن شعر سے کامل واقف اور قواعد عروض کے مالک ہیں۔ ان قصائد میں اُنہوں نے جو کچھ کہنا چاہا ہے کہا اور خوب کہا ہے! جو چیز آپکے سینہ میں کھٹکی ہے اُسی کھٹک نے آپکی زبان کو گلفشانی پر آمادہ کیا ہے اور ایسی گلفشانی کہ اس وقت دنیائے اردو قصائد میں اس قدر بلند خیالات، ایسے عالی مضامین، ایسی

نادر الوجود ترکیبین اور تشبیہین ایسی چست بندشین اور ایسی استادانہ روانی پیش نہین کر سکتی -

ایران مین جب اسلام کا پھریرا اُڑنے لگا تو عرب کے تتبع مین یہان بھی شاعری کی ابتدا قصیدہ ہی سے ہوئی، ابو الشعرا رودکی نے عرب ہی کی تقلید مین اپنی شاعری کی بنیاد قصیدہ گوئی ہی سے ڈالی صلہ و انعام کے حوصلہ افزا خواب رودکی نے قصیدہ ہی مین دیکھے اور ان خوابون کی تعبیرین اسکو ہر صبح ملتی بھی رہین کیونکہ نظم کی دو بڑی صنفون مین سے قصیدہ ہی کی صنف مدح کے لئے موزون و مناسب ہو سکتی تھی، مگر یہ مجموعۂ قصائد (نظم طباطبائی) ثابت کرتا ہے کہ علامہ طباطبائی نے اگر کسی دنیوی بادشاہ کی مدح کی ہے تو کسی صلہ کی امید مین نہین بلکہ وقت کے اقتضا نے آپکو اپنی طبیعت کے خلاف اس پر آمادہ کیا ہے یا کسی احباب کے مجبور کرنے سے اسکی نوبت آئی ہے -

قیام حیدرآباد کے زمانہ مین (یادش بخیر) "ذخیرہ" کے ایک سالگرہ نمبر کے لئے مین نے بھی صفحۂ سابع کی عالی مرتبت شان مین قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی تھی اسکو آپ نے میری خاطر سے قبول تو فرما لیا اور تازہ قصیدہ کہہ کر میری آرزو کو پورا اور "ذخیرہ" کے اُس نمبر کی دلچسپی مین اضافہ فرما دیا، مگر طبیعت کا میلان اس قسم کے قصیدے لکھنے کی طرف فطرت سے ہی نہ تھا نہ اس طریقہ سے کبھی کسی دنیوی دربار سے کوئی صلہ پایا، اور نہ کبھی اسکا خیال پیدا ہوا - ہان بارگاہ رسالت مین ان قصیدون کے ذریعے سے رسائی پیدا کی، اور اپنی عقیدت کیشی کو "شہنشاہ" دین و دنیا کے حضور مین پیش کیا وہان سے اس کاوش کا صلہ "ترحم آمیز سکوت" اور "روح افزا خاموشی" سے نہ معلوم کیا کچھ پا لیا! جسکے کیف سرور کو مداح کے دل سے کوئی پوچھے! اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بیش قیمت اور طمانیت سے لبریز صلہ ہے، جو آخرت مین بطور سند پیش کیا جا سکتا ہے اور وہان یہ سند جیسی قیمتی و انمول ثابت ہوگی وہ ظاہر ہے -

عرب نے مدحیہ قصائد کا یہ اصول رکھا تھا کہ ابتدا، (تشبیب) عشقیہ اشعار سے کرتے تھے، جسکو وہ (نسیب) کے ساتھ تعبیر کرتے ہین (بہ لحاظ مضامین عشقیہ) تشبیب لکھتے ہی لکھتے مدح کی طرف

متوجہ ہو جاتے تھے، جسکو اصطلاح عرب میں "تخلیص" اور اصطلاح فارس میں "گریز" کہتے ہین اسکے بعد مدح ہوتی تھی اور مقطع کہ جس مین "دعائے تابیدی" بھی ہوتی ہے اسی پر قصیدہ کا خاتمہ ہوا کرتا تھا اس طرز کو ایرانیون نے بھی اختیار کیا، ایران کی تتبع اُردو شاعری نے بھی کی اور اُردو قصیدون کا بھی یہی ڈھچر پڑگیا، ایرانیون نے اپنی جدت پسند طبیعت کی وجہ سے تشبیب مین بہاریہ حالیہ وغیرہ متحاذب صورتین پیدا کرکے اسمین زیادہ دلچسپی و دلکشی پیدا کر دی۔

شعراء متقدمین کے کلام کا دار و مدار زیادہ تر الفاظ کی صنعت گری پر ہوتا تھا۔ پہلے مصرع مین جیسے الفاظ لاتے تھے ویسے ہی دوسرے مصرع مین بھی ان لفاظ کے مترادف یا ہموزن یا ہم قافیہ الفاظ لایا کرتے تھے، متقدمین کی یہ خصوصیت علاّمہ طباطبائی کے بھی کلام مین موجود ہے چنانچہ اس مجموعہ کے سب سے پہلے صفحہ کے پہلے قصیدے کے دو شعر ملاحظہ کیجئے۔ ان مین وزن کا لحاظ رکھا گیا ہے:ے

تعیّن نے مکان کے بیڑیان کیون پاؤن مین ڈالین — تسلسل نے زمان کے کیون مجھے زنجیر پہنائی

حواس خمسہ مین گھر کرین سیر لامکان بھولا — جہاتِ ستہ مین پھنسکر طبیعت میری گھبرائی

علاوہ ہموزن ہونے کے اکثر الفاظ تعین و تسلسل تسلسل و زنجیر، حواس و طبیعت، خمسہ و ستہ مین صنائع و بدائع کا صرف کس قدر برمحل و بامعنی ہے۔

قصیدہ کا معیارِ حسن تین چیزون پر ہے (۱) قصیدہ کا پہلا شعر جسے مطلع کہتے ہین اُسے نہایت شان و شوکت والا ہونا چاہیے، اس خصوصیت مین علاّمہ طباطبائی کے قصیدون کے مطلع کا اعلیٰ لعیار ہین۔ بلا انتخاب پہلے دو قصیدون کے دو مطلعے ملاحظہ فرمائیے:۔ ے

کہان سے کھینچکر "وارفتگی" مجھکو کہان لائی — مین ہون "رازِ نہفتہ" اور جہان "بازارِ رسوائی"

اِس قصیدہ کی تشبیب گویا حالیہ ہے انسان اپنے نفسِ ناطقہ کی وجہ سے انسان ہے اور انسانی نفسِ ناطقہ منجملہ مجردات کے ہے جسکی حقیقت ابتک کسی حکیم پر بھی منکشف نہ ہوئی اس لئے "شاعر" کا اپنی

ذات کو "رازِ نہفتہ" سے تعبیر کرنا کس قدر واقعیت پر مبنی ہے، بفحوائے حدیث قدسی "کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً" انسانی تخلیق کی غرض و غایت "عرفانِ الٰہی" ہے، عارف کو "وارفتگی" لاحق ہوتی ہی ہے، عالمِ اَلَست سے عالمِ ناسوت میں آنا ہی تخلیق اور مبداءِ حقیقی سے جُدائی ہے، حکمائے متقدمین کا خیال ہے کہ کوئی شَے محبت سے خالی نہیں اِسی لیے محبت کا ساتھ "وارفتگی" سے ایسا ہی ہے جیسا چولی دامن کا ساتھ۔

سرِ حُبِ ازلی در ہمہ اشیا ساریست ورنہ بر گل نزدے بلبل بے دل فریاد

"وارفتہ" محبوب کی تلاش میں دربدر مارا پھرتا ہے اِس "حصولِ معرفت" اور "جستجوئے یار" کی تعبیر اِن الفاظ سے کی کہ "وارفتگی" "مجھے کہاں سے کہاں" "کھینچکر" "لائی"۔ ع

"عدم سے جانبِ ہستی تلاش یار میں آئے"

بوعلی سینا نے صفتِ نفس میں جو قصیدہ "عینیہ" کہا ہے اس میں اتصال جسم سے کراہت نفس کو ابتدائے خلقت میں یوں ظاہر کیا ہے ؎

وصلت علیٰ کرہ الیک وربما کرھت فراقک فھی ذات توجع

ترجمہ یعنی نفس بکراہت تجھ سے ملا اور بعد اتصال وقت موت تیرا فراق بھی ناگوار ہوتا ہے اس لئے اس فراق سے نفس دردناک ہوتا ہے مجرد نفس کو مرکب جسم عنصری سے اتصال پیشتر ضرور ناگوار ہوگا۔ اِس مسئلہ کو علّامہ طباطبائی نے زمان کر لفظ "کھینچکر" کیا اچھا صرف کیا ہے جو "کراہت" کے مفہوم کی توضیح کر رہا ہے "رسوائی" چونکہ کثرت ہی میں ہوسکتی ہے اِس لئے اُسکا استعارہ "بازار" کے ساتھ بہت خوب ہے مطلع میں کس قدر بلند پروازی اور مضامین آفرینی ہے ناگواری اتصال نفس و جسم کو اسی قصیدہ کے ایک شعر میں خود علّامہ طباطبائی بھی فرماتے ہیں ؎

ہمیں اُس آستان سے دُور ہونا کب گوارا تھا سُنا ہوگا کہ روح آتے ہوئے قالب میں تھرّائی

دُوسرا مطلع ؎

ہے ابر یا دیو سیہ سرشار و مست و خشمگین
خندہ رُخ و گریان مژہ روشن دل و تیرہ جبین

اِس مطلع مین اَبر کے مشبہ بہ اِس سے بہتر نہین ہو سکتے کیونکہ اس مشبہ اور مشبہ بہ مین مشابہت تامہ ہے جسین ادنیٰ مُلابست سے بھی کام نہین لیا گیا ہے ! جسامت و تیرگی کی وجہ سے دیو سیاہ، ریزش آب کی وجہ سے سرشار، خفیف الحرکاتی کی وجہ سے مست، صدائے رعد کی وجہ سے خشمگین، برق و بارش کی وجہ سے خندان رُخ اور گریان مژہ اور پھر تغیرات کا اعتبار کرتے ہوئے برق کی وجہ سے روشن دل اور تیرگی و سیاہی کی وجہ سے تیرہ جبین کہنا کیا اچھے اور مناسب تعبیرات ہین۔

دوسری چیز قصیدہ مین "تخلیص" یا "گریز" ہے تشبیب سے مدح کی طرف اس طرح رجوع ہو جانا چاہئے کہ معلوم ہو ذکر ممدوح بلا قصد و ارادہ آگیا ہے اور بات سے بات پیدا ہو گئی ہے اور چول پر چول بیٹھ گئی ہے۔

علامہ طباطبائی کی گریزین نہایت مربوط اور بے ساختگی و برجستگی کی بہترین مثالین ہین، پہلے قصیدہ کی تشبیب مین فانی زندگانی کی مذمت کرتے ہوئے ذیل کا شعر گریز کا لکھتے ہین:۔ ؎

"حیاتِ جاودان" افسوس ہو مجھکو نہ ہاتھ آئی
یہ حسرت تھی نثارِ مقدمِ خیر البشر کرتا

"حیاتِ جاودان" کے لفظ سے ربط کس حُسن سے پیدا کیا گیا ہے۔

دوسرے قصیدہ کی تشبیب ابر و باران و برق سے کرتے ہوئے یہ شعر گریز کا لاتے ہین ؎

برقِ جہندہ شعلہ زا اور ابر بالائے ہوا
وہ ہے بُراقِ مصطفےٰ یہ شہپرِ روح الامین

یہ گریز پہلی گریز سے خوب تر اور مربوط تر ہے۔

تیسری چیز مقطع ہے جسمین خاتمہ عمدگی کے ساتھ مدنظر ہوتا ہے اور اسمین ممدوح کے لئے "دعائے تابیدی" کرتے ہین۔ علامہ طباطبائی اس مین طرز قدیم کے پابند نہین قصیدہ کو جس طرح چاہتے ہین ختم کر دیتے ہین مگر خاتمہ کی مناسبت ہاتھ سے نہین جانے پاتی۔

قُدما کے طرز میں غالباً سب سے پہلے انوری نے تبدیلی پیدا کی اور مضمون آفرینی کی داغ بیل ڈالی ظہیر فاریابی نے دقت آفرینی اور مضمون بندی کا آغاز کیا۔ خیال کی دقت آفرینی میں متوسطین و متاخرین ظہیر ہی کے پیرو ہیں اِس خصوص میں علامہ طباطبائی کے اشعار بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ اربابِ نظر دیکھیں گے کہ دماغ سوزی اور جگر کاوی کے کیسے کیسے انمول جواہر چمک رہے ہیں۔

قاآنی کا ایک قصیدہ جناب امام علی بن موسی الرضاؑ کی مدح میں بہت مشہور ہے جس میں ابر سے تشبیب کی گئی ہے چند شعر ملاحظہ فرما کر قندِ مکرر کا مزہ اٹھائیے۔ ؎

بگردون تیرہ ابری بامدادان برشد از دریا ۔۔۔ جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز و گوہر زا

چو چشم اہرمن خیرہ چو روی زنگیان تیرہ ۔۔۔ شدہ گیتی ہمہ تیرہ بمغزش علّتِ سودا

شبگون رخ چون شب عاشق گرفتہ چون دلِ عاشق ۔۔۔ باشکِ دیدۂ وامق برنگِ طرّۂ عذرا

تنش با قیر آلودہ دلش از شیر آمودہ ۔۔۔ برون پر سرمۂ سودہ درون پر لؤلؤ لالا

بدل گلشن بتن زندان گہی گریان گہی خندان ۔۔۔ چو در بزمِ طرب رندان ز شورِ نشئۂ صہبا

چو دیوی برہوا رفتہ چو دلہای مست و آشفتہ ۔۔۔ زدہ بس دُرِّ ناسفتہ ز مستی خیرہ بر خارا

علامہ طباطبائی نے بھی قصیدۂ معراجیہ کی تشبیب ابر ہی سے کی ہے جو تشبیہات ابر کے صرف کیئے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔ اور قاآنی کی تشبیہات سے دو ہرے معنے میں جو سعی کی گئی ہے وہ اُدطلب ہے چند اشعار ابر کی تشبیہ کے جو علامہ طباطبائی کے فکرِ رسا کے نتائج ہیں ذیل میں لکھے جاتے ہیں:۔ ؎

ہے ابر یا دیوِ سیہ سرشار و مست و خشمگین ۔۔۔ خندان رخ و گریان نظر روشن دل و تیرہ جبین

آتا ہے وہ قطرہ کئے، پانی سمندر سے پیئے ۔۔۔ گر کر اِدھر بکھرا دیئے گلہائے ورد و یاسمین

"قطرہ زدن" فارسی محاورہ ہے جسکے معنی "بشتاب رفتن" کے ہیں۔ بلحاظ تقاطر امطار ابر کے ساتھ کیا خوب صرف کیا ہے اور "بکھرا دیئے" سے اقسام گل کی کثرتِ پیدگی کو کس لطیف پیرایہ میں ظاہر فرمایا ہے۔ ؎

گریہ کناں گوہر فشاں، قطرہ تاں، دامن کشاں ۔۔۔ مانند زلف مہوشاں، تاریک و تار و عنبریں

ایسی بحروں میں اکثر شعرا ہر شعر میں تین قافیے غیر قافیہ اصلی قصیدہ یا غزل کے اختیار کیا کرتے ہیں۔ اس طرح یہ بحر زیادہ خوش آیند ہو جاتی ہے چنانچہ قاآنی نے بھی اپنا قصیدہ "مسمط" کہا ہے، مطلع کے دونوں مصرعوں میں چونکہ اصل قافیہ ہوتا ہے اس لئے مطلع میں تین قافیے غیر نہیں لائے جاسکتے ہیں۔ مگر قاآنی کے شعر ثانی سے اس صنعت کا التزام پایا جاتا ہے چنانچہ دوسرے شعر میں خیرہ، تیرہ، چیرہ، تین قافیے غیر قافیہ قصائد ہیں، اور "سوا" قصیدہ کا اصلی قافیہ ہے۔ مولانا نے بھی تسمیط کا لحاظ اور التزام کیا ہے، دوسرے شعر میں کئے، پئے، دئے، قوافی غیر ہیں اور "یاسمین" اصلی قافیہ ہے، تیسرے شعر میں فشاں کشاں مہوشاں تین قافیے ہیں۔ شعرا ان قوافی میں بھی ایطا کا لحاظ کرتے ہیں۔ اس تیسرے شعر کے قافیے گوہر فشاں دامن کشاں میں فشاں اور کشاں اسم حالیہ فشاندن اور کشیدن سے معلوم ہوتے ہیں اس خیال سے ان میں ایطا کی تجویز کر سکتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے بلکہ دامن کشاں ایک مرکب اسم ہے جسکے معنی متفاخر و نازاں کے ہے اس لئے ان میں ایطا کی تجویز مغالطہ سے خالی نہیں جیسا کہ مولوی جامی تحفۃ الاحرار میں فرماتے ہیں۔ ؎

مہر نہ خاتمۂ این کتاب ۔۔۔ شد رقم خاتم کم الکتاب

دل میں طرب لب پہ فغاں سر پر کف کف بر دہاں ۔۔۔ انداز میں بہلی رماں آواز میں شیر عریں

کیسے واقعی اور مناسب الفاظ میں ابر کی حالت کو دکھلایا گیا ہے پہلے مصرع کا مضمون بالکل نیا اور مولانا کی استادانہ اچھوتی فکر کا پیدا کیا ہوا ہے، قاآنی کی قوت فکر اس مضمون سے محروم رہی ؎

دیوانۂ شوریدہ سر، دیوسیہ مست الحذر ۔۔۔ پرچھائیں جس کی دیکھکر چھپتا پھرا مہر مبین

"الحذر" کے ساتھ "چھپتا پھرا" کس قدر موزوں و مناسب الفاظ ہیں جو مولانا کی کہنہ مشقی کو منواتے ہیں۔ پھر مہر کا ابر میں چھپ جانا کیسی بہترین اور واقعی تخئیل ہے جسمیں محاکات بھی شامل ہو اسپر

چھپنے کی مہر کی صفت میں حسن بالائے حسن ہے۔

انوری نے سب سے پہلے اس زمین میں قصیدہ کہا:-

جرم خورشید چو از حوت در آید بحمل　　　اشہب روز کند ادہم شب را ارجل

بہار کے زمانہ سے دن بڑھنے لگتا ہے اور رات چھوٹی، جب آفتاب برج حمل کے انیسویں درجے پر آتا ہے تو دن کے بڑھنے کی ابتدا ہو جاتی ہے، شاعر مبالغہ آمیز شاعری میں اس خیال کو یوں ظاہر کرتا ہے کہ جب آفتاب حوت کے برج دوازدہم سے حمل کے پہلے برج میں آتا ہے تو دن کا نقرہ گھوڑا رات کے مشکی گھوڑے کو ارجل بنا دیتا ہے" اشہب" "سرخنگ" گھوڑے کو کہتے ہیں۔ اور "ارجل" وہ گھوڑا ہے جسکی ایک ٹانگ بھی سفید ہو۔ گو شعر کے الفاظ یہ کہہ رہے ہیں کہ دن بیحد بڑھ جاتا ہے اور رات انتہائی درجہ پر گھٹ جاتی ہے مگر شاعر کو صرف دن کا رات سے بڑھ جانا دکھلانا ہے۔ منیر لاہوری نے انوری کے اس مطلع پر یہ اعتراض کیا کہ:-

"جب تک دن اور رات ہوتے رہیں گے اُس وقت تک انوری کا مفہوم تو وقوع پذیر نہیں ہو سکتا شب و روز کی درازی و کوتاہی کی نسبت بعض مقامات میں ہوتی ہی ہے، نہ معلوم تخئیل شاعری میں واقعیت و حقیقت کی تلاش ہی منیر کی زندہ دلی نے کیوں کی۔ شاعری میں مبالغہ حسن میں داخل ہے۔ ابو الفرج رونی ممدوح کی تیغ کی تعریف یوں کرتے ہیں ؎

خیال تیغ وے اندر میان پشت پدر　　　عدوے دولت و دین را میان کند بدو نیم

کیا یہ مبالغہ اپنے آخری زینہ پر کھڑا ہوا قہقہہ نہیں لگا رہا ہے یہ کب ممکن ہے کہ صرف تیغ کا خیال صلب پدر میں دشمن کے دو ٹکڑے کر دے مگر یہ سب کچھ مبالغہ ہے اور شاعری کے محبوب محاسن۔

اس قصیدہ کے جواب میں عرفی کا بھی قصیدہ مشہور ہے عرفی نے بھی آفتاب کے برج حمل میں آنے سے دن کا بڑھنا اور رات کا گھٹنا اپنے مطلع میں کہا ہے ؎ عرفی

چہرہ پرداز جہان رخت کشد چون بہ حمل | شب شود "نیم رخ" و روز شود مستقبل

یعنی جب آفتاب برج حمل مین آتا ہے تو دن بڑھجاتا ہے اور رات گھٹ جاتی ہے "نیم رخ" "ایک رخسار" اور "ایک آنکھ والی تصویر" کو کہتے ہین عرفی کے شعر سے بھی دن کا رات سے دوچند ہونا پایا جاتا ہے۔

اُردو مین پہلے مرزا سودا نے اور سودا کے تتبع مین محسن کاکوروی نے نعتیہ قصیدہ کہا اور باران و بادل سے تشبیب کی۔ مولانا بھی اس معرکۃ الآرا زمین مین سب کے برابر چل رہے ہین۔ مولانا کا مطلع ہے ؎

اودی اودی یہ گھٹائین ہین کہ لیل الیل | بن گئی یا شب دیجور سمٹ کر بادل

اگرچہ عربی مین شب تاریک کو "لیل الیل" اور روز روشن کو "یوم الیوم" کہتے ہین مگر اُردو زبان اس قسم کے الفاظ کی متحمل نہین، شاید قصیدہ کے لئے یہ اجتہاد جائز رکھا گیا ہو۔

مولانا کے مقطع سے معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے عربی جریر و اخطل کے بھی قصائد اس زمین مین ہین۔ چنانچہ فرماتے ہین کہ ؎

داد دیتے تجھے اے نظم جو ہوتے اس وقت | عرفی و محسن و سودا و جریر و اخطل

جو لوگ کہ تراجم کا کام کرتے ہین وہ ترجمہ کی دشواریون سے واقف ہونگے، یہ بڑا مشکل فن ہے جس سے خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہونا ہر شخص کی قوت سے باہر ہے، ترجمہ مین اُس زبان کا "فورس" باقی رکھنا دشوار ہی نہین بلکہ محال ہے، اس اکھاڑے مین وہی اُتر سکتا ہے جو دونون زبانون کے داؤ پیچ سے واقف اور کامل قدرت رکھتا ہو۔ مولانا کے ترجمے اصل زبانون کا "فورس" قائم رکھتے ہین جو ترجمہ کی اصل خوبی ہے" مولانا کا سب سے پہلے ترجمہ "گریز ایلجی" (گرے کے مرثیے) چھپا تھا، اسکو مولانا نے "گور غریبان" کے قالب مین ڈھالا۔ جسکا پہلا اسٹینزہ یہ ہے:۔

وداع روز روشن ہے گجر شام غریبان کا | چراگاہون سے پلٹے قافلے وہ بے زبانون کے

قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقان کا | یہ ویرانہ ہے مین ہون اور طائر آشیانون کے

انگریزی نظم کو اُردو کے مقابلہ مین جب دیکھا جائے تو ترجمہ کا کمال معلوم ہوسکتا ہے۔

"ذخیرہ" مین اسی طرح اس نظم کو شائع کیا گیا ہے تاکہ ایک وقت مین مشرق و مغرب کی قوت دماغی کا اندازہ ہوسکے۔ انگریزی مین نظم کی ایک صورت مربع بھی ہے جسمین پہلے مصرع کا ہم قافیہ تیسرا مصرع اور دوسرے کا چوتھا ہوتا ہے۔ گرے کی یہ نظم اسی صنف کی تھی، مولانا نے ترجمہ مین بھی اس کا لحاظ رکھا جیسا کہ پہلے بند کے پہلے مصرع کا قافیہ "غریبان" اور اسکا قافیہ تیسرے مصرع مین "دہقان" اور دوسرے مصرع کا قافیہ "بیزبانون" اور اسکا قافیہ چوتھے مصرع مین "آشیانون" مین لائے ہین۔

ہندوستان مین اُردو کی دنیائے شاعری مین انگریزی طرز پر نظم کرنے کا راستہ سب سے پہلے مولانا ہی نے دکھایا، ساقی نامہ کو رباعی کے وزن مین انہین نے پہلے پہل کہا ہے۔ فرماتے ہین:-

رکھتی ہے خرد کو دُور از کار شراب
اور اسے کردیتی ہے بیزار شراب

ہے دشمن عقل و ہوش میخوار شراب
او دوست اسے نہ مُنہ لگانا ہرگز

انگریزی مین ایک قسم کی نظم یہ بھی ہے کہ تین مصرع ہموزن اور ہم قافیہ ہوتے ہین اور چوتھا مصرع چھوٹا اور اسکا قافیہ الگ اور ہر بند کے اس چھوٹے مصرعہ مین پہلے چھوٹے مصرع کا قافیہ، چنانچہ اس قسم کے ترجمون کے دو اسٹینزے ملاحظہ فرمائیے:-

جسوقت حوادث کا ہو طوفان تمدید
اے خالق بحر و بر خداوند مجید

رکھنا اس ملک سے ہر آفت کو بعید
دکھلا دینا تو اپنی قدرت

یہ اپنی دُعائین پہونچین گی تا بہ فلک
اور اوج سے ذرہ عرش تلک

اور عرش سے تا ادارس حق تلک
درکار ہے بس اسی کی رحمت

اسکو مولانا "مثلث مستزاد" کے نام سے ہندوستان مین پیش فرماتے ہین، عادت کے خلاف نظم کرنا کوئی آسان کام نہین ہے۔ یہ مولانا کا کمال ہے کہ مغربی میدان مین بھی اپنا مشرقی گھوڑا

دوڑاتے چلے جاتے ہین اور اس اُستادی کے ساتھ ایڑ لگاتے ہین کہ مغرب حیران ہے اور مشرق مسرور! اس مجموعہ کا ہر شعر ریویو کے لئے پکارتا ہے مگر ع

"دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے"

(مطبوعۂ نگار)

فارسی مین یائے معروف و مجہول

یائے معروف وہ ہے جسکے ماقبل کا کسرہ اشباع کے ساتھ یعنی کھینچکر پڑھا جائے، جیسے تیر، نخچیر، خوشی، کشتی وغیرہ، اور مجہول وہ ہے جسکے ماقبل کا کسرہ کھینچکر نہ پڑھا جائے، جیسے دیر، سیر، ہے، کاشکے، وغیرہ۔ (ی) معروف ہو یا مجہول کسی لفظ مین اصلی ہوگی یا زاید، اصلی جیسے تیر اور نخچیر دیر و سیر مین، اور زائد وہ ہے جو کسی فائدہ کی غرض سے لفظ کے آخر مین بڑھائی گئی ہو، جسکا بیان آگے آیگا۔

اصلی (ی) کسی لفظ مین ہر جگہ آتی ہے جیسے دیدار، خریدار، زنجیر، پیر، نشیب، شکیب وغیرہ مین یا آخر مین ہوگی، جیسے آشتی، گیتی، آرے، بلے وغیرہ مین، اور اول مین جب آتی ہے تو متحرک ہی ہوتی ہے ساکن نہین ہوتی، کیونکہ ابتدا بہ سکون محال ہے، اور بحالت حرکت مجہول یا معروف کے ساتھ اسکی تعبیر نہین کی جاتی ہے —

اب معلوم کرنا چاہیے کہ جو اصلی (ی) کسی لفظ کے درمیان حرف (دی) سے پہلے آتی ہے تو اسمین معروف و مجہول کی رعایت مستحسن ہے یعنی یائے معروف کا قافیہ یائے مجہول کے ساتھ نہ کرنا بہتر ہے، حضرت جامی ایسے قافیون کو غلط سمجھتے ہین، چنانچہ اپنے رسالہ قافیہ مین حرف "ردف" کی بحث مین حکیم سنائی کے اس شعر پر دیرا اور پذیرہ کے اجتماع کے متعلق اعتراض کیا ہے ؎

با وجودش ازل پذیر آمد　　　　نیک آمد ولیک دیر آمد

لیکن زمانۂ حال کے اہل زبان اس قسم کے قوافی بے تکلف استعمال کرتے ہین اور جائز سمجھتے ہین، انکے

نزدیک گویا یائے مجہول کا وجود ہی نہین ہے، ان کا تتبع کر کے اُردو قدیم شعرا نے بھی اس قسم کے قافیے کئے ہین ۔ سودا

جب آگے سے اُٹھ جائے قالین کے شیر — ہُوا دیکھ حیران صغیر و کبیر

لیکن اب اُردو مین اس قسم کے قافیے نہین کرتے، انکو قطعاً غلط سمجھتے ہین، اور متاخرین اہلِ فارس مین بھی جو محقق ہین وہ ایسے قافیون سے احتراز واجب سمجھتے ہین، چنانچہ محمد تقی سپہر مؤلف ناسخ التواریخ کتاب "براہین العجم" مین لکھتے ہین :-

"شعرائے متقدم جمیعاً رعایت نمودند، و مجہول یا معروف نیاوردند"

پھر ایک جگہ اسی کتاب مین لکھتے ہین :-

"متقدمین مجہول و معروف را باہم قافیہ نداوند، ہیچ کس را درین اختلافے نبود"

اصلی (ی) اگر کسی لفظ کے آخر مین آتی ہے، اُس وقت بھی معروف و مجہول کی رعایت ضروری ہے مثلاً لفظ علی کا قافیہ بلے نہین کر سکتے۔ چنانچہ محقق طوسی علیہ الرحمہ نے "معیار الاشعار" مین عیوبِ قافیہ فارسی کے بیان مین حرفِ ردی کے اختلاف کے ذکر مین لکھا ہے کہ مرے بیائے مجہول کا قافیہ لفظ علی کے ساتھ نہ کیا جائے (مرے بیائے مجہول کے معنی رز کامل عیار مین کوشیدن و برابری کردن لکھے ہین) اور محمد تقی سپہر نے بھی فرمایا ہے بلکہ اُنھون نے تو "براہین العجم" مین یائے معروف و مجہول کے الفاظ کی ایک فہرست بھی لکھدی ہے۔

زاید (ی) دو قسم کی ہے، معروف و مجہول، قسم اوّل کے متعلق کتب قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ دو قسم کی (ی) اہلِ زبان کے نزدیک معروف ہے، اوّل یائے نسبت جیسے ہندی، رومی، مکی، مدنی، ہاشمی، قریشی وغیرہ ؎

اے مدنی برقع و مکی نقاب — پردہ نشین چند بود آفتاب

دیگر، شاہِ قرشی و ہاشمی خیل زلفین تو ہر دو لام و اللیل

(۲) یائے ضمیر مخاطب واحد جو فعل کے آخر مین آتی ہے جیسے گُنی، گوئی، وغیرہ۔

(۳) یائے خطاب جو اسم کے آخر مین بمعنی ہستی آتی ہے جیسے مردی بہ معنی مرد ہستی اور سَری بمعنی سرد ہستی

؎ یاد ہا خودن و ہشیار نشستن سہل است گر بدولت برسی مست نگردی مردی

دیگر، ماہی از ماہِ فلک را چون کمان ابرو بود سروی از سروِ سہی را عنبرین گیسو بود

(۴) یائے مصدری جو کسی اسم جامد یا اسم مشتق یا صفت کے آخر مین آنے سے مصدری معنی پیدا ہوتے ہین جیسے ؎

قلت کمی، راحت خوشی، شری بدی ملکت شہی سوی سری، جدت نوی، کلفت پری، ربت گمان

دیگر

گوشہ گیری عزیزان ہمہ از بے برگی است مرغ ہم میل پریدن نکند تا پر نیست

(۵) یائے لیاقت جو مصدر فارسی کے آخر مین آنے سے لیاقت و قابلیت کے معنی پیدا کرتی ہے جیسے کشتنی، سوختنی وغیرہ۔ ؎

شمع گر با تو کند دعوی نازک بدنی کُشتنی، سوختنی، باشد و گردن زدنی

(۶) یائے مبالغہ جیسے علّامی، فہّامی، یعنی بڑا عالم اور بڑا فہیم، یہ عربی اسمائے صفات مبالغہ کے آخر مین آتی ہے، اسی طرح یائے متکلم جیسے مشفقی، محبی وغیرہ۔

زاید (ی) کی دوسری قسم یعنی مجہول کے متعلق کتب قواعد سے نو قسمین پائی جاتی ہین۔

(۱) یائے وحدت بمعنی یک، اسمین یائے تخصیص، تنکیر، تعظیم و تحقیر یہ چارون قسمین داخل ہین، جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔ ؎

شہر خالی است ز عشاق مگر کز طرفے مردے از غیب برون آید و کارے بکند

مردے یعنی ایک مرد یا کوئی مرد۔

پری رخے بشکر خندہ قتل مردم کرد — چو گفتمش کہ مرا ہم بکش تبسّم کرد

پری رخے یعنی ایک خاص پری رخ جسکو شاعر جانتا ہے

یار دارد سر صید دلِ حافظ یاران — شاہبازے بشکارِ مگسے می آید

شاہبازے یعنی ایک بڑا باز عظمت شاہباز مگسے یعنی ایک حقیر و ناچیز مگس۔

(۲) یائے موصولہ اسکے بعد کاف صلہ بھی آتا ہے اسکو یائے صفت بھی کہتے ہیں، اسکے معنی "جو جس نے" "یا" "ایسا" ہوتے ہیں

پادشاہے کہ طرح ظلم افگند — پائے دیوار ملک خویش بکند

پادشاہے یعنی جس پادشاہ نے

گدائے کہ بر شیر نر زین نہد — ابوزید را اسپ و خر زین نہد

گدائے یعنی ایسا فقیر۔

(۳) یائے استمراری جو ماضی مطلق کے آخر میں آکر معنی استمراری پیدا کرتی ہے۔

نخوردے کہ خاطر بیاسایدش — ندادے کہ فردا بکار آیدش

نخوردے و ندادے یعنی نمی خورد و نمی داد۔

(۴) یائے تمنا یہ بھی ماضی مطلق کے آخر میں آتی ہے اور امید و آرزو کے معنی پیدا کرتی ہے

چہ بودے کہ پایم درین کار گل — بگنجے فرو رفتے از کام دل

بگنجے، فرو رفتے یعنی میری آرزو یہ تھی کہ خزانہ پر میرا پاؤں پڑتا، دیگر

مرا اے کاشکے مادر نزادے — وگر زادے مرا شیرے ندادے

شیرے ندادے یعنی اے کاش شیر نمی داد۔

(۵) یائے اضافت یعنی جس اسم کے آخر مین الف یا واؤ ہو، جب اُسکو کسی اسم کی طرف مضاف کرتے ہیں تو کسرۂ اضافت کے بدلے (ی) لاتے ہین، جیسے عصاے موسیٰ اور بوے گل ؎

تا تماشاے دہانت کرد حیران غنچہ را | شاخ گل دستے ست زیر زنخدان غنچہ را

دیگر، روے تو ہر کہ دید بمصحف شبیہ گفت | ہر کس شنید ذالک لاریب فیہ گفت

(۶) یائے مقدار جسکے اسم کے آخر مین آنے سے مقدار کے معنے پیدا ہوتے ہین۔

اگر گنجے کنی بر عامیان بخش | رسد مر ہر گدائے را برنجے

یعنی بمقدار برنج۔

(۷) یائے تعجب کسی اسم کے آخر مین آنے سے معنی تعجب پیدا ہوتے ہین ؎

چشم بد دور عالمے داریم | من و مجنون و دامن صحرا

عالمے یعنی عجب عالم۔

(۸) یائے استغراق بمعنی ہیچ، یعنی کسی اسم کے آخر مین آنے سے کسی چیز کی نفی مین مبالغہ اور استغراق ہوتا ہے ؎

مسلمانان مسلمانش نخوانید | قتیل کافرا ایمان ندارد

یعنی ہیچ ایمان ندارد۔

(۹) یائے زاید یعنی محض تحسین کلام کے لئے آخر مین زیادہ ہوتی ہے ؎

جاے حضور گلشن امن است این سرا | زین در بشادمانی و عیش و طرب درآے

یائے زاید معروف بھی ہوتی ہے جیسے، نظامی۔ع فروشندہ را بافضولے چہ کار؛ ظہوری ع "ز انتظارے نہ گشتہ تکیہ گہش" اور مجہول بھی ہوتی ہے جیسے جامی

الٰہی غنچۂ امید بکشاے | گلے از روضۂ جاوید بنماے

اصلی خواہ مجہول ہو یا معروف کسی لفظ مین ہر جگہ آتی ہے مگر زاید سوائے آخر لفظ کے اور کہین نہین آتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان اقسام کے معلوم کرنے کے بعد یہ بات جاننے کے قابل ہے کہ متاخرین اہل فارس کے نزدیک معدودے چند کے سوا یائے معروف و مجہول میں کوئی فرق نہیں ہے وہ یائے ابجد کی پہلی قسم کی تمام یاؤں کو دوسری قسم کی تمام یاؤں کے ساتھ بے تکلف قافیہ میں جمع کر دیتے ہیں اور متقدمین میں بھی خواجہ نصیرالدین طوسی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے زمانہ میں بھی دو گروہ تھے ایک گروہ تو معروف و مجہول کے فرق کو تسلیم کرتا تھا، جسمیں خود خواجہ موصوف بھی داخل ہیں، چنانچہ "معیار الاشعار" میں قافیہ کی بحث میں وہ یائے مجہول کو ای، ہی نہیں کہتے بلکہ شبیہ بیا کہتے ہیں، اور دوسرا گروہ وہ تھا جو یائے معروف و مجہول کے فرق کو تسلیم نہیں کرتا تھا، چنانچہ خواجہ موصوف کتاب کے آخر میں "مجری" کی بحث میں اس گروہ کی طرف اشارہ کر کے اس طرح فرماتے ہیں۔

"اختلاف مجری در قج آن پوشیدہ نماند کہ اختلاف وصل باشد و حرف بتقارب چنانچہ بسری در خطاب و خبرے در نکرہ پس کسرہ را مختلف است و شاید کہ بر بعض مردم ملتبس گردد"

اسمیں محقق علیہ الرحمہ نے بسری کی یائے خطاب کو اور خبرے کی یائے نکرہ کو علیحدہ اور حرف قریب المخرج شمار کیا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انکے زمانہ میں بعض ایسے لوگ بھی تھے جنکی نظر میں یائے معروف و مجہول ایک چیز تھی، جبھی تو محقق نے فرمایا ہے کہ:-

"شاید بر بعض مردم ملتبس گردد"

اب سکا نتیجہ یہ نکلا کہ یائے معروف و مجہول کا اجتماع قدما کے زمانہ میں کمتر اور اس زمانہ میں بیشتر بلکہ تمام تر جائز ہے لیکن ہم ہندی چونکہ قدما کے کلام کے پیرو ہیں اس لئے حتی المقدور اس قسم کے اجتماع سے پرہیز کرنا ہمارے لئے مستحسن بلکہ لازم ہے اور متاخرین اہل فارس میں محمد تقی سپہر نے بھی "براہین العجم" میں یہی ہدایت کی ہے، ایک فاضل اہل زبان کے قول کے مقابل عوام کی پیروی خلاف احتیاط ہے، لیکن غلط العام صحیح کہنے والوں سے تعرض بھی نہیں کیا جاسکتا، ایک بات یاد آگئی اسکو بھی لکھے دیتا ہوں، عربی میں یائے مجہول ہوتی ہی نہیں ہے، سوائے اماله کے جیسے حساب سے حسیب۔

سے مرخص ہونے کے بعد ڈیڑھ سال مسلسل سیر و سفر مین گذرا، جب سے دربار رامپور سے تعلق ہوا ہے پھر مین نے اپنے خوابیدہ مشغلون کو بیدار کرنا شروع کیا چنانچہ آج کل "ذخیرہ" کی فائل میرے زیر مطالعہ ہے۔ چونکہ مضامین نثر کا انتخاب میرا مطمح نظر ہے اس لئے ہر مضمون کامل غور اور پوری توجہ کے ساتھ تنقیدی نظر ڈال کر پڑھتا ہون اسی سلسلہ مین حضرتِ ماجد کا مضمون بھی (حالی کا رنگ تغزل) مطالعہ کرنے لگا۔ ابتدائی خیالات عود کر آئے۔ صرف ایک بات نے طبیعت کو ابھارا ورنہ انکی کسی رائے سے اختلاف کرنا یا انکے کسی مضمون مین اپنی ناقص رائے پیش کرنا مین اپنی سمجھ سے باہر سمجھتا ہون مجھکو جو خلوص حضرتِ ماجد سے ہے انکی تحریرون کا مین جس قدر شیدا ہون، انکی اجتہاد فکری، اُن کی قوتِ بیان، انکی فلسفیانہ نکتہ سنجیون پر مین آج سے نہین مدت سے ایمان لا چکا ہون، انکی تحریرون کی ایک ایک سطر کو ہمیشہ بنظر تعمق پڑھا کرتا ہون اور لطف اندوز ہونے کے ساتھ مستفید بھی ہوتا ہون، یعنی انکی ہمہ گیر خوبیان گناتے جھجکتا ہون اس لئے کہ انکو نظر بد سے بچاتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا ایسی وسیع الدماغ ہستی کو بصحت و عافیت رکھے تا کہ انکے برقِ کمالات سے علمی دنیا روشن و منور رہے۔ ملک کے مایۂ ناز انشاپرداز مرحوم حضرت مہدی نے مولانا ماجد کے متعلق مجھکو ایک خط مین اپنے مخصوص انداز بیان مین یون گوہر افشانی کی تھی کہ:۔

"اندھیرے گھر کا چراغ ہے (مولانا ماجد) یعنی ملک مین خالص عقلیات کا رواج نہین، ایسے ایسے تاریک خیال موجود ہین کہ رات تو خیر اُن کو دن مین بھی نہین سوجھتا"

ذیل مین جو کچھ مین عرض کرونگا وہ ایک ادبی خدمت ہے، جس سے اُمید ہے مولانا ماجد بھی اتفاق کرینگے۔ حالی کے متعلق جو ایک عامۃ الورود غلط فہمی ہے کہ وہ صرف قومی مضامین ہی لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ رنگ تغزل سے انکو بہرہ نہ تھا اُن کا کلام سرے سے اس سے خالی تھا حضرتِ ماجد اس رائے کے خلاف مسلک اختیار کرتے ہین اور حالی کی عاشقانہ غزلین اپنی رائے کی تائید مین پیش کرتے ہین

ان چُھٹے ہوئے اشعار میں سے اِس شعر کے متعلق ؎

ہم نے ہر ادنے کو اعلےٰ کر دیا　　خاکساری اپنی کام آئی بہت

حضرت ماجد فرماتے ہیں کہ "حالی نے جس جدّتِ تخیل کا ثبوت دیا ہے کیا اِسکی کوئی نظیر ہمارے لٹریچر میں پیش کی جاسکتی ہے" مجھے بھی خاکساری کا ایک مضمون یاد آگیا اِس تخیل کو بھی دیکھئے ؎

رائیگاں ہرگز نہ جائیگا خاکساری کا غبار　　کچھ زمیں لیجائیگی کچھ آسمان لیجائیگا

حالی مرحوم کے اِس شعر کی نسبت ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب　　بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

حضرتِ ماجد کی یہ رائے ہے کہ "یہ شعر اِس پایہ کا ہے کہ غالب کے کلام سے اسے علیحدہ رکھنا دشوار ہے" بلکہ میں تو اب تک اِس شعر کو غالب مرحوم ہی کا نتیجۂ فکر سمجھ رہا تھا۔ اِن اشعار کے اچھا ہونے میں کیا کلام ہوسکتا ہے

مولانا ماجد کی رائے ہے کہ "حالی کی شاعری بلحاظ حُسنِ بندش وندرت تراکیب مومن سے پست ہے"۔ اِس پر مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اِسمیں شک نہیں کہ حالی ندرتِ تراکیب میں مومن کی طرح تسامح نہیں کرتے تھے اور یہی مومن کے مقابلہ میں اُنکے کلام کی خوبی ہے۔ اِسے پستی سے تعبیر کرنا میری ناقص رائے میں حالی کے شاعرانہ کمالات پر دھبّہ لگانا ہے۔ حالی کی فارسی مومن کی فارسی سے بہت بلند تھی، مومن کی طرح حالی یہ شعر کبھی نہ کہہ سکتے تھے ؎

فراقِ غیر میں ہے "بیقراری یاب" اپنا سا　　بنایا تو نے اُسکو بھی دلِ بیتاب اپنا سا

اِس پہلے مصرع میں "بیقراری یاب" غریب ترکیب ہے، اور خلاف محاورۂ فارسی جسکے لئے فارسی کلام سے سند کی ضرورت ہے "در فراقِ غیر بیقراری یافتہ شدہ است" فارسی ہی نہیں۔

مومن کی ندرتِ تراکیب پر بہت لوگ مٹے ہوئے ہیں۔ ذیل میں اور دو ایک مثالیں دیکھئے ؎

"شوخی آلا" کلام بھول گئے　　　"مطلب آما" ہو شور مستانہ

کیا "شوخی آلا" "مطلب آما" ایسی ترکیبین ہین جسکے واسطے سند کی ضرورت ہے؟ اگر فارسی کلام مین بھی یا اُسکے مثل تراکیب مل بھی جائین تب بھی یہ امر قابل غور ہوگا کہ اُردو زبان ان تراکیب کی کہان تک متحمل ہے۔ ایک قصیدہ کا اُنکے شعر ہے

قبائے گل کو گر اطلس سے دیجئے تشبیہ　　　سیاہ پوش حجل ہو "درون ماتم" سوس

گو قصیدہ مضامین آفرینی، بلند پروازی، شوکت الفاظ، اور جدت تراکیب کے لئے خاص ہے۔ مگر اُسی حد تک کہ فصاحت ہاتھ سے نہ جائے مگر اس مین "درونِ ماتم" کی ترکیب غیر مانوس ہے۔ خصوصاً جبکہ یہ اُردو زبان کا شعر ہے۔

مومن کے کلام مین "لب مباز" "زلزلہ آرا" اور "عزا یار" وغیرہ ایسی ترکیبین ہین جنکے نامانوس ہونے سے حالی مرحوم بخوبی واقف تھے۔ اسم فاعل یا مفعول ترکیبی مین بول چال کا لحاظ ضروری ہے، ورنہ کلام مین غرابت پیدا ہو جاتی ہے جو خلاف فصاحت ہے۔
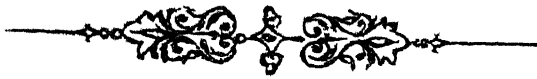
ہمارے مطالعہ کی میز

(۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۸ء تک)

ہمدم لکھنؤ | کچھ عرصہ پیشتر اسکا اعلان ہمارے پاس بغرض اندراج وصول ہوا تھا مگر اُسکے شایع کرنے کی ابھی نوبت نہ آئی تھی کہ وہ نقش نفیس جلوہ گر ہوگیا، اسکے دیکھنے سے ہمارے دل مین مرحومین ”زمیندار“ و ”ہمدرد“ کی یاد تازہ ہوگئی۔ ”ہمدم“ کی اِس عمدگی اصابت رائے اور سرگرمی کے ساتھ نکلنے کا اصلی راز یہ ہے کہ اسکی باگ ایک ایسے تجربہ کار اور مشہور اہلِ قلم کے ہاتھ مین ہے جس سے اخباری دُنیا مین پچیس[۲۵] برس سے روشناس ہے ہمکو پوری اُمید ہے کہ حضرت جالب کے زیرِ ادارت ”ہمدم“ بہت جلد ملک کے ممتاز اور مقبول اخبارون مین خاص امتیاز حاصل کرلیگا اور اپنی اعتدال پسند پالیسی کی بدولت بہت جلد ہر دلعزیز ہوجائیگا۔ ایسے زمانہ مین جبکہ کاغذ کی ناقابل برداشت گرانی نے اخباری دُنیا مین ایک ہلچل مچادی ہے کسی روزانہ اخبار کے نکالنے کے لئے بڑی ہمت اور بیحد استقلال کی ضرورت ہے مگر شیخ شاہد حسین صاحب بیرسٹرایٹ لا و تعلقدار گدیہ قابل مبارکباد ہین کہ اُنھون نے اپنے سرمایہ کو ایک ایسے کام کے لئے وقف کردیا ہے جس مین ملک و قوم کی فلاح و بہبود مقصود ہے صوبۂ اودھ مین (اسلامی شان و شوکت کے قدیم مرکز ہونے کی حیثیت سے) ایک بہترین روزانہ اخبار کی شدید ضرورت تھی اِس کمی کو ”ہمدم“ کے وجود نے پورا کردیا ہے، اخبار و رسائل اگر دنیائے ملک کی ناقدری کا ہدف ہونے سے محفوظ

لہ رسالہ ”ذخیرہ“ کی زندگی مین۔

رہ جائیں تو بسا غنیمت ہے اِس لئے کہ اکثر اصحاب اخبار کی خریداری کا ذوق تو کم و بیش رکھتے ہیں مگر اسکی سالانہ قیمتیں ادا کرنا وہ اپنی عادت کے خلاف سمجھتے ہیں حالانکہ اخبار و رسائل کی سالانہ قیمتیں اسقدر واجبی ہوتی ہیں کہ یہ مفلس ملک بھی اسکو باسانی برداشت کرسکتا ہے مگر ہم لوگوں میں ابھی اس خاص ضرورت کا احساس پورے طور سے نہیں پیدا ہوا ہے اس بارہ میں بزرگ قوم نواب عماد الملک بہادر بالقابہ کا یہ مشورہ قومی اخبارون کے لئے نہایت مفید ہے کہ "بغیر چندہ ادا کئے ہوئے کسی کو اخبار نہ بھیجا جائے - ہم مسلمانون میں اب عادت ہوگئی ہے کہ سال بھر تک تو اخبار لیتے رہینگے مگر جب چندہ طلب کیا جائیگا تو انکار کردینگے یا خاموشی اختیار کرلین گے"۔ کسی اخبار یا رسالہ کی کامیابی بروقت چندہ کی وصولیابی پر موقوف ہے - اس فکر سے اگر اخبار و رسائل مطمئن ہوسکین تو پھر عمر طبعی کو پہنچ جانا زیادہ دشوار نہین -

ہم ناظرین "ذخیرہ" سے استدعا کرتے ہین کہ وہ "ہمدم" کا دلی جوش سے خیر مقدم کرین اور کوشش کرین کہ اسکا حلقہ اشاعت روز بروز وسیع ہوتا جائے تاکہ یہ اپنے فرائض بہ اطمینان خاطر ادا کرتا رہے -

تاج الکلام اس نام کا ایک ماہوار رسالہ "مخزن" کے سائز پر ابوالعرفان احسان اللہ خان صاحب تاجور نجیب آبادی کی ایڈیٹری مین مئی ۱۹۱۶ء سے شایع ہو رہا ہے ابتدائی چند اوراق مین نثر کے مضامین اور بقیہ صفحات مختلف شعرا کی غزلون کے لئے وقف ہوتے ہین بیشتر حصہ طرحی غزلون کا ہوتا ہے ہمنے اکثر پرچون کا بغور مطالعہ کیا حصہ نثر مختصر ہوتا ہے اور اسکا طرز بیان بھی سلجھا ہوا ہے مگر غزلون میں اکثر غزلین ایڈیٹر صاحب کی اُس نظر کی مستحق ہین جسکو انتخاب کہتے ہین - نظم ہو یا نثر نظر ثانی کے بغیر اسکو شایع کردینا مذاق کو خراب کرنا ہے - ایڈیٹران اخبار و رسائل کے یہی تو فرائض ہین کہ پرچہ کو ترتیب دینے کے وقت ہر مضمون پر نظر تعمق ڈال لیا کرین اور اسکے محاسن و معائب پیش نظر رکھین تاکہ ملک مین جو چیز پیش کیجائے حتی الامکان وہ عیوب اور غلطیون سے پاک ہو اور اس معاملہ مین دوست کی مروت کرنا اخلاقی جرم ہے -

مین اپنے معزز معصرون کو اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہون کہ وہ مضامین نظم ونثر کی دیکھ بھال مین اپنا پورا وقت صرف کرین اور اسکی سختی سے پابندی رکھین تاکہ ملک کا مذاق بگڑنے نہ پائے۔

اصلاح الالفاظ کے تحت مین جو کچھ اصلاح کیجاتی ہے وہ نہایت سودمند ہے اور تاجور صاحب نے یہ ایک ایسی اچھی ابتدا کی ہے جو اہل ملک کے حق مین مفید ہوگی۔ چھپائی لکھائی اور ترتیب مضامین کے لحاظ سے پرچہ برا نہین ہے اور ہر مہینہ ۳۶ صفحے پر نجیب آباد سے شایع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ عہ/ کاغذ کی گرانی کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ ہم ناظرین "ذخیرہ" سے سفارش کرتے ہین کہ وہ اسکی اعانت مین دریغ نفرمائین

کرشن بیتی

نوشتہ خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی۔ اس کتاب مین جو بات قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان نے "سری کرشن جی" کے حالات کو لکھا ہے وہ کس حد تک مناسب ہے اگر آنکھون سے تعصب کی عینک اُتار ڈالی جاے تو تھوڑے سے غور و فکر مین صاف نظر آجائیگا کہ خواجہ صاحب نے جو کام کیا ہے وہ مناسب ہی نہین بلکہ ضروری تھا۔ جو لوگ منصف مزاج ہین اور جن کو خدا نے ذوق سلیم عطا کیا ہے وہ دوسرون کی بھلائیون کو اسی نظر سے دیکھتے ہین جس نظر سے کہ اپنی بھلائیون کو دیکھا کرتے ہین۔

یہ کام اس لحاظ سے ضروری ہے کہ بمقتضائے تمدن ہم جس ملک مین بود و باش رکھتے ہین وہان کی ہر ایک اچھی چیز کو بنظر استحسان دیکھنا ایک بہت بڑی اخلاقی اور معاشرتی فرض کا ادا کرنا ہے، نہین تو پانی مین رہکر "مگر مچھ" سے بیر کی مثل صادق آئیگی۔ مذہب ملت اور چیز ہے ذاتی اوصاف اور چیز ہین۔ اچھے اوصاف کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہین ہین۔ کیا ہم حاتم کی سخاوت اور نوشیروان کی عدالت کا نام اس سبب سے نہ لین کہ یہ دونون شخص مسلمان نہ تھے نہین! ہرگز نہین۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہر قوم کے اچھے کامون کو اچھی نظر سے دیکھین انکا ذکر نیکی سے کرین اور ان نیکیون کو خود اختیار کرین اور ہر قوم کے بزرگون اور نیکون کی تعظیم کرین۔ ہمارے پیغمبر اسلام نے قولاً و فعلاً اس بات کو ثابت کر دیا ہے، چنانچہ نوشیروان کے عدل کی تعریف ایک مختصر جملہ مین آپنے اس طرح کی ہے کہ اس سے بڑھکر ہو نہین سکتی جیسا کہ فرماتے ہین

انا و لات بزمان الملک العادل کس قدر بلیغ جملہ ہے۔ تعریف کرتے ہین اپنی اور اس سے نوشیروان کی تعریف بھی مقصود ہے۔ اسی طرح حاتم کی دختر کا قصہ ہے کہ جب وہ اسیر ہو کر آئی ہے تو حضرت نے نہایت احترام کیا اور اپنی ردائے مبارک اُسکو اُڑھا دی۔ اسی پر اکتفا نہین کیا بلکہ اُسکی خاطر سے سب کو رہا فرما دیا۔ خواجہ صاحب نے تو صرف ایک "کرشن جی" کے حالات کو قلمبند فرمایا ہے، لیکن ہمارے اسلاف نے تو اس سے بھی زیادہ کام کئے ہین۔ رامائن اور مہابھارت کے ترجمے کئے۔ فیضی نے نل دمینتی کا قصہ لکھا۔ فردوسی طوسی نے تیس سال محنت شاقہ اُٹھا کر غیر قوم کے رزم و بزم مین ساٹھ ہزار بیت کی مثنوی لکھی، جسکو اہل اسلام نے قبولیت کے ہاتھون پر اُٹھا لیا اور پسندیدگی کے زانو پر جگہ دی، المختصر یہ کہ خواجہ صاحب نے جو کچھ کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ انداز بیان نہایت دلچسپ ہے۔ جذبات کو مجسم کر دیا ہے اور تاثیرات کی تصویر کھینچنے مین پوری کامیابی ہوئی ہے۔ "کرشن بیتی" کی جلد اس قدر دیدہ زیب ہے جسکو دیکھکر فوراً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس محمل مین ضرور کوئی لیلی پردہ نشین ہوگی۔ لکھائی چھپائی اچھی ہے کاغذ بھی بُرا نہین ہے، باوجود ان تمام خوبیون کے قیمت صرف دو روپیہ ہے۔ کارکنان حلقہ المشائخ دہلی سے طلب کیجئے۔

اب ہم "کرشن بیتی" سے ناظرین کی دلچسپی کے لئے چند مقامات نقل کرتے ہین جس سے لائق مصنف کے زور قلم کا اندازہ ہو سکیگا۔ ایک مقام پر جہان سنگدل کنس نے اپنی بہن کی برات پر حملہ کیا ہے۔ صفحہ (۱۳) اُس واقعہ کی تصویر اس طرح کھینچتے ہین:-

"تلوار اُٹھی، چارون طرف سناٹا چھا گیا، آن کی آن مین خوشی کی چیخ پکار سہم کر چپ ہو گئی، خلقت سکتہ مین تھی، براتی نقش حیرانی تھے، خود کنس تلوار تول کر بُت بنا رہ گیا تھا، خیالات کی لڑائی ٹھہرانی چاہتا تھا کہ باسدیو کی خوشامد اور عاجزی نے اس تھرا گیر سکوت کو توڑا کنس مجنون کی طرح باسدیو کی منت و زاری سُن رہا تھا جو

اُسکے غیظ کی آگ پر پانی ڈال ڈال کر بجھا رہی تھی کنس اُوسکی فرعونی دب گئی باسدیو کا جادُو چل گیا، تلوار غلاف مین چھپی، برات آگے بڑھی ۔"

صفحہ ۱۴۲ مین جہان دیوکی کا لڑکا مارڈالا گیا ہے اُسکی بدحواسی اور پریشانی و رنج و غم کی تصویر اِس قدر موثر ہے جس سے آنسو نکل آتے ہین ۔

" ارے کیا اِس دیس مین میرا کوئی مددگار نہین! کوئی ہو تو آئے، میرا لاڈلا سو گیا ہے اسکو جگائے ۔ بھائی کنس کو خبر دو ۔ میرا بیرن بھیا میری بپتا سُنے گا ۔ اُوہ مین بھولی کنس کو نہ بلاؤ ۔ وہ میرے بچے کو مارڈالیگا ۔ دیکھو دیکھو یہ بچہ مارڈالا کس کا لاڈلا تھا، کیسا پھول سا کمھلایا پڑا ہے ۔ ہائین سب چُپ کھڑے ہین ۔ کوئی نہین بولتا ۔ یہ بچہ کون لایا تھا ۔ بھائی نے اسے کیون مارڈالا ۔ میرا پتی باسدیو بھی چُپ ہے ۔ اِس نے بھی پرائے بچہ کو نہ بچایا ۔"

صفحہ ۱۴۷ مین دنگل کا نظارہ اس طرح دکھلایا ہے :۔

" مقررہ مقام پر دنگل آراستہ ہوا ۔ رعایا کی تمام عوام و خواص، عورت مرد، بچے بوڑھے صفین باندھ کر کھڑے ہوگئے، اور ایک طرف راجہ کنس اور اُسکے تمام امیر تخت اور کرسیون پر بیٹھ گئے، اور دوسری جانب راجہ کی سب رانیان خیمون کے نیچے جمع ہوگئین وہین ایک رُخ پر باسدیو اور دیوکی بھی آن کر بیٹھ گئے ۔ اُنکی جان ستاٹون مین جا رہی تھی کہ دیکھیے تقدیر کیا کرشمہ دکھاتی ہے ۔ کرشن اور بلرام کا کیا انجام ہوتا ہے، کلیجون مین پہلے ہی داغ پڑے ہوے ہین، پلی پلائی وہ جوان جہان جانین بچتی ہین یا یہ بھی پہلے نونہالون کی طرح خونی سفاک کے ہاتھون پامال ہوتی ہین ۔ اُدھر رعایا کے جتنے لوگ جمع ہوے تھے اُنکے دلون کا بھی عجب حال تھا ۔ وغیرہ ۔"

ایک جگہ صفحہ ۱۵ مین کنس کے مارے جانے کا حال اس طرح تحریر کرتے ہین:-

"آج اُس کنس کا کام تمام ہوا جس نے دُنیا کی زندگی کو ابدی زندگی سمجھ رکھا تھا آج اُس موذی کا تاج خاک مین گر پڑا جس نے حکومتِ دنیا کی خاطر بہت سے بیگناہ معصومون کے سر نازنین جسمون سے کاٹ کر خاک بسر کیے تھے، دیکھو متھرا کا شہزور قوت والا فوجون اور ہتھیارون کا مالک، ہیرے جواہرات اور سونے چاندی کا بادشاہ، ایک لوہے کے ٹکڑے سے ذبح ہو کر کیا مایوس سر کٹائے پڑا ہے، تخت کے نیچے زمین اُسکے ناپاک خون سے لال ہو رہی ہے، اُسکی آنکھین آدھی کھلی ہوئی ہین اور آدھی بند ہین۔ اُسکے لمبے بال خاک و خون سے لتھڑے ہوئے ہین۔"

غرض ایسے بہت سے مقامات ہین جو نہایت دلچسپ و موثر ہین۔ کتاب مین تصاویر کی شرکت اور بھی پر لطف ہو گئی۔ ایک تصویر "سری کرشن کا کنس کو ہلاک کرنا" دل ہلا دینے والا سمان ہے۔ اسی قسم کی متعدد تصویرین ہین جس سے کتاب کی دلچسپی مین اضافہ ہو گیا ہے۔ ان تمام خوبیون کے ساتھ بعض جگہ کتابت کی غلطیان رہ گئی ہین جسکے صحت نامہ کی سخت ضرورت ہے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۱	۱۶	سوپخ	سوچ
۱۳	۹	ڈیوکی نچے	دیوکی کے بچے
۱۵	۱۸	قرح	قدح
۱۹	۴	کوبچہ	کوچہ
؍؍	؍؍	عجوبہ	اعجوبہ
۲۴	۱۳	یا	کہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۵	۴	پنڈون	پنڈتون
۵۷	۴	سوچکر	سوچ کر
۸۱	۱۲	کوچنے	کوچے
۱۰۵	۱۵	آناً فاناًمین	آناً فاناً
۱۱۶	۶	نسلاً بعد نسلاً	نسلاً بعد نسلٍ

کم ثو موت
حصۂ اوّل

یعنی اجل عقبیٰ - آخرت یاد دلانے اور عشق دُنیا کی بھول سے بچانے ہین، "حصار الحیات" جسکو خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی نے لکھکر لکھوا کر اور جمع کرکے کتاب کی صورت دی - اِس کتاب کو ہم نے پڑھا، ہماری رائے مین یہ کتاب ایسی ہے کہ ہر شخص اسکو اپنے مطالعہ مین رکھے تاکہ دنیا کی ناپائداری کا انقلاب کن منظر ہر وقت پیش نظر رہے، یہی ایک ایسا خیال ہے جو انسان کو تمام برائیون سے بچا سکتا ہے جتنے بُرے کام ہین وہ موت کو یک لخت دل سے فراموش کرا دیتے ہین - جب انسان یہ سمجھ لیگا کہ دُنیا کی تمام لذتین فانی ہین اور عنقریب تمام ساز و سامان چھوڑ کر جانا ہوگا تو پھر اِس سے کسی قسم کے بُرے افعال کا سرزد ہونا غیر ممکن ہے - نہ وہ کسی کا حق تلف کریگا، نہ کسی کو ستائیگا، نہ کسی کے مال و ناموس کی طرف بُری نظر سے دیکھیگا، نہ چند روزہ جاہ و حشم پر کبر و نخوت کا خیال دل مین آنے دیگا خصوصاً اس زمانہ مین اِس کتاب سے بہتر کوئی ناصح نہین ہو سکتا جبکہ دہریت اور لامذہبی کی زہریلی ہوا چارون طرف چل رہی ہے اور نئی پودون کی نشو و نما مین اِس کا یہ اثر ہوا ہے کہ وہ اپنی ہستی کی غرض و غایت دنیا کے چند روزہ عیش و عشرت کو سمجھے ہوئے ہین کبھی بھولے سے بھی موت کا خیال نہین آنے دیتے، واقعی موت ایسی چیز ہے کہ اُسکے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہین، بچے، جوان، بوڑھے، غریب امیر، بادشاہ وزیر سب کے لئے یہ دن آنے والا ہے ؎

یہ قامت ہین پیغام سفر دیتی ہے ۔ زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

دارا کی دارائی نہ رہی نہ سکندر کی خودستائی ! کل نفس ذائقۃ الموت ۔ بڑے بڑے محلون اور نرم نرم بچھونون کے سونے والے ایک روز فرش خاک پر لحد کی تنگ کوٹھری مین پڑے ہونگے اور کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔

آغوش لحد مین جب کہ سونا ہوگا ۔ جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

تنہائی مین آہ کون ہوویگا انیس ۔ ہم ہو وینگے اور قبر کا کونا ہوگا

اور پھر چند روز مین لحد کا نشان بھی باقی نہ رہیگا ۔ زمانہ کی گردش سے ہڈیان ٹھوکرین کھاتی پھرینگی کوئی یہ بھی نہ بتا سکیگا کہ یہ ہڈی سر فغفور کی ہے یا کسی فرد ولی کی ۔

کاسہ سر فغفور کا گردن سے الگ ہے ۔ زانو سے جدا ہوگئین تیمور کی ساقین

واقعات کو اس طرح قلمبند کیا ہے کہ کیسا ہی سنگدل آدمی ہو اسکے پڑھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہین رہ سکتا اسکا ایک ایک فقرہ عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے ایک دفتر سے کم نہین ہے ہماری غفلت کا عجب حال ہے کہ ہم روزمرہ لوگون کو مرتے ہوے دیکھتے ہین مگر اپنی موت کا کبھی خیال نہین آتا ۔ ہماری حالت مسلخ کے بکرون کی سی ہے کہ ایک بکرا سامنے ذبح ہو رہا ہے اور دوسرا اپنے خورد و نوش مین مصروف ہے یہ نہین سمجھتا کہ اب میری بھی باری آئیگی اور وہ وقت بہت قریب ہے کہ چھری سے گلے ملونگا ۔ اولیاء اللہ اور پیغمبران اولوالعزم تو موت کو یاد کر کے رویا کرتے تھے ۔ ایک ہم ہین کہ کبھی کسی کی قبر کی طرف نظر بھی نہین کرتے ۔ ہاے موت کا بھی کیسا دل ہلا دینے والا وقت ہوتا ہے نہ دولت کام آتی ہے ۔ نہ دوست احباب ساتھ دیتے ہین ع

"سوائے اندوہ و یاس و حرمان نہ ہوگا حاصل جہان سے کچھ بھی"

محمود غزنوی نے مرنے سے ایک روز قبل تمام مال و اسباب ہاتھی گھوڑے ساز و سامان کو ایک وسیع میدان مین رکھوا کر حکم دیا کہ ایک پالکی مین مجھکو لٹا کر تمام چیزین دکھا دی جائین ۔ کیونکہ پھر انکو دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

سکندر اعظم نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اُسکے ہاتھ کفن سے باہر رہین تاکہ سب کو معلوم ہوجائے کہ با این ہمہ ملک گیری دُنیا سے خالی ہاتھ چلا ہے ہم اس سے زیادہ کیا لکھین۔ اس لئے کہ خواجہ صاحب نے اسکو دلچسپ اور کامیاب بنانے مین کوئی دقیقہ اُٹھا نہین رکھا۔ خواجہ صاحب کو جزائے خیر دے کہ اُنھون نے قصہ کہانیون کے پیرایہ مین ایک اہم بات کو دل نشین کرنے کی پوری کوشش صرف کردی۔ مولانا سیماب کی نظم پر خواجہ صاحب نے اشعار ذیل پر اعتراض کیا ہے کہ یہ باتین خلاف تاریخ لکھدی ہین۔

نکالین ظلم سے قاتل نے سرگین آنکھین — قدم پہ بھائی کے آرانے رکھدیا سر کو
پھر ایک در پہ لٹکوا دیا سرِ دارا — کہ ہو "تماشۂ عبرت" من و شما کے لئے

خواجہ صاحب کے تاریخی اعتراضات بہت بجا ہین، دوسری غلطی کا مین اضافہ کرتا ہون، جو چوتھے مصرع مین "تماشائی" ہے "تماشۂ عبرت" کی ترکیب غلط ہے۔ تماشا مین الف ہے۔ ہائے مختفی نہین ہے شعرا نے بھی الف کے ساتھ نظم کیا ہے۔ مرزا غالب فرماتے ہین ؎

بنا کر فقیرون کا ہم بھیس غالب — "تماشائے" اہلِ کرم دیکھتے ہین

المفرد المرکب مولوی عبد اللطیف خان صاحب (منشی فاضل) نے نہایت قابلیت سے اِس کتاب مین الفاظ کے جوڑ توڑ کو بتا دیا ہے اور ہر لفظ کی اصلیت کھول کر طلبہ کے معلومات مین اضافہ ہونے کے لئے اچھا خاصا اور مفید سرمایہ جمع کردیا ہے الفاظ کا حقیقی تعلق اور انکی شکل یا ساخت مین مشابہت یا اشتقاق کا سراغ لگانا ایک دلچسپ علمی مشغلہ ہے اسکے مطالعہ سے تخیل کو تحریک ہوتی ہے اور نفس کو تحقیق کے لئے ایک سیدھا اور آسان راستہ نظر آجاتا ہے اس مشغلہ کا تعلق خصوصی مدارس کے طلبہ کی تعلیم سے ہے کیونکہ ایک کلاس کے طلبہ اپنی سمجھ کے موافق مطالعہ سے یکایک دلچسپی پیدا کرنے سے مجبور ہین ایسی حالت مین ان کے لیے ایک ایسی سہل الاصول شی کی ضرورت ہے جس سے نفس کے پرزے بلا دقت حرکت کرسکین اور دماغ بلا دقت قبول کرلے۔ اس کتاب سے یہ بات پوری ہوسکتی ہے۔

ذیل مین چند لفظون کی تحقیق کتاب سے اخذ کر کے نقل کی جاتی ہے جس سے مؤلف کی محنت و جانفشانی کا بخوبی اندازہ ہو سکیگا۔

آستین۔ مرکب ہے آس بمعنی ستون (گھسنا) اور تین کلمہ نسبت سے اس لئے کہ کلائی کو گھستی ہے

بادہ۔ (شراب) مرکب ہے باد بمعنی غرور اور ہا نسبت سے چونکہ شراب کے پینے سے ایک قسم کا غرور پیدا ہو جاتا ہے اس لئے یہ نام رکھا گیا۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرکب ہے۔ باد بمعنی ہوا اور ہا نسبت و مشابہت سے بنا بر لطافت اس کو ہوا سے تشبیہ دیدی ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے ؎

بادہ را باد نام کرد استاد ۔۔۔ زانکہ آبے بود لطیف چو باد

دیگر ۔ ز باد نام نہادند بادہ را یعنی ۔۔۔ چو باد صبح دمیدن گرفت باد بخواہ

برسام۔ ایک قسم کا ورم ہے جو سینہ مین پیدا ہوتا ہے۔ یہ فارسی ہے۔ مرکب ہے بر بمعنی سینہ اور سام بمعنی ورم سے (ورم سینہ)

ذُباب (مگس) مرکب ہے ذُب بمعنی طُرد ماضی مجہول اور آب بمعنی رجع سے مکھی کی یہ خاصیت ہے کہ جب اسکو ہٹاؤ گے تو پھر واپس آئیگی اس لئے اسکا یہ نام رکھا گیا۔ اسی طرح تقریبًا ایک ہزار الفاظ کی ترکیب اور صلیت کو بیان کیا ہے، ہماری رائے مین تو یہ کتاب طلبہ کو خصوصًا اور مدرسین کو عمومًا خرید کے مستفید ہونا چاہئے۔ ”ذخیرہ“ کے معاونین سے خصوصًا التماس ہے کہ وہ لائق مؤلف کی حوصلہ افزائی فرماین اور ایک ایک نسخہ کی فرمائش کر کے اپنی علم دوستی کا حقیقی ثبوت دین۔

مثنوی ”مجنون لیلیٰ“ حضرت امیر خسرو رح کے نام سے دنیا مین ایسا کون بے خبر ہے جو واقف نہ ہوگا۔ اُنکے بعد سیکڑون برس سے زمین آفتاب کے گرد چکر پر چکر لگا رہی ہے مگر ابتک ایسا جامع الکمال خداے سخن ایک شخص بھی پیدا نہ کر سکی، اگر مین اُنکے علم و کمال کے واقعات پر اجمالًا بھی نظر ڈالون تو طبیعت جدا اسکا پتہ دے رہی ہے کہ غالبًا مین اپنے مطلب سے کوسون دور نکل جاؤنگا صرف اسی ایک بات سے انکے علم و کمال کا

اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس وقت سلطان محمد ابن سلطان غیاث الدین بلبن نے شیخ سعدی علیہ الرحمہ کو اپنے دربار میں آنے کے لئے لکھا ہے تو شیخ جوہر شناس نے اسکے جواب میں لکھا کہ "سعدیؒ جوان آپکے دربار میں موجود ہے، اس بوڑھے سعدیؒ کے آنے کی کیا ضرورت ہے"! اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حضرت خسروؔ کی وقعت سعدیؒ سے یکتائے زمانہ کے دل میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھی اور کیوں نہ ہوتی اس لئے کہ انکی سحر بیانی انکی خداداد ذکاوت و مسلم قابلیت کا ہندوایران میں پورے طور سے سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ انکی کسی تصنیف و تالیف پر تبصرہ کرنا گویا آفتاب کے سامنے چراغ جلانا ہے لیکن زمانہ کی تاریکی اور ملک کا مذاق اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ جنکی آنکھیں آفتاب کی ضو سے بیخبر ہیں انکی حقیقت کو ذہن نشین کراکے ان کی آنکھوں سے غفلت و تاریکی کا پردہ اٹھادیں۔

مولانا حسرت شروانی قابل مبارکباد ہیں اور انکی محنت و جانکاہی لائق تحسین و داد ہے انہوں نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے جو سعی فرمائی ہے اسمیں انکو پوری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مثنوی "مجنون لیلیٰ" جو امیر خسروؔ کی زندہ یادگاروں میں ہے اور جو زمانہ کی ناقدری کے سبب سے قلب مجنون اور زلف لیلیٰ کی طرح بیابان گمنامی میں پریشان حال پڑی ہوئی تھی اور جسکی خوشگوار ہستی تقریباً مٹ چکی تھی اسکو از سر نو بصد آرایش و زیبایش اشاعت و شہرت سے محمل نشین کردیا اور اس شاہد رعنا کے جمال دلفریب سے دنیا کی آنکھوں کو منور کردیا۔ یہی نہیں کیا بلکہ اسکے محاسن و غوامض سے بھی ایک عالم کو واقف کرادیا معمولی طریقہ سے کسی قصہ پر نظر ڈالتے وقت ان نکات کی طرف بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ خاص خاص صنف کے اشعار کو انتخاب کر کے مقدمۂ کتاب میں بتلادیا ہے گویا چند تصویریں جو ایک ہی مرقع میں تھیں انکو علیحدہ علیحدہ فریم میں لگاکر پبلک کے سامنے پیش کیا ہے تاکہ ہر ایک کی خوبی کو بنظر غائر دیکھ سکیں، مثلاً مجنون کا مکتب میں جانا، ابتدائے عشق، لیلیٰ کی پردہ نشینی، مجنون کی انتہائے وحشت، لیلیٰ کا کمال حسن، لیلیٰ کا عشق سے متاثر ہونا یا لیلیٰ کی موت، سوز و گداز، نالۂ مستانہ، لوگوں کا

سرزنش کرنا عاشق کا ملامت سُن کر صبر کرنا۔

اِسکے سوانیچرل تصاویر کو الگ چھانٹ کر پیش کیا ہے مثلاً بہار، خزان، دوپہر کی تپش۔ جذبات کا فوٹو الگ اُتارا ہے۔ مثلاً لیلی کی مان کا لیلی کو ترکِ عشق کی نصیحت کرنا، مجنون کی مان کا مجنون کو سمجھانا، لڑکے اور لڑکی کی مان کے اندازِ بیان کا فرق، مجنون کے باپ کا مجنون کو نصیحت کرنا، مان اور باپ کے لہجہ کا فرق، مثلاً لیلی کی مان کہتی ہے کہ بیٹی:-

تو سادہ مزاجی و تنک دل	وز نیک و بد زمانہ غافل
ترسم کہ چو گردد این خبر فاش	بدنام شوی میانِ اوباش
جائے منشین کہ چون تہی پائے	تہمت زدہ خیزی از چنان جائے
عشق ارچہ بود بہ صدق و پاکی	خالی نہ بود ز شرمناکی
گردم نہ زنند کاروانان	چون باز دہی زبد گمانان

اور مجنون کی مان کہتی ہے بیٹیا:-

بالائے چو تیر شد کمانم	و آمد بہ تزلزل استخوانم
مپسند کہ در چنین زمانے	سوز د نعمت گسستہ جانے
مردانہ برآر پائے از گل	بندی بخدائے خویشتن دل
تا بو کہ بہ صبر فرخ انجام	از کام روا برآیدت کام
ما ہم ز پیت چنانکہ دانیم	جہدے بہ کنیم تا توانیم

اِن دونون نظمون سے لڑکے اور لڑکی کی مان کے خیالات مین جو فرق ہے اُسکو بتلایا ہے کہ لڑکی کی مان رسوائی اور ندامت سے ڈراتی ہے تو لڑکے کی مان ڈھارس دیتی ہے۔ اب باپ کی تقریر سنئے۔

بودم بہ گمان کہ گاہ پیری	مونس شویم بدست گیری

پیوستہ زہ کمان سختم | در زلزلہ سست شد و ختم
زنیسان نفسے بہ جہل مشمر | عمر ست نہ باد سہل مشمر
زین غم ہمہ گر مرا دیار ست | غم ہیچ مخور کہ در کنار ست
گر برمہ آسمان نہی ہوش | کوشم کہ رسانمت در آغوش

اِن دونون تقریرون کے باریک فرق کو بتلایا ہے کہ بُڑھیا اپنے زنانہ بل بوتے کے موافق کہتی ہے کہ ؎

ماہم زپیت چنانکہ دانیم | جہدے بکنیم تا توانیم

اور بوڑھا اپنی مردانہ ہمت کے بھروسہ پر کہتا ہے ؎

گر برمہ آسمان نہی ہوش | کوشم کہ رسانمت در آغوش

زیادہ لطف یہ ہے کہ حضرت نظامی و ہاتفی و مکتبی کے کلام سے بعض مقامات مین اسکا مقابلہ کیا گیا ہے جس سے دلچسپی مین بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ مولانا شروانی کا یہ فرمانا کہ مثنوی کلکتہ مین ایک دفعہ چھپ چکی ہے بہت درست ہے لیکن ایسا نادر مقدمہ کلکتہ کے چھاپے کو کہان نصیب ہوا۔ مولانا شروانی فرماتے ہین "مثنوی مین مولانا نظامی کا مرتبہ امیر خسرو سے بلند ہے اور اسکو خود امیر خسرو نے بلند آہنگی سے ظاہر کیا ہے" مین نے خسرو کی "مجنون لیلیٰ" مین اُس مقام کو ڈھونڈھ کر نکالا۔ نظامی کی مدح مین یہ کئی شعر قابل ذکر کے ہین ؎

اوزان ہمہ سنگ گوہر آمائے | تنہا وزیک روش برون پائے
صد طرز سخن چو شکر و شہد | ننمود مگر بہ مثنوی جہد
او بود بیک فنی نشانہ | چون یک فنہ بود شد یگانہ

واقع مین امیر خسرو نظم و نثر جمیع صنائع سخن پر قادر تھے، مولانا نظامی کی طرح محض مثنوی گو نہ تھے، خسرو کا یہ کہنا ع او بود بیک فنی نشانہ۔ بہت درست ہے۔

ان تمام خوبیون کے ساتھ معزز مصحح کو جس بات کی شکایت تھی اس سے اب بھی یہ مثنوی نہ بچ سکی یعنی کاتبون کا دستِ تصرف۔ اسمین بھی کہین کہین تصرف کیے بغیر نہ رہا مثلاً مقدمہ کتاب مین لیلیٰ کی مان کی تقریر کا ایک شعر اس طرح چھپا ہے ؎

جاے منشین کہ چون منی پاے   تہمت نہ دہ خیری از چنان پاے

یہان مصرعۂ ثانی مین "جاے" کے عوض "پاے" لکھا گیا ہے جس سے معنوی بے ربطی کے علاوہ قافیہ بھی غلط ہو گیا ہے۔ صفحہ ۴ مین ایک شعر ہے ؎

قادر تو ئی آن دگر کہ باشد   منعم تو ئی آن دگر چہ باشد

اس مین قافیہ ہی نادارد ہے "کہ باشد اور چہ باشد" کی ہ بھی تو وزن سے ساقط ہو گئی ہے کاف زیرک اور چ زیر ﭻ قافیہ رہ گیا ہے خسرو کی شان اس غلطی سے ارفع ہے۔

کہین کہین نقطے بھی رہ گئے ہین جس سے لفظ کے معنی بھی بدل گئے ہین صفحہ ۵۳ کے ایک شعر مین املا کی غلطی ہے ؎

بہ آن خردے کہ داشت رایت   چون در دہل اوفتاد پایت

دہل جاے حطی سے ہے جسے کاتب نے ہاے ہوز سے لکھ دیا ہے۔ صفحہ ۱۶۹ مین یہ شعر ؎

دانم کہ بہ چاشنی این شہد   گوئی صد و پنج ہی بصد جہد

کاتب نے یون لکھ دیا ہے ع "گوئی صد و پنجہی بصد جہد"۔ صفحہ ۹ کے اس شعر مین ؎

آن مرغ چہ تر سد از بطانہ   کو خار خورد بجاے دانہ

مولانا شروانی حاشیہ پر غیاث کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہین (بطانہ اندرون شکم و سینہ غیاث) مین عرض کرون گا کہ "صراح" مین "بطنہ" پری و سیری شکم از طعام" کے معنی پر ہے اسی لفظ کو فارسی مین تصرف کر کے "بطانہ" بنا لیا ہے اور یہی معنی یہان مقصود ہین، بہرحال مصحح کی یہ کوشش قابل

طور سے قدر کے قابل ہے ایسی کتنی ہی نایاب تصنیفین ہونگی جو کس مپرسی کے عالم مین پڑی ہونگی بلکہ فنا ہو چکی ہونگی۔ خدا کرے کہ یہ علمی سلسلہ اسی طرح جاری رہے اور امیر خسرو علیہ الرحمہ کی جملہ تصانیف اسی خوبی کے ساتھ زیور طبع سے مزین ہوکر اہل ملک کے دلی شوق کو پورا کرین۔

جملہ علم دوست حضرات سے عموماً اور ناظرین "ذخیرہ" سے خصوصاً التماس ہے کہ وہ کم سے کم ایک ایک نسخہ خرید کر کے اپنی علم دوستی کا ثبوت دین اور قوم کی اس علمی خدمت مین شریک ہون۔

تفسیر قرآن | مؤلفہ جناب شائق احمد صاحب عثمانی بھاگلپوری - ہم نے اس تفسیر کا مطالعہ کیا تفسیرین تو عربی، فارسی، اردو مین بہت ہین لیکن جس مقصد کو مدنظر رکھ کر تفسیر لکھی گئی ہے بیشک اپنی طرز مین آپ ہی کہلانے کی مستحق ہے، ہر زمانہ مین جو تفسیرین لکھی گئین وہ اُس زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے لکھی گئی تھین اور اسی لئے مقبول بھی ہوئین، اس زمانہ مین اگر "تفسیر کشاف" کے ادبی نکات یا "تفسیر کبیر" کے معقولی دقائق بیان کئے جائین تو اسکے سمجھنے والے بہت ہی کم نکلین گے بلکہ نہین نکلین گے۔ اسوقت ایسی ہی ایک تفسیر کی ضرورت تھی خصوصاً نئی تعلیم کے دلدادہ جب اسکو پڑھین گے تو انکو بہت لطف آئیگا تعلیم قرآن کے ضمن مین اُن شبہات کو بھی اچھی طرح رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اس زمانہ کے اثر صحبت سے ہر شخص کے دل مین پیدا ہوتے ہین اس پہلی جلد مین صرف اُن سورتون کی تفسیر کیگئی ہے جو توحید او عدل و قیامت وغیرہ اصول دین او عقائد سے متعلق ہین، اسی کی اس وقت زیادہ ضرورت بھی ہے، جب اصل مستحکم ہو جائے تو فروع کا حاصل ہونا دشوار نہین ہے۔ خداوند عالم مصنف کو اسکی جزائے خیر عطا کرے اور ہر شخص کو اس سے استفادہ کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

سلک مروارید | مرتبہ علیا جناب میمونہ سلطان شاہ بانو صاحبہ بیگم نواب زادہ میجر حاجی محمد حمید اللہ خان بہادر بی اے، علیگ بھوپال، اس کتاب مین جس قدر تاریخی واقعات جمع کئے گئے ہین ان مین ہر ایک اپنے اپنے رنگ مین گوناگون شان رکھتا ہے کوئی واقعہ ایسا نہین ہے جس سے پڑھنے والون کے

دل پر خاص اثر نہ ہو اور انکے اخلاق میں مدوجزر پیدا نہ ہو جائے۔ ان چھوٹے چھوٹے قصوں سے نیکی، پاکیزگی حلم و بردباری، محبت و اخلاق، ہمت و استقلال، راستی و راستبازی، شجاعت و بہادری، ایثار نفس وغیرہ وغیرہ کے بہترین سبق حاصل ہوتے ہیں۔

کافور اخشیدی اور ایک نجومی کی حکایت ہمایوں اور ایک بہشتی کی حکایت ایفائے وعدہ کا سبق تلقین کرتی ہے، ان حکایتوں کے پڑھنے سے عہد کا ایفا اور اسکو پورا کرنے کا ثبوت ملتا ہے احسان کے بدلے میں عباس کوتوال اور ایک قیدی کی حکایت نہایت نتیجہ خیز ہے، کوتوال نے صرف اس احسان کے بدلے میں اس قیدی کو اپنی جان پر کھیل کر رہا کر دیا تھا جس نے عین مصیبت کے وقت کوتوال کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ ایسے نیک لوگوں سے اب دنیا خالی ہے الا ماشاء اللہ

غرض پوری کتاب اس قسم کی حکایتوں سے لبریز ہے۔ کتاب کی دلچسپی اس سے ظاہر ہے کہ ایک بار آپ نے پڑھنا شروع کیا ممکن نہیں کہ بغیر ختم کئے ہوئے آپ چین سے بیٹھ سکیں۔ علیا حضرت بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال کے خاص توجہات سے طبقۂ اناث میں کامل طور سے نہایت قابلیت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہو گیا ہے۔ اللھم زد فزد۔

ذکر مبارک یہ بھی علیا جناب میمونہ سلطان شاہ بانو صاحبہ کا ایک مؤلفہ رسالہ ہے اس میں آنحضرت صلعم کے مبارک حالات ولادت سے وفات شریف تک کے جمع کئے گئے ہیں اور ہر واقعہ کو اختصار کے ساتھ عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے، علیا جناب نے طبقۂ اناث پر احسان کیا ہے کہ انکے لئے اس قدر سہل متمتع کتاب تیار کر دی جسکے پڑھنے سے انکو دلی مسرت ہوگی اور ہر ایک بات کو نہایت آسانی سے انکا نازک دماغ قبول کر لیگا۔ علیا حضرت فرمانروائے بھوپال کی جوہر شناسی نے اسکو خوب پرکھا اور طبقۂ اناث کے لئے مفید پاکر زنانہ مدارس بھوپال میں داخل نصاب کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔ خوشا وہ لوگ جو پیغمبر اسلام کی سیرت کا ہمیشہ اور ہر وقت مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ مبارک رسالہ زنانہ مدارس میں درسا

درسًا پڑھائے جانے کے قابل ہے تاکہ مسلمان لڑکیان اپنے برگزیدہ پیغمبر کی مبارک سیرت سے بیخبر نہ رہین جو اس سے بیخبر ہین ان سے زیادہ کوئی بد قسمت نہین - !

نقاد آگرہ آگرہ وہی مبارک سرزمین ہے جو برج بھاشا کے لٹریچر کا مرکز مانی جاتی تھی جسکی آغوش شفقت مین ہندوستان کے بڑے بڑے شاہان اُولوالعزم پڑے ہوئے قیامت کی نیند سو رہے ہین، اکبر و جہانگیر و شاہجہان کا اُردو آگرہ ہی مین رہا - اِس سرزمین نے بڑے بڑے باکمال شعرا پیدا کئے جنکی سحر بیانیون نے اہل ہند کو محو حیرت بنا رکھا ہے اُردو زبان کے دو بڑے شاعر متقدمین مین میرؔ اور متاخرین مین غالبؔ، اسی گلشن کے مرغ خوش الحان تھے جنکی سحر بیانی نے تمام اہل ہند کے دلون کو مسخر کرلیا ہے اور جنکی مسیحائی نے اُردو شاعری کے جسم مین ایک نئی روح پھونک دی ہے، جذبات کے سین دکھانے والا "نظیرؔ" اِسی اسٹیج کا ایکٹر ہے -

اِسی سرزمین سے شاد الگیر نے سب سے پہلے ۱۹۱۳ء مین "نقاد" کو جاری کیا تھا جو ڈھائی سال تک نہایت خوبی کے ساتھ اپنے ادبی رنگ مین جلوہ دکھاتا رہا - اُس وقت کے موجودہ تمام رسائل مین ملک کے اہل نظر نے اسکو محبت اور امتیاز کی نظر سے دیکھا جو لوگ خالص ادبیت کے دلدادہ تھے اُنھون نے تو اسکو اپنا نورِ نظر تصور کیا، ہر شخص اسکے مضامین نظم و نثر کو مزے لے لے پڑھتا تھا اور وقت معینہ پر اسکی آمد کے انتظار مین بے چینی سے چشم براہ رہتا تھا - دو ڈھائی سال کی اشاعت کے بعد معلوم نہین کس کی نظر لگی کہ یہ غنچہ چمنستان علم ادب جو ابھی اچھی طرح سے کھلنے بھی نہ پایا تھا مُرجھا گیا اور دلدادگانِ اُردو کے دل کی کلی کو عاشق دلگیر کی طرح پژمردہ کر دیا - بارے اپریل ۱۹۱۷ء سے ابر فیضانِ الٰہی نے نئے سر سے آبیاری کر کے اُسکو پھر شگفتہ کیا ؎

دیتا ہے وہ دولت تو اُٹھائے نہین اُٹھتی
پھولون سے لچک آگئی شاخِ گل ترین

اِس دوسرے دور مین اسکی آبیاری مین ایک ایسے نازک دماغ نے بھی حصہ لیا ہے کہ جس سے

ادبی دلچسپی مین ایک خاص اضافہ ہوگیا - وہ نازک دماغ کس کا ہے اور وہ کون ہین! سنئیے! محترمہ قمر زمانی صاحبہ ہین جنہون نے نقاد کے اس دوسرے دور سے ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے اور اپریل ۱۹۱۷ء کے پرچہ مین "نقاد کی زندگی کا دوسرا دور اور مین" کے عنوان سے ایک نفیس و دلکش افتتاحیہ مضمون لکھ کر اسکو آبحیات پلانے کی پوری کوشش کی ہے اور آخر مین وہ قدر افزایان "نقاد" سے التجا کرتی ہین کہ "خدا کے لئے اب اسکو فنا ہوتے نہ دیجئے گا کہ اب اسمین ایک نسوانی عزت بھی شامل ہے جسکی توہین شاید آپکو گوارا نہو" - بیشک! تمام شیدایان "نقاد" کو اس فقرہ کی پوری پیروی کرنی چاہئیے کیونکہ نسوانی عزت کا احترام لازمی ہے - التجا کس مزے کی ہے اس مضمون کے ہر فقرہ سے "قمر زمانی" کی "نقاد" کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے ہر ایک کے معقول اور مفید مشورے پر عمل کرنا ضروری ہے اور وہ بھی طبقۂ اناث مین ایسا قابلِ رشک دماغ جسکے نفیس و پاکیزہ ادبی خیالات نے "نقاد" مین چار چاند لگا دیے ہین خاص خاص حلقون مین بہ نسبت پہلے دور کے "نقاد" کی دلچسپی مین بہت اضافہ ہوگیا ہے -

اپریل ۱۹۱۷ء سے "نقاد" برابر ہماری نظر سے گزر رہا ہے ادبی مضامین شوخیون سے لبریز چوٹی کے ہوتے ہین اسکے مضامین نظم و نثر مین وہ طوفان بے تمیزی نہین ہوتا ہے جو اکثر رسائل مین ہوا کرتا ہے شاہ دلگیر مدیر رسالہ "نقاد" ہر مضمون کو خوب جانچ پڑتال کر کے شایع کرتے ہین اور یہی ہونا بھی چاہئیے اس سے پرچہ کا معیار گھٹنے نہین پاتا -

شاہ دلگیر کی محنت اور خوش سلیقگی لائق تحسین و داد ہے خدا انکو اپنے ارادون مین کامیابی عطا کرے تاکہ وہ اسکو اس سے بھی بہتر حالت مین ملک مین پیش کر سکین ہم سب کو چاہیے کہ "نقاد" کو زندۂ جاوید بنانے کی پوری کوشش کرین - ناظرین "ذخیرہ" سے امید ہے کہ اسکو نگاہِ شوق کا سرمہ بنا کر قدر دانی کی نظر سے ملاحظہ فرمائینگے اور "ذخیرہ" کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اسکے مطالعہ سے بھی اپنی دونون آنکھون کو علمی اور ادبی روشنی سے منور رکھین گے - انشاء اللہ ہم پھر کسی فرصت کے وقت "نقاد" کے

بعض خاص خاص مضامین پر اپنا خیال ظاہر کرینگے۔

شاعرانہ خیالات اس کتاب مین محمد یحیی صاحب تنہا بی اے نے شعرائے انگلستان کی مشہور نظمون کا نثر مین ترجمہ کیا ہی۔ ترجمہ نہایت سلیس ہی اور لائق مترجم نے اسکی کوشش کی ہی کہ شعر کے اصلی مفہوم اور شاعر کے جذبات کو اپنی زبان مین خوبصورتی سے ادا کر دین اور ترجمہ مین انگریزی شعرا کے بعض خاص الفاظ و محاورات کو بجنسہ قائم رکھا ہی تاکہ انگلستان کے رسم و رواج اور وہان کے شعرا کے انداز بیان کا پتہ چل سکے

کتاب کے تین حصے کئے گئے ہین پہلے حصہ مین انگریزی شاعری کی مختصر تاریخ لکھی ہی جس سے انگریزی شاعری کی ابتدا اور عہد بعہد کی ترقیون اور تبدیلیون کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے حصہ مین نظمون کا ترجمہ کیا ہے۔ اگر نظم کا ترجمہ نظم ہی مین ہوتا تو اسکے لطف مین بہت اضافہ ہوجاتا۔

انسائیکلوپیڈیا مین حقیقت شعر پر جو مضمون ہے اسمین لکھا ہے کہ "شعر کا مقابل اگر ہے تو فلسفہ سے ہے" شعر مین اور نثر مین تقابل نہین پایا جاتا میرا خیال تو یہ ہی کہ شعر کے مضمون کو اگر نثر مین لکھئے اور نثر بھی غیر زبان کی ہو تو ساری نثر ایک پھیکا پکوان ہوجاتی ہے ولولہ کے محاکات کا آلہ اگر ہے تو شعر ہے۔ نثر مین وزن نہ ہونے کے سبب سے محاکات مین وہ بات نہین آتی جو کبھی کبھی وزن کے طفیل سے کلام موزون مین پیدا ہوجاتی ہے اور اس پر تمام اہل بلاغت کا اتفاق ہے کہ وزن سے کبھی ایسی جان کلام مین پڑجاتی ہے کہ اسکی نثر بنانے مین کلام قالب بے روح رہ جاتا ہے۔

تیسرے حصہ مین اُن شاعرون کا تذکرہ ہے جنکی نظمون کے ترجمے اس کتاب مین درج ہین اِن تمام نظمون مین "اطمینان قلب کی تلاش" "گوشۂ تنہائی" "خوش نصیب کون ہے" "موت سب کو یکسان کردیتی ہے" اپنے حقیقی جذبات اور مضامین بہت ہی اعلیٰ درجے کے ہین۔

رموز بیخودی یعنی حیات ملیہ اسلامیہ مصنفہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور۔ ہم نے اسکے ایک ایک شعر کو بنظر غور و تعمق پڑھا۔ پوری کتاب رموز و اسرار کا گنجینہ ہے، ہم اس پر

ادبی دلچسپی مین ایک خاص اضافہ ہوگیا- وہ نازک دماغ کس کا ہی اور وہ کون ہین! سُنئیے! محترمہ قمرزمانی صاحبہ ہین جنہون نے نقاد کے اس دوسرے دور سے ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے اور اپریل ۱۹۱۷ء کے پرچہ مین "نقاد کی زندگی کا دوسرا دور اور ہم" کے عنوان سے ایک نفیس و دلکش افتتاحیہ مضمون لکھ کر اسکو آبحیات پلانے کی پوری کوشش کی ہے اور آخر مین وہ قدرافزایانِ نقاد سے التجا کرتی ہین کہ "خدا کے لئے اب اسکو فنا نہ ہونے دیجئے گا کہ اب اسمین ایک نسوانی عزت بھی شامل ہے جسکی توہین شاید آپکو گوارا نہو"- بیشک اِتمام شیدایانِ "نقاد" کو اس فقرہ کی پوری پیروی کرنی چاہیئے کیونکہ نسوانی عزت کا احترام لازمی ہے - التجا کس مزے کی ہے اس مضمون کے ہر فقرہ سے "قمرزمانی" کی "نقاد" کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے ہر ایک کے معقول اور مفید مشورے پر عمل کرنا ضروری ہے اور وہ بھی طبقہ اناث مین ایسا قابلِ رشک دماغ جسکے نفیس و پاکیزہ ادبی خیالات نے "نقاد" مین چار چاند لگا دیے ہین خاص خاص حلقون مین بہ نسبت پہلے دور کے "نقاد" کی دلچسپی مین بہت اضافہ ہوگیا ہے-

اپریل ۱۹۱۷ء سے "نقاد" برابر ہماری نظر سے گزر رہا ہے ادبی مضامین شوخیون سے لبریز چوٹی کے ہوتے ہین' اسکے مضامین نظم و نثر مین وہ طوفان بے تمیزی نہین ہوتا ہے جو اکثر رسائل مین ہوا کرتا ہے شاہ دلگیر مدیر رسالہ "نقاد" ہر مضمون کو خوب جانچ پڑتال کر کے شایع کرتے ہین اور یہی ہونا بھی چاہیئے اِس سے پرچہ کا معیار گھٹنے نہین پاتا-

شاہ دلگیر کی محنت اور خوش سلیقگی لائق تحسین و داد ہے خدا انکو اپنے ارادون مین کامیابی عطا کرے تاکہ وہ اسکو اس سے بھی بہتر حالت مین مُلک مین پیش کر سکین' ہم سب کو چاہیے کہ "نقاد" کو زندۂ جاوید بنانے کی پوری کوشش کرین - ناظرینِ "ذخیرہ" سے اُمید ہے کہ اسکو نگاہِ شوق کا سُرمہ بنا کر قدردانی کی نظر سے ملاحظہ فرمائینگے اور "ذخیرہ" کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اسکے مطالعہ سے بھی اپنی دونون آنکھون کو علمی اور ادبی روشنی سے منور رکھین گے - انشاءاللہ ہم پھر کسی فرصت کے وقت "نقاد" کے

بعض خاص خاص مضامین پر اپنا خیال ظاہر کرینگے ۔

شاعرانہ خیالات اس کتاب مین محمد یحیٰ صاحب تنہا بی اے نے شعرائے انگلستان کی مشہور نظمون کا نثر مین ترجمہ کیا ہی۔ ترجمہ نہایت سلیس ہی اور لائق مترجم نے اسکی کوشش کی ہی کہ شعر کے اصلی مفہوم اور شاعر کے جذبات کو اپنی زبان مین خوبصورتی سے ادا کردین اور ترجمہ مین انگریزی شعرا کے بعض خاص الفاظ و محاورات کو بجنسہ قائم رکھا ہی تاکہ انگلستان کے رسم و رواج اور وہان کے شعرا کے انداز بیان کا پتہ چل سکے کتاب کے تین حصے کئے گئے ہین پہلے حصہ مین انگریزی شاعری کی مختصر تاریخ لکھی ہی جس سے انگریزی شاعری کی ابتدا اور عہد بعہد کی ترقیون اور تبدیلیون کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرے حصہ مین نظمون کا ترجمہ کیا ہے۔ اگر نظم کا ترجمہ نظم ہی مین ہوتا تو اسکے لطف مین بہت اضافہ ہوجاتا۔

انسائیکلوپیڈیا مین حقیقت شعر پر جو مضمون ہے اسمین لکھا ہے کہ "شعر کا مقابلہ اگر ہے تو فلسفہ سے ہے" شعر مین اور نثر مین تقابل نہین پایا جاتا میرا خیال تو یہ ہی کہ شعر کے مضمون کو اگر نثر مین لکھئے اور نثر بھی غیر زبان کی ہو تو ساری نثر ایک پھیکا پکوان ہوجاتی ہے ولولہ کے محاکات کا آلہ اگر ہے تو شعر ہے۔ نثر مین وزن نہ ہونے کے سبب سے محاکات مین وہ بات نہین آتی جو کبھی کبھی وزن کے طفیل سے کلام موزون مین پیدا ہوجاتی ہے اور اس پر تمام اہل بلاغت کا اتفاق ہے کہ وزن سے کبھی ایسی جان کلام مین پڑجاتی ہے کہ اسکی نثر بنانے مین کلام قالب بے روح رہ جاتا ہے۔

تیسرے حصہ مین اُن شاعرون کا تذکرہ ہے جنکی نظمون کے ترجمے اس کتاب مین درج ہین ان تمام نظمون مین "اطمینان قلب کی تلاش" "گوشۂ تنہائی" "خوش نصیب کون ہے" "موت سب کو یکسان کردیتی ہے" انکے حقیقی جذبات اور مضامین بہت ہی اعلیٰ درجے کے ہین۔

رموز بیخودی یعنی حیات ملیہ اسلامیہ مصنفہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا۔ لاہور ہم نے اسکے ایک ایک شعر کو بنظر غور و تعمق پڑھا۔ پوری کتاب رموز و اسرار کا گنجینہ ہے ہم اس پر

کیا لکھین اسکے مصنّف کا نام خود اسکی خوبیون کا ضامن ہے۔

اِس مثنوی مین ملت اسلام کے حیات بخش اسرار کو بیان کر کے اُن تاریک راہون مین مشعل جلائی ہے جہان یہ چشمۂ حیات اسوقت نہان ہو رہا ہے اِس زمانہ مین اسی کی ضرورت ہے کہ کوئی شخص اس آگ کو جو ہماری بے التفاتیون کی وجہ سے اکھ مین دبی ہوئی ہے آہستہ سے پھونک دے تا کہ وہ پھر روشن ہو جائے اسلام کوئی جدید بات نہین چاہتا، بعضون نے نادانی سے کہئے یا خودغرضی جانئے اِسمین نئے نئے گُل کھلائے اور اُسکو بدعتہ حسنہ سمجھنے لگے، کسی گلشن کے اصلی درختون کو خزان سے مرجھایا ہوا دیکھکر اُنکی آبیاری کرنا اور اُنکی موجودہ خوبیون کو نمایان کرنا چاہئے نہ یہ کہ اُن درختون کے عوض دوسرے پودے لگانے کی کوشش کرنا اور وہ بھی اُس سرزمین کے جن سے ہم ناآشنا، ناواقف، بے بہرہ اور ہمارے مقاصد کے منافی۔ کسی آئینہ کا زنگ دور کرنے مین جو فائدہ اور صفائی مدنظر ہے اسپر نقش و نگار بنانے سے وہ بات کبھی حاصل نہین ہو سکتی غرض ڈاکٹر صاحب موصوف نے جو راستہ اختیار کیا وہ قابلِ ستایش اور قابلِ تقلید ہے؎

خلافِ پیغمبر کسے رہ گزید ۔۔۔ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اب ہم بعض مقام سے نمونے کے طور پر اِس مثنوی کے کچھ شعر پیش کرتے ہین جس سے ناظرین کو ڈاکٹر صاحب کی طلاقت لِسانی اور زورِ طبیعت کا اندازہ ہو سکیگا اور معلوم ہو جائیگا کہ عارف رومی کی مثنوی کا مطالعہ اور مرزا بیدل کے صوفیانہ طرز انشاد کا تتبع ایک طبع وقّاد کو کیسا روشن کر دیتا ہے چنانچہ مثنوی کی ابتدا مین اپنے متعلق تحریر فرماتے ہین۔ ناظرین اندازِ بیان کو ملاحظہ فرمائین خصوصاً تیسرے شعر کا مصرع ثانی داد طلب ہے؎

از سخن آئینہ سازم کردہ اند ۔۔۔ وز سکندر بے نیازم کردہ اند

بارِ احسان بر نتابد گردنم ۔۔۔ در گلستان غنچہ گردد دامنم

سخت کوشم مثلِ خنجر در جہان ۔۔۔ آب خود می گیرم از سنگِ گران

پردۂ زنگم شمیمے نیستم | صید ہر موج نسیمے نیستم
در شرار آباد ہستی اخگرم | خلعتے بخشند مرا خاکسترم

شعر چہارم کی بندش بھی ملاحظہ طلب ہے۔
پھر اسی کے ضمن مین لکھتے ہین ؎

اشکِ خود بر خویش میریزم چو شمع | با شبِ یلدا در آویزم چو شمع
جلوۂ را افزودم و خود کاستم | دیگران را محفلے آراستم

ان دونون شعرون کو مکرر پڑھئے اور لطف اُٹھائیے۔ اسکے بعد افراد و ملت کے اجتماع کی تعریف مین ایک شعر کہا ہے جو اس سے بڑھ کر جامع ہو نہین سکتا ؎

فرد و قوم آئینۂ یک دیگراند | ہم خیال و ہم نشین و ہمسراند

اختلاط افراد اور ضرورت نبی کے بیان مین لکھتے ہین ؎

مردمان خوگر بہ یک دیگر شوند | سفتہ در یک رشتہ چون گوہر شوند
تا خدا صاحبدلے پیدا کند | کو ز حرفے دفترے انشا کند
بند ہا از پا کشاید بندہ را | از خداوندان رہاید بندہ را
نکتۂ توحید باز آموزدش | رسم و آئین نیاز آموزدش

بیانِ توحید۔

در جہانِ کیف و کم گردید عقل | پے بمنزل بُرد از توحید عقل
ورنہ این بیچارہ را منزل کجاست | کشتیٔ ادراک را ساحل کجاست
دین ازو حکمت ازو آئین ازو | زور ازو قوت ازو تمکین ازو
چون مقامِ عبدہٗ محکم شود | کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود

مصرع آخر کو مکرر پڑھئے ؟

اسی توحید کے ضمن مین اتحاد و اتفاق کے متعلق لکھتے ہین ؎

ملت از یک رنگئی دلہاستے — روشن از یک جلوہ این سنیاستے

قوم را اندیشہ ہا باید یکے — در ضمیرش مدعا باید یکے

یاس و خوف کی مذمت مین لکھتے ہین ؎

مرگ را سامان ز قطع آرزوست — زندگانی محکم از لاتقنطوست

نا اُمیدی ہمچو گور افشاردت — گرچہ الوندی ز پا می آوردت

قوتِ ایمان حیات افزایدت — وردِ لا خوفٌ علیہم بایدت

بیم چون بند است اندر پاے ما — ورنہ صد سیل است در دریاے ما

نعت مین یہ اشعار بھی قابلِ حفظ ہین ؎

دینِ فطرت از نبی آموختیم — در رہِ حق مشعلے افروختیم

این گہر از بحرِ بے پایان اوست — ما کہ یک جانیم از احسان اوست

تا نہ این وحدت ز دستِ ما رود — ہستیِ ما با ابد ہمدم شود

رونق از ما محفلِ ایام را — او رسل را ختم و ما اقوام را

خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت — داد ما را آخرین جامے کہ داشت

قطع اخوت کی مذمت مین کہتے ہین ؎

مردمی اندر جہان افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

ذیل کے اشعار آئین و قوانین کی تعریف مین کیا خوب کہے ہین اور کیا اچھی تشبیہین تلاش کی ہین ؎

برگ گل شد چون ز آئین بستہ شد　　گل ز آئین بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبطِ صدا پیدا ستے　　چون پریشان شد صدا غوغاستے

در گلوے ما نفس موج ہواست　　چون ہوا پابند نے گردد نواست

مصنف نے سب سے زیادہ کمال یہ دکھایا ہے کہ آخر مین تمام مثنوی کا خلاصہ سورۂ اخلاص کی تفسیر مین بیان کر دیا ہے۔ اسمین بھی بعض بعض شعر چستی بندش اور جدتِ معانی کے لحاظ سے بے مثل کہے ہین۔ چنانچہ ایک مقام پر کہتے ہین ؎

گر باللہ الصمد دل بستۂ　　از حدِ اسباب بیرون جستۂ

گرچہ باشی مور وہم بے بال و پر　　حاجتِ پیشِ سلیمانے مبر

خود بخود گردد درِ میخانہ باز　　بر تہی پیمانگان بے نیاز

آخری شعر اگر سو بار بھی پڑھا جائے تو سیری نہین ہو سکتی۔ پھر اسی کے ضمن مین کہتے ہین ؎

بے نیازی ناز ہا دارد بسے　　ناز و انداز ہا دارد بسے

تا کجا طوفِ چراغ محفلے　　ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

اس آخری شعر کی تعریف نہین ہو سکتی استغنا کے متعلق اس سے زیادہ کوئی نہین لکھ سکتا۔ اسکی تقطیع بھی اتنی ہی خوبصورت اور چھوٹی ہے جتنی کہ اس مثنوی کی بحر ہے "جامہ باندازِ قامت" کا مصداق ہے، کاغذ نہایت اعلیٰ درجہ کا چکنا ولایتی ہے۔ اس مثنوی مین محاسن کے سوا ہمکو کوئی بات نظر نہین آئی۔ البتہ بعض قافیون کے متعلق ہمکو پس و پیش ہے لیکن مصنف نے اس قسم کے قافیہ کو بار بار کہہ کر اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اُنھون نے اسمین اجتہاد کیا ہے اور وہ اسکو عمداً کہتے ہین۔ ماہرین فن سے یہ بات پوشیدہ نہین ہے کہ فنِ شعر مین جو عیب جان بوجھکر رکھا جائے اسکا شمار عیب مین نہین ہوتا وہ شبہ یہ ہے کہ مضارع کی دال کو حرفِ روی قرار دیا ہے جیسے کُشد کا قافیہ تہدا و شود کا قافیہ خورد، جو ایطا بھی

جاتا ہی اس لیے کہ دونون جگہ دال مضارع کی ہی جس سے تکرار قافیہ بیک معنی ہوگئی - البتہ نہد کا قافیہ گرہید اور شود کا قافیہ رسود کیا جائے تو یہ نقص باقی نہین رہتا اس قسم کے دو چار شعر ہم یہان نقل کرتے ہین ؎

چون زخلوت خویش را بیرون کشد | پاے در ہنگامۂ جلوت نہد
عشق صید از زور بازو افگند | عقل مکارست و دامے می نہد
ناقوی از حکمت اشیا شود | ناتوان باج از توانایان خورد

ایک جگہ الف و نون فاعلی یا حالیہ کی تکرار ہوگئی ہے ؎

در سکوت نیم شب نالان بُدم | عالم اندر خواب و من گریان بُدم

بعض جگہ قافیون مین اقوا کو جائز رکھا ہے جو اختلاف توجیہ سے پیدا ہوتا ہے یعنی ماقبل ردی کی حرکت مین اختلاف، مثلاً ؎

زندہ فرد از ارتباط جان و تن | زندہ قوم از حفظ ناموس کُہن
از قبائے لالہ ہائے این چمن | پاک شست آلودگیہاے کُہن
ثابت و سیارۂ گردون وطن | آن خداوندان اقوام کہن
ربط ایام است مارا پیرہن | سوزنش حفظ روایات کہن

اشعار بالا مین حرف ردی کے ماقبل ایک جگہ مضموم ہے اور ایک جگہ مفتوح ہے یعنی فارسی مین لفظ کُہن بضم ہائے ہوز ہے بالفتح نہین ہے - جس طرح نظامی علیہ الرحمہ کہتے ہین ؎

بہ پُرسید کین چرمہاے کُہن | چہ پیرایہ را شاید از اصل و بُن

اُردو کہنے والے البتہ چمن و وطن کے ساتھ کہن کا قافیہ کرتے ہین -

مثنوی میگھ دوت
غربت شیدا (اسم تاریخی)

ہندوستان کے نامور قدیم شاعر کالی داس کی نظم "میگھ دوت" کو جناب ضمیم بربی نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے ہم بھی اِس سے لطف اندو

ہوئے اصل کتاب کو تو ہم نے پڑھا نہین اور نہ پڑھ سکتے ہین اس لئے کہ اس زبان سے ہم ناواقف ہین جس مین کالی داس اپنے انوکھے خیالات نظم کیا کرتے تھے لیکن اس ترجمہ کو دیکھکر ہندی شاعرانہ تخئیل کے ذوق سے ہم مست ہوئے بغیر رہ سکے گویا ترجمہ نے اس شراب کو دوآتشہ بنا دیا ہے کیونکہ ہندی کی تخئیل، اردو کی بندش ہونے پر سہاگا، اپنے ملک کی خصوصیات کچھ اور ہی تاثیر رکھتی ہین انکے مزہ سے ہم ناواقف، انکے کیف سے ہم باخبر۔

جن چیزون کو ہم نے دیکھا ہی نہین انکی تشبیہون کا دل پر کیا اثر ہوگا، ایران کی بلبل ہزار داستان کے نغمون کا ذکر سنکر ہم اس قدر خوش نہین ہو سکتے جس قدر ایک کوئل کی کوکو سے متاثر ہو سکتے ہین سنبل و سوسن اور نسرین و نسترن کے بیان سے ہمارا دل و دماغ اتنا تر و تازہ نہین ہو سکتا جتنا کہ چنپا چنبیلی کیسر مولسری کا ذکر سنکر ہو سکتا ہے ہم بعض بعض مقام سے کچھ شعر ناظرین کی تفریح طبع کے لئے درج کرتے ہین جس سے حسن تخئیل اور خوبی بندش دونون کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جنگل اور ندی کا کیا دلفریب سمان لفظون مین دکھایا ہے ؎

پھولون سے بہشت ہوگا سارا چمن ۔۔۔ انکی خوشبو سے مور ہون گے مگن
راہ اڑ اڑ کے وہ بتائین گے ۔۔۔ ناچ کر تجھ کو وہ رجھائین گے
بگلون کی جب قطار اڑیگی وہان ۔۔۔ کیا کہون ہائے تجھ سے مین وہ سمان
ہین وہان ارجن اور مولسری ۔۔۔ مست ہین بوئے خوش سے انکی سبھی
مورون کی کچھ عجب ادائین ہین ۔۔۔ دلکش ان کی مگر صدائین ہین
مور پھولے نہین سمائین گے ۔۔۔ ہونگے باہر وہ اپنے جامے سے
اپنی مادہ کو وہ رجھائین گے ۔۔۔ مست ہوکر ادھر وہ جائین گے
جب خمیدہ کرینگے اپنا تن ۔۔۔ دم سے لگ جائیگی وہین گردن

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے وہ جھونکے
کرم ارجن چنبیلی سے ہین بسے

محبوبون کی تعریف مین چند اشعار ہم مختلف مقامات سے نقل کرتے ہین ؎

وان جوان عورتین نہاتی ہین
اُبٹنہ کیسر کا وہ لگاتی ہین

کانون کی لوئین کند کی کلیان
کتنا پیارا دکھائینگی وہ سمان

پھول ہلکے ہین جو چنبیلی کے
ہین لڑی بنکے چوٹیون مین گندھے

پھولنے والے ہین کرم کے جو پھول
چشم مشتاق کو مزے ہین حصول

جب پپیہے کا وہ سنین گے شور
اور کم ہوگا بس دلون کا زور

پی کہان پی کہان کی رٹ سنکر
دونون ہاتھون سے تھام لینگے جگر

کانون مین گل، گلے مین چندن ہار
جو نہ چاہے اُنھین جنڈا کی مار

بالیان اُنکی موتیون سے بھری
گویا اپنے مقام پر ہین پڑی

کیتکی اور کمل کے پھولون سے
تازے تازے وہ ہار ہین گوندھے

پھولون کی بالیان ہین کانون مین
شور ہے اُن کا داستانون مین

بالون کو وہ سمیٹ کر اک بار
جوڑے باندھینگی وہ پری رخسار

نظر آئے گا بجلی کا جگنو
جھومنے مین وہ ہوگا زیب گلو

اِس پہ قوس قزح کی پھر ہیکل
دیکھنے والون کو نہ آئے کل

چھیڑنے سے ہوا کے آخر کار
سر کے گا آنچل اُنکا تھوڑا یار

اِس سبب سے عجب نہین دیکھین
گنگا جمنی گلون کی زنجیرین

لال کندرو کی طرح ہین وہ لب
دُر دندان ہین یا کہ صنعت رب

ترجمے کے سوا جہان جہان مصنف نے اپنے ذاتی خیالات ظاہر کیے ہین وہ بھی بلند ہین چنانچہ

دیباچہ اور ڈوساقی نامے اسکے شاہدِ عدل ہین -

لیکن اسکے ساتھ مصنّف کو ان کی رنگین بیانیون نے ایسا محو کر رکھا کہ بعض امو مین قواعد و اصُول فن شعر و محاورۂ زبان کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کر دیا - چنانچہ ان مین سے بھی بعض شعر ہدیۂ ناظرین کرتے ہین ؎

دل کش ہر ایک رنگ ہے اُس کا — خوشنما گُل سے سنگ ہے اُس کا

اِس شعر کے پہلے مصرع مین ہر ایک کی ہا تقطیع سے ساقط ہے ؎

چھوٹی چھوٹی ادھر اُدھر ندیان — کچھ نیا ہی دکھا رہی ہین سمان

جب چلے نربدا ندی سے تو — ہو مبارک سفر یہ اے خوشخو

اِس ندی کی بھی چال انوکھی ہے — کھا کے بل مست چال چلتی ہے

چلتی ہے زور سے ہوا جو شتاب — ہلتی ہے تہ ندی سے چادرِ آب

اِن تمام شعرون مین ندی بروزن بدی خلاف محاورہ ہے ؎

رنگت دیدنی ہے جنگل مین — اُجلا پیوند سیاہ کمبل مین

اسکے مصرع ثانی مین پیوند کی دال تقطیع سے ساقط ہوگی یا سیاہ کی یا ؎

یہ دھوان محلون کا جھروکون سے — پیچ کھا کھا کے باہر اُٹھتا ہے

جب چمکتے چمکتے برق تھکے — تجھ کو آرام بھی تو لازم ہے

جبکہ یہ تنگ و تار راہ ہو طے — پھر تو چاہے تجھے قرار ملے

چوٹیون کو چھپائے برف مین ہے — کیون کنول کا نہ پھول شرمائے

کیون نہ ہم رنگ ہو کے تجھ سے ملے — تیری تہ مین بھی تو سفیدی ہے

میری اُلفت کی آگ اگر بھڑکے — اُس کو لازم تجھے دبانا ہے

ان تمام اشعار مین "ہے" اور "سے" وغیرہ قافیہ غلط ہے اس لئے کہ یا کے قبل ایک جگہ مکسور ایک جگہ مفتوح بغیر حرفِ وصل صحیح نہین ہے اسی طرح اِس شعر مین ؎

سنگِ مرمر جڑا ہے صحنون مین — مانند جن کی چمک سے ہیرے ہین

مین اور ہین قافیہ صحیح نہین ہے ؎

سادہ دل لڑکیان جو ہین کنواری — باتین اُنکی تو ہوتی ہین پیاری

عورتین کنواری بوے خوش جیب پا ہین — للچا للچا کے کیا عجب ہے رہ جائین

پاک پانی ہے یون ہے وہ شفاف — کنواری کم سِن کا دل ہو جیسے صاف

ان اشعار مین کنواری بروزن فعلن موزون ہوا ہے، جو بروزن فعولن چاہئیے ؎

وہان پر باگ کا سمان ہوگا — گنگا جمنا کا رنگ عیان ہوگا

اسکے مصرع ثانی مین عیان کی عین تقطیع سے ساقط ہے ؎

بھاگنے کی کرین گے وہ کوشش — اُڑنے کی ہوگی اِک اُنھین کاہش

اِس شعر مین کوشش کا قافیہ کاہش غلط ہے ؎

ہے یہ پُر جوش موسم برسات — خوش ہین سب اپنی پیاریون کے سات

اور بھی اک مزے کی ہے یہ بات — زندہ دل ہے یہ موسم برسات

یاد ہین طور چشم و چتون کے — ہے مشابہ وہ آنکھ ہرنی سے

اشعار بالا مین موسم برسات اور چشم و چتون غلط ترکیبین ہین ایک فارسی اور ایک ہندی لفظ کے درمیان عطف و اضافت صحیح نہین ہے ؎

نخل کہنہ سے بیٹھ رگڑین گے — گرجنے کا جواب وہ دین گے

اسکے مصرع ثانی مین گرجنے کی (ر) ساکن ہو گئی ہے اگر (ر) کو متحرک پڑھین تو وزن جاتا ہے ؎

سانسین ٹھنڈی بھرے نہ کیونکر وہ   جو کلیجہ مسوسے بیٹھے ہو

وہ کے ساتھ ہو قافیہ نہ کرنا چاہیئے۔ ۵

آنکھین ہین لاکلام متعجب   چشم آہو پہ رنگ ہے غالب

جب ہو متوجہ تجھ سے وہ خوش رو   میری باتون کو کہہ گزرنا تو

ان دونون شعرون مین متعجب و متوجہ کی (ت) ساکن نظم ہوگئی ہے جو غلط ہے اگر اسکو متحرک پڑھین تو وزن جاتا ہے۔ ۵

تیری پتلی بھی وہ بناتا ہے   آنسوؤن سے اُسے نہلاتا ہے

نہلاتا، چلاتا کے وزن پر نہین، سمجھاتا کے وزن پر چاہیئے۔

تذکرۃ الحبیب مولفہ جناب مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے ڈائرکٹر تعلیمات بھوپال۔

اسکے متعلق صرف اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ "ذکر الحبیب حبیب" اسلام کے تہتر فرقون مین کوئی فرقہ ایسا نہ ہوگا جو اسکو محبت کی نظر سے نہ دیکھے۔ فائدہ کے لحاظ سے مسلمانون کے لئے تعلیم و تلقین کا اس سے بہتر کوئی رہنما نہین ہوسکتا جیسا کہ خود مولف نے تحریر فرمایا ہے۔

"صرف زبانی نصیحت پر عمل کرنا زیادہ شاق ہوتا ہے اگر وہی بات کسی واقعہ کے پیرایہ مین بیان کی جائے تو اُس پر عمل کرنا زیادہ آسان ہوجاتا ہے۔"

جناب مفتی صاحب کا یہ قول بھی گوش ہوش کا آویزہ بنانے کے قابل ہے۔

"کیا یہ غیرت کی بات نہین ہے کہ اسوۂ حسنہ نبوی کے ہوتے ہوے بھی ہم حسن معاشرت مین غیرون کے نمونون کو اپنا نصب العین بنائین۔"

یہ قول بالکل درست ہے جسکے اخلاق کی لوح طغرائے انک لعلی خلق عظیم کے عنوان سے مزین ہو اسکو چھوڑکر دوسرے کے اخلاق کو نمونے مین پیش کرنا آفتاب کے آگے مشعل جلانا اور ماہتاب کے روبرو آئینہ دکھانا ہے۔

ہم تمام مسلمانون کو اس تبرک کتاب کے پڑھنے کا مشورہ دیتے ہین ہر مسلمان کے گھر مین اسکی ایک جلد ضرور رہے۔

مآثر دکن

قومون کا عروج و زوال، حکومتون کا اُتار چڑھاؤ، مذہب کا زور، سیاست کا شور، ہر زمانہ مین مچا ہے اور ہر عہد مین رہا ہے، حکومتین ہر جائی رہین اور قومین اختلال مزاجی کی شکار، مذہب کی بھی پیداوار رہی اور سیاست کی بھی چیخ پکار، سلطنتون نے دولتین پانی کی طرح بہائین اور قومون نے اُس سیال فیاضی کے نتائج بھی چھوڑے، مذہب نے صراط مستقیم بھی دکھلائی اور پگڈنڈیون پر بھی بدحواس کیا، سیاست نے بام ترقی پر بھی پہنچایا اور قعر مذلت مین بھی گرایا۔ ہندستان نے اپنی طفلی کی نظرون، جوانی کی آنکھون اور اپنے بڑھاپے کی مضمحل بینائی سے وہ دیکھا جس سے طفلی بھی محروم رہی اور جوانی بھی۔

جب سے قومون نے تمدن کے زینہ پر قدم رکھا، ہر صدی کی سیڑھی نے نئے باب کا اضافہ کیا، دماغون نے نئی نئی باتین پیدا کین، تمدن نے نئی نئی سوجھائین تاریخ نے اپنی ابتدائی عمر سے ان سب باتون کو اپنے حافظہ دماغ مین محفوظ کیا جسکو ہم ایک دلچسپ افسانہ کہن، سمجھ رہے ہین، مگر جب نقد و بحث کا جھگڑا چھڑ جاتا ہے، جانچ پڑتال کی نوبت آجاتی ہے، چھان بین کی ضرورت پڑجاتی ہے تو سونے و پیتل کا امتیاز، کھرے کھوٹے کا فرق معلوم ہوجاتا ہے۔

حکومتون اور قومون کے ساتھ ساتھ مذہب و سیاست ایسی ناگزیر چیزین ہین جنکا اس طرح ساتھ ہے اور تعلق جس طرح چولی کو دامن سے اور روح کو جسم سے، یہ دونون چیزین تمام قومون پر یکسان صادق نہین آتین، ان مین دقیق تاویلین کیجا سکتی ہین، پھر ان مختلف زمانون کے مختلف واقعات کو تلاش کرنا پڑتا ہے جو پرانی تاریخون کے اوراق مین نظر تو آجاتے ہین مگر ان سے کوئی متفقہ نتیجہ نہین نکلتا۔

فنونِ لطیفہ مین، فنِ عمارت مذہب و سیاست سے بالکل مختلف اور اسکا اسٹانڈرڈ سب سے الگ ہے اسکی حد معین ہوتی ہے جس سے اسکی تفسیر بآسانی کیجا سکتی ہے۔ اینٹ و پتھر کی ٹھوس و مضبوط کتابین تمام دنیا کی کتابون سے زیادہ صاف و واضح اور قدرتی عینک سے ہر سیاح کو صاف نظر آجاتی ہین۔ اس کتاب کا ہر ورق دروغ بیانی سے پاک اور انکے مصنفون کی زبان تعلی و خودستائی سے ناواقف ہے۔ حجاز کا بیت اللہ، عراق کا طاق کسریٰ، شام کا بیت المقدس، مصر کے اہرام، اسپین کا قصر زہرا، قسطنطنیہ کا "جامع اباصوفیہ" رومتہ الکبریٰ کے گرجے، بابل کے کھنڈر، چین کی دیوار، ایران کا تخت ہوشنگ اور کوہ بے ستون، سانچی کے آثار اور راجپوتانہ کا "پشکر" کا مندر اور اس کے شکستہ در و دیوار، منہدم کھنڈرات، سیاح کے جذبات کو ابھارنے کے لئے کافی ہین، وہ انکے نقش و نگار، وضع و ساخت اور بلندی و پستی سے بانی کی سلیم المذاقی اور عادات و اطوار کی پاکیزگی کا بہتر اندازہ کرلیتا ہے۔ کسی قوم کے عادات و خصائل اور تمدن و معاشرت کو دیکھنا ہو، انکے مذہبی عقائد کا پتہ چلانا ہو تو اسکے مستحکم قلعون، خوبصورت محلون اور عبادت گاہون کو دیکھ لو، یہ نہ گمراہی کی طرف لیجاتے ہین اور نہ ادھر ادھر بھٹکنے دیتے ہین، ان سے زیادہ قومون کے خیالات و جذبات کا امین محافظ کوئی نہین ہو سکتا

ہندوستان مین جنوبی ہند کا ٹکڑا (حیدرآباد دکن) جہان سلطنتِ آصفیہ کا پرچم لہرا رہا ہے اور اس وقت ہندوستان مین مغلیہ سلطنت کی یادگار ہے۔ اس نے مرہٹون کی دھوتیان اور قطب شاہیون کے گھیردار جامے دیکھے، عادل شاہیون کے عدل نوشیروانی کو بھی دیکھا اور بہمنی گیسو دراز بزرگ کی زیارت بھی کی۔ گولکنڈہ پر اکنا و مادنا کی وزارت دیکھی اور عالمگیر کی فوج کشی بھی تانا شاہ کی نازک مزاجی اور نفاست پسندی کو بھی اس نے سنبھالا، چار مینار کو اپنے سینے پر نمایان کیا، مکہ مسجد مین نمازیون کو سربسجود دیکھا، عاشور خانہ مین شہید کربلا کا ماتم قطب شاہیون کے عقیدت مند ہاتھون سے دیکھا، حسینی علم اور بی بی کے آلاوہ کی مذہبی یادگار کو اب تک باقی رکھا، کالی

قبر کو حوادث روزگار سے محفوظ رکھتے ہوئے خوابیدہ بزرگ کو چونکنے کی بھی زحمت نہ دی، غرضکہ اس نے سب کچھ دیکھا اور اب بھی آصفیون کے شاہانہ جاہ و حشم کو مسرت سے دیکھ رہا ہے پچھلے زمانون کا بچا کھچا اب جو کچھ قلعون کی ہیئت مین کھنڈرون کی صورت مین اور محلون کے نقاب مین (آثار دکن) نظر آتے ہین۔ انکو مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی مددگار معتمد سکریٹری دولت آصفیہ نے "آثار دکن" کے صفحون پر اپنی صحیح تحقیق و تلاش کے بعد جمع کر کے زندہ کر دیا تاکہ ہند کے چارون گوشے ان آثار سے ناواقف نہ رہین۔

مولانائے بلگرامی اپنی نقش اوّل تصنیف "فلسفۂ ازدواج" کی بدولت اردو دان طبقہ سے تعارف کے محتاج نہین رہے ہین۔ "الناظر" و "ذخیرہ" مین آپکے کثرت سے مضامین مختلف مباحث پر شایع ہو چکے ہین، جن سے آپکے تاریخی و ادبی مذاق کا پتہ بخوبی چلتا ہے، گو آپ ملازمت کے قیود سے آزاد نہین ہین مگر اس پابندی کے باوجود "مذاق فطری" کو "عدالت و کوتوالی" کے "کاغذات جرائم" مین تحلیل کرنے کے لئے تیار نہین ہوتے اور سکوت و خاموشی سے اپنے منتخب کتب خانہ مین بیٹھکر علم و ادب پر احسان کرتے رہتے ہین۔ ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

کتاب اپنی لکھائی چھپائی کے اعتبار سے دیدہ زیب ہے جسکو آثار کی ۹۵ تصاویر نے دلچسپ و دلکش بنا دیا ہے، ۳۴۴ صفحہ کی ضخامت بھی ہے اور مجلد بھی۔ ان قیمتی اہتمام کے لحاظ سے چھ روپیہ، مذاق رکھنے والون کے لئے تو مطلق زیادہ نہین۔ مینیجر رسالہ "نمایش" کاچی گوڑہ، حیدرآباد دکن سے منگائیے اور دکن کے آثار سے دکن کی پچھلی حکومتون، بادشاہون کی شاہانہ عادتون کا اندازہ کر کے عبرت و بصیرت کے سبق لیجے۔ گو وہ نہ حکومتین رہین اور نہ انکے نام لیوا، مگر انکے کارنامے انکو ہمیشہ زندہ رکھین گے۔

(۷ دسمبر ۱۹۲۵ء۔ مطبوعہ ذوالقرنین بدایون۔ و سرفراز لکھنؤ)

ماتمِ آرزو

۴-جمادی الاول سنہ ۱۳۴۲ھ چہار شنبہ کے دن آفتاب کشمکش حیات کا نظارہ دیکھکر
جب ڈوبنے لگا، تو لیلائے شب بے چین ہو کر سر برہنہ ہوگئی، اور ردائے ماتم اوڑھ کر نوحہ خوانی مین مصروف!
رات کے گیارہ بج چکے تھے فضائے دکن سونے والی تھی۔ مُہرِ سکوتِ شب لگنے کو تھی۔ رزیڈنسی روڈ
کی وسیع سڑک پر تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے ایک آدھ آیند و روند نظر آجاتا تھا کہ یکایک
سناٹا ترقی کرنے اور چہل پہل کو "دورباش" کی آواز دینے لگا۔ ڈراؤنی رات نے حواس خمسہ
مین انتشار پیدا کر دیا نہ کھڑے رہنے کی طاقت رہی نہ قدم اُٹھانے کی ہمّت! اِس عالم مین متجسسانہ
نظرین جو دوڑتی ہین تو ماتمی لباس پہنے ہوئے لوگون کا ایک مجمع دکھائی دیتا ہے جو بلدۂ پولیس کے
مستعد سپاہی تھے۔ تعجب ہوا کہ الٰہی آدھی رات کے وقت یہ منتظم قافلہ کہان جا رہا ہے کہ اتنے مین بساطِ
دکن کے مُہرے بھی سوگوارون کی صورتین بنائے چپ چاپ میرے سامنے سے گذرنے لگے، بار بار
یہی خیال آتا تھا کہ میری نظر تو غلطی نہین کر رہی ہے، مگر نفسِ مطمئنہ ہشیار کر کے بیداری کی کیفیت
پیدا کرتا جاتا تھا اور دل سے اس کی تصدیق بھی کہ جو منظر آنکھون سے دیکھ رہے ہو وہ خواب نہین،
خیال نہین، کوئی بھولا ہوا افسانہ نہین بلکہ مشاہدہ اور عینی مشاہدہ ہے۔ سب سے آخر مین ایک غنچۂ
نوخیز کا جنازہ ملکۂ سبا کی سنت پر عمل کرتا ہوا دوشِ صبا پر چلا آرہا ہے۔ انسان کے واسطے اس سے
زیادہ عبرتناک سمان اور اس سے بڑھکر تلخ تجربہ اور اس سے زائد خطرناک امتحان کا وقت کیا ہو سکتا
ہے۔ مین بھی بڑھا اور مشایعت کے لئے تیار ہو گیا۔ ایک غمگین صورت نے میری حیرانی کو دور کیا

جنھون نے حقیقت حال کو آہ سرد بھر کر یون ظاہر کیا اور اضطراری کیفیت سے یون بولے کہ آہ ! گلستانِ آصفی کی ایک نوخیز کلی صرصرِ اجل کے ایک معمولی جھونکے سے مُرجھا گئی، ہم سب اُسی کے ماتم گسارون مین ہین "۔ اِس جگر خراش سانحہ سے سب کے دل ریش ریش ہین کنگ کوٹھی سے مکہ مسجد تک صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے۔

پیر فلک نے ایسے انگنت نظارے دیکھے ہین، لیکن آج جو اسکے اشکہاے غم کی جھڑی لگی ہوئی ہے اِس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اِس نے آج یاس و نامرادی اور ارمان و امید کی وہ خطرناک جنگ دیکھی ہے جس سے اکثر نوجوانون اور پُر ارمانون کو سابقہ پڑا ہے۔ اِس نے آج موت و حیات کی باہمی کشمکش کو دیکھا ہے، اِس نے آج روح و جسم کی مفارقت کے آخری اضطراب کا نظارہ کیا ہے اِس نے آج عالمِ احتضار کی تکلیف دہ غنودگی، ایڑیون کی ٹپک، حیات مستعار کے آخری وقت کا اضطرار، غرضکہ انسان کے آخری سفر کے تمام جگر خراش تماشے دیکھے ہین۔ آج شاہِ دکن کا دل غمگین اور آنکھین نم ہین۔ تمام رعایاے دکن سوگوار ہے۔ سب جزع و فزع کر رہے ہین، غنچۂ ناشگفتہ کو اجل کے بیداد گر ہاتھون نے توڑ ڈالا، وہ پُر ارمان اور محبوب تصویر جسکو بخت و دولت نے سلطنت کے گہوارے مین اندیادِ عمر و اقبال کی لوریان دے دے کر سلایا تھا قزاقِ اجل نے چھین لی۔ وہ پاک روح جو اِس عالمِ وجود مین سات آٹھ برس آغوشِ تمنا مین رہی، دامنِ دولت مین پلی، اور سایۂ ظلِ الٰہی مین بڑھی، عالمِ ملکوت و لاہوت کی سمت اُڑ گئی۔ تسبیحِ آصفی کا ایک خوبصورت دانہ گم ہوگیا، انسانی تلاش جس کا اب کھوج بھی نہین لگا سکتی، آصف جاہ سابع کی خفیہ پولیس کی اب قوت سُراغ مجروح ہے۔

صیادِ اجل کمین گاہ مین تھا۔ حورانِ بہشتی آغوشِ تمنا کھولے کھڑی تھین۔ رضوان نے آنکھین بچھا رکھی تھین، لیکن یہ سارا اہتمام، سارا تزک و احتشام اُس پاک و معصوم تصویر کے لئے تھا

جو ہم سے چھین لی گئی ہے۔ افسوس یہی موقع بے بسی اور یہی وقت امتحان کا ہے انسان اسی منزل پر تھک کر بیٹھ جاتا ہے وہ معذور رہتا ہے اِس کا نہ کوئی بس چل سکتا ہے اور نہ کوئی حاکمانہ قوت کام دے سکتی ہے کیونکہ کارخانۂ قدرت کا انتظام انسانی ضد، ہٹ، لالچ اور خواہش سے بے پروا ہے۔ لہذا ہم سب کو صبر اور شکر سے کام لے کر بارگاہ ایزدی میں دعا کرنی چاہیے کہ وہ اپنے عواطف و مراحم سے نعم البدل عطا فرمائے اور توفیق صبر و سکون دے۔ اِس حادثہ کو سُن کر میرا بھی قلب متاثر ہو گیا اور یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو گیا ؂

"پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے"
"حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے"

(۴۔ اپریل ۱۹۱۶ء)

عالمِ خیال کا چوتھا رُخ

حضرتِ شوق قدوائی کی مشہور و مقبول نظم "عالمِ خیال" کے چوتھے رُخ پر ریویو مجھ ایسا بے بضاعت لکھنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ حیران ہون کہ اس ارشاد کی تعمیل کس طرح کرون، عذر کرتا ہون تو مسموع نہ ہوگا۔ اقرار کر لیا تو اب کچھ بن نہین پڑتا، فرمائش صرف شوق صاحب ہی کی تنہا نہ تھی، بیگم صفدر علی کا بھی ارشاد تھا جسکی تعمیل میرے لئے ناگزیر تھی۔ اسکے دوسرے رخون پر آسمانِ ادب کے اور بھی درخشندہ تارے چمکتے ہوے نظر آئین گے، جن مین سے ایک مشیر حسین صاحب قدوائی اور دوسری بیگم صفدر علی ہین، حضرت مشیر جیسے سیاست کے میدان کے مرد ہین ویسے ہی لٹریچر کے اکھاڑے کے بھی پہلوان ہین اِن کا مذاق ادب مشرق و مغرب کا سنگم ہے۔

بیگم صاحبہ کی ادبیت و مذاق ادب نہایت ستھرا اور پاکیزہ ہے اور طبقۂ اناث کے لئے سرمایۂ نازش، اسکو خوش نصیبی کہنا چاہئے اور حسن اتفاق کہ اس طرح ان مالکان ادب کی تحریرون کے ساتھ میری انحل و بے جوڑ تحریر کو بھی دائمی مواصلت کا موقع مل گیا۔ بہرحال مین اپنی ناقابلیت پر افسوس، اور بے بضاعتی سے شکوہ کرتے ہوے اس محفل ادب مین ادب سے بیٹھنے کی جراُت کرتا ہون ع

رکھ لے مرے خدا تو مری بیکسی کی شرم

حضرتِ شوق سحر البیان ہین کہنہ مشق اور اُستاد اسیر کی یادگار ہین، نیچرل نظمین لکھنے پر قدرت اور اپنے مخصوص رنگ مین اپنی نظیر آپ ہین، جذباتِ انسانی کا فوٹو کھینچنے مین وہ جیسے بر دست

مشّاق ہین ویسے ہی قدرتی مناظر کی تصویر اُتارنے مین بھی ید طولیٰ رکھتے ہین، حُسنِ فطرت کی تصویر کشی حضرتِ شوقؔ کا حصہ ہے، جذباتِ اندرونی کا اظہار حضرتِ شوقؔ کا اُستادانہ کمال ہے حضرت شوقؔ کی زبان پر وہی ہوتا ہے جو دوسرے کے دل مین کھٹکتا ہے، حضرت شوقؔ نے انسانی باریک سے باریک تر جذبات کو بھی واضح طور سے دکھانے مین بڑی مشاقی سے کام لیا ہے، خیالات کی بہتات تو دیکھئے کہ کوئی مضمون ہو اس پر وہ اپنے خیالات کا غیر متناہی سلسلہ قائم کرتے چلے جاتے ہین، نہ کہین رُکتے ہین نہ کہین اٹکتے ہین، ایک چشمہ ہے جو اُبلتا، ایک دریا ہے جو بغیر کسی روک ٹوک کے بہتا چلا جاتا ہے۔

زلفِ یار کی پُر پیچ گلیون مین شوقؔ صاحب بھٹکے ہین مگر کم، دہنِ یار کی تنگی اور کمر کی معدومیت مین شوقؔ صاحب نے جستجو کی ہے مگر تھوڑی، اس قسم کے بھی نازک تشبیہات و استعارات سے انکی غزلین وغیرہ خالی نہین ہین مگر جذبات کشی انکا مذاق طبیعت ہے قدیم اصنافِ سخن مین جدید مذاق کا رنگ نہایت شوخی و رنگینی سے بھرتے ہین، اس مین اپنے دلکش طرزِ بیان کی افشان چھڑکتے ہین، جس سے نظم کو خوبصورت سے خوبصورت تر کر دیتے ہین اور جذبات کی زندہ تصویرون کو ابدی زندگی دے دیتے ہین۔

شوقؔ صاحب کی ہر نظم معلومات کا خزانہ ہوتی ہے، جس مضمون کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیتے ہین، اسے اپنا کر لیتے ہین اور اُس عروسِ فکر کو اپنے حسنِ معلومات کے زیور سے جلوہ گاہِ بیان مین چوتھی کی خوبصورت دُلہن بنا دیتے ہین، طرزِ جدید مین ایسی شانِ محبوبیت پیدا کر دیتے ہین جسکی دلکشی پر مٹنے کو جی چاہتا ہے۔

اِس چوتھے رُخ مین عورت شوہر کے وعدہ کی بنا پر اُسکے آنے کا بےچینی سے انتظار کر رہی ہے آنے والا دن اُسکے لئے سخت کرب و بےچینی کا ہے۔ انتظار کی حالت مین اپنے دل سے باتین کرتی ہے، عورت کی معمولی گفتگو ایک عالم کو بیقرار و مضطر بنا دیتی ہے، اور پھر ہمارے ہندوستان کی عورت جسکی فطرت

مین فاشعاری و محبّت پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہو، جب اُسکی طرف سے او اُسکی زبان سے گلے شکوون کے پھول برسین گے تو اُن پھولون کی بارش کیسی عطربیزی کریگی او کس قیامت کی ہوگی اور اس کے برداشت کی طاقت کس کے دل مین ہوگی۔

اِس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اہل ہند کی فطرت کے مطابق عشق و محبّت کا اظہار عورت کی طرف سے ہوا ہے یہی سبب ہے کہ شوق صاحب کے دل مین محبت کے پرُ اُمنگ بات بالکل سچے او صحیح پیدا ہوے ہین اور کیون نہ پیدا ہوتے شوق صاحب بھی تو ہند ہی کی خاک کے خمیر او ہندیون کے جذبات عشق و محبّت کے نبض شناس ہین پاکیزہ جذبات اُسی وقت پیدا ہوسکتے ہین جس وقت انکے پیدا کرنے مین اقتضائے فطرت سے مخالفت اور جنگ کی جائے۔

دوسری خوبی یہ بھی ہے کہ جنس لطیف اپنی دلپذیر زبان سے اپنے دل مین کسی کا تصوّر کرکے محبّت کے شکوے کر رہی ہے، ایسی پیاری ادا ہے جس پر اگر بے چین دل مٹنے کے لئے تیار ہو جائے اور اور اداؤن کا شیفتہ سر دھننے لگے تو انکی یہ از خود رفتگی تحسین و داد کی مستحق ہے اور خوش ذوقی کا تمغہ۔

تیسری خصوصیت زبان کی نرمی و نزاکت ہے تغزل کے لئے نرم و سادہ زبان کی ضرورت ہے، یہ ضرورت اگر پوری ہوگئی تو حسن بالائے حسن ہے اور زبان دانی کی سند، الفاظ کی صنعت گاری الفاظ کو باقی نہین رکھتی، شوق صاحب کی زبان ایک طرف تو بیگمات کی زبان سے لڑ رہی ہے، تو دوسری طرف فصحائے لکھنؤ کی زبان کا نمونہ دکھا رہی ہے۔

چوتھی خصوصیت اس نظم کی یہ ہے کہ ان چارون رخون مین عطف و اضافت فارسی سے مطلقاً کام نہین لیا گیا ہے اس مشکل قید کے ساتھ اردو مین نظم لکھنا اگر محال نہین تو دشوار ضرور ہے، شوق صاحب ہی ایسا کامل الفن ہو تو اس قید کی مصیبتون اور دشوارین کو کاٹ سکے اور نبھا سکے۔

نہ اس نظم مین نظر سے او جھل آسمان کی پیداوار کا ذکر ہے اور نہ اس مین ان لغو تعلقات کا اظہار

ہے، جن سے فطرت مضطرب ہوتی ہے اور پریشان، اس مین تو بدیہی واقعات وحالات سچے اور صاف تشبیہات و استعارات ایسے ہین جن کو سُننے کے بعد ذہن انسانی فوراً جادۂ فطرت کا راہرو بنجاتا ہے اسمین وہی اشارہ وکنایہ ہین وہی ناز وادا کی باتین ہین جو ماکے محسوسات اصلی و واقعی ہین ـ

یہ چوتھا رُخ جس پر قلم آزمائی کے لئے مین نے اپنے آپ کو زبردستی تیار کیا ہے، اسی رُخ پر قصہ کا خاتمہ ہوا ہے، اسی رُخ پر ایک شوہر پرست نے انتظار کی گھڑیان کامیابی سے کاٹی ہین یہی رُخ اِس محبت پرست کے خیالات گوناگون کا مرقع ہے، اِسی رُخ پر مردہ جذبات زندہ ہوئے ہین، اسی رُخ پر ایک کمہلایا ہوا چہرہ شگفتہ ہوا ہے، اِسی رخ نے چمپئی رنگ کو گل سوری بنایا ہے، اسی رُخ نے نوید مسرت پہنچائی ہے اسی رُخ نے بچھڑے ہوؤن کو ملایا ہے۔ اِسی رُخ نے دیرینہ تمنا کو پورا اور دبے ہوے ارمانون کو اُبھارا ہے، اِسی رُخ نے دل کو نشاط سے بانسون اُچھالا ہے، اسی رخ نے تکلیف کو راحت سے غم کو خوشی سے ہجر کو وصل سے انتظار کو کامیابی سے بدلا ہے، اسی رُخ نے ایک مفارقت کی ستائی ہوئی کو آغوش شوہر مین مصروف خواب کیا ہے اور فرط مسرت سے خوشی کا رونا رُلایا ہے، اِسی رخ نے مہاجرت کی کلفتون کو ایک ایک کرکے دور کیا ہے، غرض کہ اسی رخ نے مسرت و شادکامی کا مقفل دروازہ کھولا ہے اور اسی رُخ نے وہ سب آرزوئین پوری کردین جو ہجر کے بعد وصل مین پوری ہونی چاہئے تھین ـ

اتنی سطرین لکھ سکا تھا، اشعار پر ریویو کرنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی کہ حضرت شوق کی سحر حلال شاعری - گونڈہ کی سرزمین مین ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی جب وہ ہی نہ رہے تو مین بھی افسوس کرتا ہوا قلم کو روکتا ہون اور صرف "فاتحہ" پڑھکر اُنکی شاعرانہ روح کے سامنے ان سطرون کو پیش کرتا ہون

ع "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

شاخ نبات[1]

این ہمہ قند و شکر کز سخنم می ریزد

اجر صبریست کزان شاخ نباتم دادند (حافظ)

آٹھوین صدی ہجری کی "شاخ نبات" نے شیراز کی خاک پاک سے وہ نغمہ سرائے ازل (حافظؒ) پیدا کیا تھا جسکی زمزمہ سنجیون پر ایشیا اور یورپ دونون آج تک تحسین و عقیدت کے گلدستے نثار کر رہے ہین - یہ چمن آرا حسن و خوبی چند روز دنیا کو اپنی بہار دکھا کر سموم اجل کے ہاتھون نذر عدم ہو گیا مگر اِس شاعر کے بہار آفرین قلم نے جو زمین تخیل پر گلکاریان کین انکی رنگینیان آج تک تر و تازہ ہین - سات صدی کے بعد "شاخ نبات" نے "ثمرستانِ عبید" کے باغ مین آم کی صورت مین ظہور کر کے اُس زرین مقولہ کی تصدیق کر دی کہ:- ع

"تاریخ اپنے آپ کو دُہراتی ہے"

یعنی نخلبند قدرت نے دار الاقبال بھوپال کے دریا نوال شہزادہ (عالیجناب نواب محسن الملک حضور جنرل صاحب بہادر) مغفور کو اس مرکز شگفتگی (شاخ نبات) کی نشاۃ ثانیہ کا باعث بنا کر

[1] یہ سطرین مرحوم جنرل صاحب بہادر کی فرمایش کا نتیجہ ہین - بھوپال مین ایک بوٹے سے قد کا آم ہے جو وہان "ویٹر" (ایک پرند کا بھی نام ہے) کے نام سے مشہور ہے، ذائقہ سے نام بدمزہ ہی نہ تھا بلکہ ادب سوز بھی، ایک دن خان بہادر سید محمد ہادی صاحب پنشنر کلکٹر، سر اسرار حسن خان اور مین بھی "شملہ کوٹھی" (واقع بھوپال) کی بلند فضا مین حاضر تھے، اسی آم کے ذکر مین نام کی نامحوزنیت جنرل صاحب کے ستھرے مذاق پر بار ہوئی - ہر ایک نے اپنی اپنی ذہانت کا ثبوت دیا، آخر مین حافظؒ کی "شاخ نبات" نے اپنے قدرتی حسن سے تسخیر کر لیا - ہادی صاحب نے تو نظم کہ ڈالی، میری رسائی ان سطرون تک محدود رہی -

رعایا کے کام جان کو تازگی بخشی - اس حیاتِ ثانی مین "شاخ بنات" نے انسانی پیکر مین جلوہ نما ہونا پسند نہین کیا - ع

کا تارِ حُسن در گہر آدمی نماند

اِس مرتبہ اُس نگینیٔ مجسم نے ہندوستان جنت نشان کے باغ "ثمرستان عبید" کے کام مین ظہور کر کے اپنے اصلی نام کے ساتھ "اوتار" لیا ہے - اِس صدی کی "شاخ بنات" کیا ہے؟ چمن پیرایانِ ہستی کے لئے ساقی قدرت نے بادۂ روح افروز کا سر بمہر جام عنایت کیا ہے!

یہ "شاخ بنات" لکھنوٴ کے سپیدہ کو شرما دیگا، ملیح آباد کی دسہری سے فوقیت لیجائیگا - رامپور کے ثمر بہشت کی لطافت کو بُھلا دیگا، اِس "شاخ بنات" کا وجود پہاڑون کے دامن مین ہوا ہے، یہ شاخ بنات نواب محسن الملک کا محبوب و رپسندیدہ میوہ ہے اُنکے توجہات سے اسکی تروتازگی مین اضافہ ہورہا ہے، بڑھ رہا ہے اور اپنی اِس کمسنی مین جوانی کی بہارین دکھا رہا ہے اسکے بوٹا سا قد مین شیراز کے شاخ نبات کا تناسب ہے، وہ زینتِ آغوش تھی یہ راحت جان ہے اُس کا رخِ زیبا حضرتِ حافظ کا مرکز نظر تھا، اسکے لطف و شیرینی کا قدر شناس "محسن الملک" کا حُسنِ ذوق

تاریخ

فنِ تاریخ

ابتدائے آفرینش عالم سے اس وقت تک ملکون کے انقلابات مین انسان کی زندگی مین جو کچھ تغیرات ہوئے ہین اور اُن تغیرات کے اسباب و علل کی وجہ سے جس قسم کے واقعات و سوانحات کا ظہور ہوا ہے اُس مجموعہ کا نام "علم تاریخ" ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کو دُنیا مین آئے ہزارہا برس سے بھی زیادہ ہو گئے ہین، اس طول طویل مدت مین اس نے نہ معلوم کیا کیا کر ڈالا۔ تہذیب و شائستگی سیکھی۔ حکومت کی بنیاد ڈالی بڑی بڑی سلطنتین قایم کین۔ آپس مین لڑائی جھگڑے کئے علوم و فنون تحصیل کیا ضرورت کے موافق نئی نئی چیزین ایجاد کین۔ الغرض اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کے خطاب کا پورا مصداق بنا دیا۔ اس بنا پر علم تاریخ کو دو حصون پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) ایّام النّاس، یعنی وہ سلسلۂ واقعات جسمین مختلف اقوام، قبیلے، اور سلطنتون کے عروج و زوال کے واقعات و حوادث کا بیان ہو اسکو عرف عام مین "تاریخ" یا "ہسٹری" کہتے ہین۔

(۲) اسماء الرجال، اس مین کسی ملک یا قوم کے افراد کا ذکر کیا جاتا ہے اور اسکو انگریزی مین "لائف" اور یونانی مین "بیاگرفی" کہتے ہین، اس سے سلاطین و بزرگان دین اور بڑے بڑے ماہرین فن اور نامور لوگون کے متعلق ہمارے معلومات مین اضافہ ہوتا ہے، گذشتہ واقعات کا علم ہوتا رہتا ہے اور ہمارے اسلاف کے کارنامے ہر وقت پیش نظر رہتے ہین۔ تاریخ کا رجحان دُنیا کی تمام قومون مین پایا جاتا ہے۔ تہذیب و شائستگی کے زمانہ مین جو علوم و فنون پیدا ہوتے ہین، ان مین سے

اکثر ایسے ہوتے ہین جنکا ہیولیٰ پہلے سے موجود ہوتا ہے مگر تمدن کے زمانہ مین جب وہ ترتیب پاکر ایک موزون قالب اختیار کر لیتے ہین تو ایک خاص نام یا لقب سے مشہور ہوجاتے ہین، مثلاً اثبات و استدلال کے طریقے ہمیشہ سے موجود تھے اور ہر شخص اُن سے کام لیتا تھا لیکن ارسطاطالیس نے جب اِس کو تہذیب دیکر مدّن کیا تو وہ منطق کے نام سے مشہور ہوگیا اور پھر اِس نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی تاریخ و تراجم بھی اِسی قسم کا ایک فن ہے۔

دُنیا کی قومین خواہ وہ کیسی ہی جاہل کیون نہون تاریخی مادہ رکھتی تھین کیونکہ ہر انسان فخر و ترجیح کے موقعون پر اپنے اسلاف کے کارنامے بیان کرنا ضروری سمجھتا تھا اور اس مین اپنے اسلاف کی برتری خیال کرتا تھا کسی صحبت مین جہان چار آدمی جمع ہوگئے وہان گزشتہ لڑائیون اور معرکہ آرائیون کے تذکرے ضرور چھڑ جاتے تھے۔ باپ دادا کی تقلید ظاہر کرنے کے لئے پُرانے رسم و رواج کی یادگارین خواہ مخواہ قائم رکھی جاتی تھین یہی باتین آگے چل کر تاریخ و تراجم کا حقیقی سرمایہ بن گئین۔ اس بنا پر رُوم و یونان مصر و ایران عرب و ہندوستان چین و تاتار غرض دنیا کی تمام قومین فنِ تاریخ مین یکسان درجہ رکھتی ہین لیکن اِن باتون کو سلسلہ وار جمع کرنے کی بہت کم قومون نے توجہ کی اسی وجہ سے ابتدائے آفرینش عالم سے اِس وقت تک کوئی جامع و مانع تاریخ مدّن نہ ہوسکی ہر قوم نے اپنی اپنی ترقی کے زمانہ مین اپنے حالات جمع کئے جو کچھ تو آفات سماوی کے نذر ہوگئے اور کچھ قوم فاتح نے از راہ بغض و حسد مفتوح قوم کے کارنامون کو بھی سلطنتون کی طرح برباد کر ڈالا۔

تاریخ کے کوچہ مین سب سے پہلے چینیون نے قدم رکھا کیونکہ اُن مین تاریخ نویسی کا خیال زمانہ دراز سے چلا آتا ہے مگر تاریخ کے ضمن مین قصّہ کہانیون کو بھی اُنہون نے شامل کر لیا تھا، اِس لئے اُنکی تاریخ نویسی ناقص و کم وقعت ہوگئی، تاہم اُن کے یہان تاریخ کا ایک سرمایہ موجود ہے۔ اسکے بعد یونانیون کے زمانہ مین حکیم سقراط کے ایک شاگرد نے بہت محنت و جانکاہی سے ملکی حالات فراہم کئے۔ اسکے

تقریباً سو برس بعد ہیروڈوٹس پیدا ہوا اور اُس نے اس فن مین ایسی شہرت و ناموری حاصل کی کہ دُنیا اُسکو ابوالمورخین کے لقب سے پکارنے لگی - یونانیون کے بعد رومیون کا درجہ ہے جہان جولین ڈنیٹ لس گذرا ہے، اِس قدیم مورخ نے حضرت مسیح سے تقریباً ۹۰ برس پہلے تاریخ لکھی تھی ایران کا قدیم تاریخی لٹریچر مفقود ہے لیکن اس قوم مین تاریخ نویسی کا خیال ڈ آر مٹر نے پیدا کیا اور اِس نے بڑی کوشش و جانفشانی سے قدیم ایرانیون کی تاریخ لکھی مگر اس مین بھی تحقیق کی داد بہت کم دی گئی ہے ابن ندیم نے اپنی "کتاب الفہرس" مین پہلوی زبان کی بعض تاریخی کتب کے نام لکھے ہین جو ساسانیون کے اخیر زمانہ مین تصنیف ہوئی تھین - ان مین سے چند کتابون کے نام یہ ہین - خدائی نامہ شکسران، کارنامک، اردشیر بن بابکان، سیر الملوک الفرس وغیرہ، یہ تمام کتابین عجم کے حالات مین ہین اور خلفائے عباسیہ کے عہد مین ان سب کے تراجم ہو گئے -

عربون کی تاریخ نویسی ظہور اسلام کے بعد شروع ہوتی ہے علامہ ابن الندیم نے اپنی "کتاب الفہرس" مین ابتدائی زمانہ کی بہت سی تاریخی تصنیفات کا ذکر کیا ہے منجملہ اُنکے ایک "اخبار الملوک" ہے جسکو امیر معاویہ المتوفی ۶۰ھ نے بجیر بن شیرویہ سے لکھوایا تھا مصنف نے اسمین عرب و عجم کے مشہور تاریخی معرکے درج کئے ہین - اسکے بعد ہشام بن عبد الملک نے ۱۱۳ھ مین پہلوی زبان سے عربی مین ترجمہ کرایا، اسمین سلطنت عجم کے مفصل حالات ہین اور یہ پہلی کتاب تھی جو غیر زبان سے عربی مین ترجمہ کیگئی - اسکے بعد مسلمانون مین بڑے بڑے مورخ پیدا ہوئے، مثلاً ابن ہشام، ابن سعد، طبری، ابن اثیر، ابن خلکان، ابو الفدا، اور ابن خلدون وغیرہ، یہ سب بڑے پایہ کے مورخ گزرے ہین اور انکی تاریخی تصنیفات عرب اسلام کے متعلق نہایت معتبر و قابل سند مانی گئی ہین

اگر ابتدائے آفرینش عالم سے ابتک تاریخی حالات مرتب ہوتے تو شاید روئے زمین اس بار گران کی متحمل نہ ہوسکتی جس طرح کہ دُنیا مین ہر روز لاکھون مرتے ہین اور انکی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہین اسی

طرح ہر قوم کے علمی کارنامے بھی اسکی تباہی کے ساتھ ساتھ قریبًا فنا ہوجاتے ہین اور اسکی قائم مقام قوم کو اسکا بچا کچھا ذخیرہ ہاتھ آجاتا ہے مگر قوم عرب نے دُنیا مین بہت جلد ترقی کی اور بہت سے شعبہ ہائے علمیہ مین کمال حاصل کرلیا لیکن آج ہم قاصر ہین کہ ابتدا سے انتہا تک اسکی ترقیون کا تفصیلی تذکرہ کرسکین اُندلس مین عربون نے جو عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی اور جو جو اُنہون نے کمال پیدا کیے تھے آج ہم انکی تفصیل بحوالہ کتب تاریخ بتانے سے معذور ہین اور تاریخ اندلس کا موجودہ ذخیرہ اسکی عظیم الشان ترقیون کے مقابلہ مین نہایت مختصر اور مبہم ہے۔ علم تاریخ کی حالت بیان کرنے کے بعد مانہ کے اعتبار سے تاریخ ہندوستان کی تاریخ باعتبار مرور زمانہ تین حصون پر تقسیم کی جاسکتی ہے۔

(۱) عہدِ ہنود (۲) عہد اسلام۔ (۳) عہد انگلشیہ۔

ہندوؤن کی تاریخ ۲۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۲۰۰ء تک تقریبًا تین ہزار برس پر پھیلی ہوئی ہے عام خیال یہ ہے کہ اس طول طویل مدت مین جو کچھ واقعات و سوانحات گزرے ہین بظاہر انکو ہندوؤن نے لکھنے کی کبھی کوشش نہین کی کیونکہ اگر انھین تاریخ نگاری سے ویسی ہی دلچسپی ہوتی جیسی کہ عربون کو تھی تو انکی کوئی نہ کوئی مسلسل و مکمل تاریخ دُنیا مین ضرور موجود ہوتی۔ زمانۂ حال مین اس اعتراض کو رفع کرنے کی اس جواب سے کوشش کی گئی ہے کہ مسلمان حملہ آورون نے کتب خانہ اسکندریہ کی طرح ہندوؤن کی تمام علمی کتابون کو جلادیا جسکے ساتھ تاریخ کا بیش قیمت ذخیرہ بھی تلف ہوگیا مگر ظاہر ہے کہ یہ الزام ایسا ہی بے سر و پا ہے جیسا کہ کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق اتہام ہے۔ ہندؤن کا تاریخی ذخیرہ خواہ مسلمانون کی حملہ آوریون کی وجہ سے تلف ہوا ہو یا کسی اور وجہ سے لیکن اس وقت دنیا مین موجود نہین ہے۔ اس سے کسی شخص کو انکار نہین ہوسکتا کہ قدیم ہندوؤن کو ہر قسم کے علوم و فنون مین کافی مہارت حاصل تھی۔ صنعت و حرفت، دستکاری، معماری، سنگ تراشی، شاعری، موسیقی اور ریاضیات وغیرہ مین یہ لوگ ید طولےٰ رکھتے تھے۔ ایسی حالت مین یہ کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ تاریخ نگاری سے یہ لوگ نابلد تھے اور خصوصًا

ایسی حالت مین جبکہ انکی بعض تاریخی تصنیفات جو زمانہ کی دست بُرد سے بچ گئی ہین اس وقت موجود ہین منجملہ انکے "راج ترنگی" ایک مشہور و معروف کتاب ہے جسمین کشمیر کے حالات ابتدا سے مسلسل درج ہین

قرون وسطیٰ سے تاریخ نویسی کا یہ دستور چلا آتا ہے کہ جب کسی قوم یا سلطنت کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو اسمین اوّل سے آخر تک اسکے تمام وکمال حالات درج کر دئیے جاتے ہین برخلاف اسکے ہندو ایک بادشاہ یا مختلف چند بادشاہون کے حالات قلمبند کر لیا کرتے تھے اور بعض اوقات مذہبی کتابون مین راجاؤن اور سلطنتون کا ذکر بھی ضمناً درج کر دیا جاتا تھا۔ اسی قبیل سے "اٹھارہ پُران" بھی ہین جنکو مسیحی صدیون کے اوائل ایام مین برہمنون نے تصنیف کیا ہے اور ان "پُرانون" مین بہت سا تاریخی ذخیرہ محفوظ ہے اور مذہبی مضامین کے علاوہ بادشاہون کے نسب نامے اور بعض تاریخی واقعات کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ بابو نند لال دے سنسکرت زبان کے ایک عالم ہین انہون نے اپنی کتاب "سویلزیشن ان انشیئنٹ انڈیا" (Civilisation Ancient India) مین مذہب وفلسفہ کا ذکر کرتے ہوے ایک موقع پر لکھا ہے کہ :۔

"علاوہ مہابھارت اور رامائن کے ہندوستان کی بہت بڑی وقعت اور اہمیت رکھنے والی دوسری بھی کتابین ہین جسمین ہندؤن کے مشہور فرمانروا خاندانون، سورج بنسی اور چندر بنسی راجاؤن اور انکی معرکہ آرائیون کا مفصل تذکرہ ہے علاوہ ازین اس قسم کی بہت سی کتابین سنسکرت لٹریچر مین پائی جاتی ہین، جن مین قدیم تاریخ وجغرافیہ کا متفرق حصہ محفوظ ہے جنکو بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے اگر انکے مفصل حالات سے باخبر ہونے کا شوق ہو تو پروفیسر میکس مولر کی بے نظیر کتاب "سنسکرت لٹریچر" کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ مسلمانون کا عہد ۹۶۲ء سے شروع ہو کر گزشتہ صدی کے نصف اول پر ختم ہو جاتا ہے، اس اعتبار سے مسلمانون کی حکومت ہندوستان مین تقریباً نو سو برس قائم رہی۔ اس کثیر مدت مین بہت سے غیر معمولی واقعات و حوادث گزرے ہین اور ان اولوالعزم سلاطین نے ہزارون نمایان کارنامے انجام دئیے

ہین جنکو بہت سے مورخین نے قلمبند کیا ہے۔ ہندوؤن کے برخلاف مسلمانون نے اپنے حالات مسلسل قلمبند کئے اور ہر ملک و قوم اور سلطنت کے سوانحات کو علیحدہ علیحدہ مرتب کیا جسکی وجہ سے ان نو صدیون کے ہندوستان کے حالات آئینہ ہو گئے اور ہر قسم کے واقعات کا ایک مستقل ذخیرہ فراہم ہو گیا

پروفیسر لیتھبرج نے اپنی مقبول عام تاریخ ہند مین مسلمانون کا تذکرہ کرتے ہوے لکھا ہے کہ:-

"اب ہم تاریخ ہند کے اُس زمانہ مین پہنچے ہین جس مین مسلمانون نے ہند پر حملہ کر کے اسکو فتح کرنا شروع کیا، اِس زمانہ سے تاریخ برابر مفصّل و واضح پائی جاتی ہے کیونکہ مسلمانون کو علم تاریخ کا ہمیشہ سے شوق رہا ہے اور ہر عہد مین اُن مین کوئی نہ کوئی شخص نکل آتا تھا جو اپنے زمانہ کے واقعات کو قلمبند کر کے تاریخ کا سلسلہ قائم رکھتا تھا"

اِسی مورخ نے اسلامی لٹریچر کا ذکر کرتے ہوے ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ"

"ہند کی تصنیفات مین مسلمانون کے حملہ کے بعد ایک عجیب تغیر و تبدل دیکھنے مین آتا ہے یعنی اس سے پہلے تو ہند مین کتب تاریخ کا نام و نشان بھی نہ تھا مگر مسلمانون کے حملہ کے بعد نہایت عمدہ عمدہ تاریخ کی کتابین کثرت سے تصنیف ہو گئین- فی الحقیقت کتب تاریخ کی تصنیف کا شوق مسلمانون کو اہل عرب سے ملا تھا اور اہل عرب کی یہ کیفیت تھی کہ جس وقت یورپ کا زمانہ جہالت و تاریکی کی اُفق سے نکلکر اپنی نورانی شعاعین دنیا کے ہر حصہ مین ڈال رہا تھا اُسوقت خصوصیت سے یہی قوم علم کی تلاش و تحقیق مین ہمہ تن سرگرم تھی اور یہی وجہ ہے جو علم و ادب کی بہترین کتابین اس سے بہت پہلے عرب مین لکھی جا چکی تھین غرض ہند کے فارسی علم و ادب کو عرب کے چشمہ علم و فضل سے بہت بڑا فیض پہونچا"

ہندوستان کے وہ مسلمان مورخین جو دور اوّل مین گزرے ہین تاریخ نگاری کے بجاے سیرت نویسی کیا کرتے تھے اور ہر ایک شخص اپنے معاصر بادشاہون کے حالات لکھنے پر اکتفا کرتا تھا، یہ طریقہ چار پانچ صدیون تک قائم رہا سلطنتِ مغلیہ کے ابتدائی زمانہ مین بعض مورخین ایسے پیدا ہوئے جنھون نے

ہندوستان کی عام تاریخیں لکھنا شروع کیں اور اس میں اُن تمام خاندانوں کے حالات جمع کر دیئے جو مختلف اوقات میں ہندوستان پر برسرِحکومت رہے ہیں۔ پھر یہ روش عام ہوگئی اور مغلیہ عہد کے طفیل میں بہت سی کتابیں مرتب ہوگئیں۔

سر جان ایلیٹ نے اپنی بینظیر تاریخ ہندوستان کے ضمیمے میں مسلمانوں کی لکھی ہوئی تاریخوں میں ایک مفصل فہرست درج کی ہے جنکی تعداد ہزار آٹھ سو سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان میں اکثر تصنیفات خاص اہمیت رکھنے والی ہیں اور اس موقع پر اگر انکا تذکرہ کیا جائے تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

سلطان محمود کے زمانہ میں عتبی نے تاریخ یمینی لکھی اور اس میں امیر سبکتگین اور اُسکے نامی گرامی فرزند محمود کے حالات قلمبند کئے۔ مسعود کے حکم سے ابوالفضل بیہقی نے تاریخ ناصری تصنیف کی اور اسمیں سلاطین غزنویہ کے مفصل حالات درج کئے۔ فتح دہلی کے بعد حسن نظامی ایک مورخ گزرا ہے جس نے شہاب الدین غوری، قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کے سوانحات قلمبند کئے اور فتح ہندوستان کے واقعات کو شرح و بسط سے لکھا اور اُسکا نام "تاج المآثر" رکھا۔ ایک مدت کے بعد ناصرالدین طغرل خان کی سرپرستی میں قاضی منہاج الدین جرجانی نے "طبقات ناصری" لکھی اور اسمیں غیاث الدین بلبن کی تختنشینی تک سلاطین افاغنہ کے تمام و کمال واقعات منضبط کر دے۔ اسکے کچھ عرصہ کے بعد قاضی ضیاء الدین برنی نے تاریخ "فیروز شاہی" تصنیف کی اور اسمیں خلجیوں کی ابتدا سے تغلق کی تختنشینی تک ہندوستان کے مفصل واقعات تحریر کئے۔ پھر شمس الدین نے اسکا تکملہ کیا جسمیں فیروز شاہ کے مفصل حالات درج ہیں۔ اسکے بعد کچھ عرصہ کے لئے تاریخی تصنیفات کا سلسلہ بند رہا، یہاں تک کہ سوری خاندان کا زمانہ آیا۔ اسکے عہد میں نعمت اللہ نے واقعات کی تاریخ لکھی اور اس میں ہندوستان کے بہت سے سلاطین کا تذکرہ کر دیا۔ اسکے بعد مغلوں کا دور شروع ہوا۔ انکے زمانہ میں ہندوستان کی عام تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ سب سے پہلے ملا نظام الدین بخشی نے

"طبقات اکبری" لکھی اور اسمین ہندوستان کے تمام فرمانروا خاندانون کے حالات فراہم کئے
اسکے بعد مشہور و معروف مؤرخ محمد قاسم فرشتہ کا ظہور ہوا جس نے "طبقات اکبری" کو پیش نظر رکھکر
اپنی بینظیر تاریخ لکھی اور اپنے آقا ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور کے نام پر اسکا نام "گلشن ابراہیمی"
رکھا۔ "طبقات اکبری" اور تاریخ فرشتہ مین مسلمانون کی ابتدائی حکومت سے شہنشاہ اکبر کے زمانہ تک
ہندوستان کی مفصّل تاریخ درج ہے ان دونون کتابون کے بعد جو تاریخین لکھی گئی ہین وہ ضمیمون کی
حیثیت رکھتی ہین بعد کی تصنیفات مین معتمد خان کا "اقبال نامۂ جہانگیری" محمد بن صالح کی
"عمل صالح" معتمد خان کی "مآثر عالمگیری" اور نواب شہنواز خان کی "مآثر الامرا" قابلِ ذکر تصانیف ہین۔
اسکے بعد مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور یہ عظیم الشان سلطنت تباہی کے دریا مین غوطے
کھانے لگی اُس پُرآشوب زمانہ کے حالات بھی دُوسرے مؤرخون نے نہایت تفصیل سے قلمبند کئے ہین،
جن مین سب سے پہلا محمد ہاشم خانخانان ہے جو نظام الملک آصفجاہ کا وزیر اعظم تھا۔ اِس نے اپنی تاریخ
کے اخیر اجزا مین عالمگیر کے عہد سے لیکر محمد شاہ کے زمانہ تک تمام خانہ جنگیون کا حال درج کیا ہے۔ اسکے بعد
غلام حسین خان طباطبائی نے ایک کتاب "سیرۃ المتاخرین" لکھی جسمین معظم شاہ کی تخت نشینی سے
اٹھارہوین صدی کے اخیر زمانہ تک مفصّل واقعات لکھدیئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مغلیہ سلطنت بالکل تباہ ہو چکی
تھی اور مغل بادشاہ تختِ دہلی پر برائے نام حکومت کر رہے تھے اُنکی حکومت صرف قلعۂ دہلی کی چاردیواری
مین محدود تھی، اور ہندوستان پر انگریزی سلطنت کا تسلّط ہو چکا تھا۔
عہد جدید مین شمس العلما مولانا ذکاء اللہ کی "تاریخ ہندوستان" اور نواب دولت یار جنگ بہادر
کی کتاب "تزکِ تازانِ ہند" لائق ذکر تصانیف ہین۔
ڈاکٹر گستاؤلی بان فرانسیسی محقق کی کتاب "تمدن ہند" ہندوستان کے دریاؤن پہاڑون
تمدّن و معاشرت، رسوم و رواج، مذہب و ملت، صورت و شکل، اور ذہانت و طباعی پر پورے طور

سے حاوی ہے۔ اِس مین تاریخ بھی ہے اورجغرافیہ بھی ہزار برس پہلے کا ہندی تمدن بھی ہے اور
اسلامی عہد کے برکات بھی اور انگلیشیہ عہد کے ترقیات بھی' اور اب تو ہندوستان کی تاریخین انگریزی
مین بھی ہین اور اُردو مین بھی ہندی مین بھی ہین اور بنگالی مین بھی مرہٹی و تلنگی زبانین بھی
ہندوستان کا قدیم راگ گا رہی ہین۔ صوبون صوبون کی بھی تاریخین علیحدہ علیحدہ مرتب ہو چکی ہین
اور مشہور مقامات کے تاریخی حالات تو شرح بسط سے قلمبند کر دیئے گئے ہین۔

انسانی زندگی کے لئے تاریخ ایک ایسا ضروری فن ہے جو قومون کو بیدار کر کے ملکون کو
سنوار دیتا ہے اس سے دلچسپی ہر شخص کے لئے لازمی ہے بغیر اسکے انسان ناکمل رہتا ہے اور
کمسن بچہ کا مصداق۔ انسانی دماغ کی تکمیل' پچھلے واقعات و حالات ہی سے ہو سکتی ہے جبتک
تاریخ سے خزانۂ قطری بھرا نہ ہوگا' انسانی حکومت کمزور رہیگی اور سوسائٹی مین افلاس کا نوحہ پڑھیگی

(۱۶ مئی ۱۹۱۵ء مطبوعۂ رسالہ "تاج")

ابونصر فارابی

جن مشاہیر کو مرے ہوے صدیان گزر چکی ہین اُنکے تذکرون مین عبرت و بصیرت کی ایک دُنیا آباد ہوتی ہے، کسی باکمال کے زندۂ جاوید ہونے کا یہی تو ایک معجزہ ہے کہ لوگ اُسکو یاد رکھین اور اُسکی یاد سے اپنے خیالات کی اصلاح کرتے رہین۔ فلسفہ کا معلّم ثانی، لیکن اہلِ اسلام کا معلّم اوّل (ابو نصر فارابی) اُنھین لوگون مین سے ایک ہے جو زندہ ہے اور دُنیا مین جبتک اُسکے دماغی افکار باقی ہین زندہ ہیگا۔ فارابی نے معلّم ثانی کا خطاب اپنی قابلیت کو منوا کر اور اپنی فلسفیانہ علمیت کا سکہ بٹھا کر یون حاصل کیا کہ فلسفۂ یونان کی بیشمار تصنیفات خلفائے عباسیہ کی بدولت عربی مین ترجمہ ہو چکی تھین لیکن اکثر ترجمے ناقص تھے اور باہم مختلف، نوح بن نصر (جو خاندانِ سامانیہ کا تاجدار تھا) نے فارابی کو بُلا کر فرمایش کی کہ ان تراجم کو سامنے رکھکر ایک صحیح اور جامع ترجمہ کر دے، فارابی نے اِس فرمایش کی تعمیل کر کے کتاب کا نام "تعلیم الثانی" رکھا۔ اِس واقعہ کو تاریخی حیثیت سے یاد رکھنا چاہیے کہ حکمائے اسلام مین فارابی نے معلّم ثانی کا خطاب اسی کتاب کی بدولت حاصل کیا تھا، افسوس ہے وہ کتبخانہ جسمین اِس کتاب کا اصل مسودہ فارابی کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جل کر خاک ہو گیا۔

اسلام کی تیسری صدی (سنہ ۲۶۰ھ) مین یہ "معلّم ثانی" پیدا ہوتا ہے، نسل کے اعتبار سے فارسی (ترکی) تھا، اسکی کنیت ابو نصر اور نام محمد بن طرخان بن اوزلغ تھا، فاراب اس کا آبائی وطن تھا اسکی پیدایش اُس زمانہ مین ہوئی تھی جبکہ فنِ تاریخ نے گہوارے سے پاؤن نکالنا شروع کیے تھے اِس لئے نہ صرف ابو نصر بلکہ اکثر زبردست عالمون حکیمون کے ابتدائی حالات سے تاریخ ساکت ہے اسکا

باپ ایک فوجی عہدہ دار تھا، اسکا لحاظ کرکے ابونصر کی ابتدائی تعلیم و تربیت جس قسم کی ہوئی ہوگی وہ ایک سپاہی کے لڑکے کی حیثیت سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اور پھر اُس زمانہ مین جب کہ سپہ گری اور شمشیر زنی ہر شخص کی معیشت کا ایک جزو خاص تھا، اِس سے واقفیت ہر شخص کے لئے لازمی تھی اِس نے اسکو بھی سیکھا ہوگا، مگر فطرت کو آگے چل کر اُسکو "معلّم ثانی" بنانا تھا۔ آبائی پیشہ سے دل لگاتا تو کیونکر، پھر خدا نے غیر معمولی دماغ اور ذہن رسا کا حافظہ عطا فرمایا تھا جنکو تیر و تفنگ سے کیا تعلق ہو سکتا ہے اُس نے مادری زبان کے علاوہ دوسری زبانون کو بھی سیکھا اور پوری دستگاہ حاصل کرلی۔ عربی نہ اُسکے شہر کی درسی زبان تھی اور نہ مادری، اِس لئے اسکی تحصیل سے اُس وقت معذور رہا، مگر اِس نے اِس ضروری کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کرلیا۔

ابن خلکان نے لکھا ہے کہ "فارابی" فلاسفہ مین اپنا جواب نہین رکھتا تھا اور جن جن علوم و فنون سے اُسکا دل و دماغ بہرہ اندوز تھا اُن مین کوئی شخص اُسکے مدمقابل نہ تھا۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا نے بھی اپنی تصنیفات مین اسی کی کتابون کا تتبع کیا ہے اور اسی کے اقوال سے مستفید ہوا، علم کے شوق نے اسکو گھر سے نکالا۔ فاراب سے نکلکر مختلف شہرون مین سیاحی کرتا اور ہر جگہ کے واقعات و حالات، رسوم و رواج اور طرز معاشرت سے واقفیت پیدا کرتا ہوا بغداد پہنچا جو اُس وقت ایشیا مین علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا اور جہان کی علمی شعاعین دور دور پھیلی ہوئی تھین بغداد کے شاہی دربار علما، فضلا کی عالمانہ مسندین ایک امتیازی شان پیدا کئے ہوئے تھین، فارابی نے وہین عربی کی تحصیل شروع کردی، اوقات بسری کے لئے ایک معمولی سی ملازمت کرلی کوئی کہتا ہے کہ محافظ کی خدمت پر تھا، اور کوئی باغبان بتاتا ہے خیر جو کچھ بھی ہو مگر وہ اتون کو عربی علم ادب اور زباندانی کی کتابون کے مطالعہ مین دن کی فکر دن کو رات کی تاریکی مین تحلیل کردیتا۔ معاش کی قلت ایک چراغ کے لئے تیل بھی مہیا نہ کرسکتی تھی، مگر چوکیدارون کی قندیلین اُسکے ظلمت خانہ تہیدستی کا چراغ تھین جسکے

سہارے سے تمام تمام رات پڑھنے پر مستعد رہتا عربی کی تحصیل مین اُس نے ایسی ایسی ریاضتین اور کوششین کین کہ تھوڑے دنون کی لگاتار محنت نے اِس نے عربی کو اپنی مادری زبان بنالیا۔ اسکے بعد منطق کی طرف متوجہ ہوا اور حکیم ابوبشر متی بن یونس سے منطق کا درس لینے لگا۔ ابوبشر کے حلقہ درس مین بڑے بڑے قابل طالبعلمون کی شرکت ہوتی تھی طریقہ تعلیم یہ تھا کہ ارسطو کی منطق کی کتابون کو ابوبشر پہلے پڑھ کر انکی شرح[1] اپنی زبان سے شاگردون کو لکھوا دیتا۔ منطق مین ابوبشر کی برابری کا دعویٰ اِس زمانہ مین کوئی دوسرا نہ کرسکتا تھا۔ تالیفات مین حُسن عبارت اور لطف اشارات کو نظر رکھتا تھا اور اس مین خوب شرح وبسط سے کام لیتا تھا۔ ابوبشر کی تقریر عالمانہ اور نہایت برجستہ وشستہ ہوتی تھی اہم سے اہم علمی مسائل کو وہ ایسے سہل ممتنع طریقہ سے حل کردیتا تھا کہ پڑھنے اور سُننے والے حیران وششدر رہ جاتے تھے اور اسکی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کی داد دیئے بغیر نہ رہتے تھے اسی لئے اس فن کے علماء کا اس بات پر اجتماع ہے کہ ابونصر فارابی جو دقیق معانی ومطالب کو سہل الفاظ اور آسان وسلیس عبارت مین سمجھا دیتا ہے۔ یہ حکیم ابوبشر کا فیضان ہے۔ فارابی نے بغداد ہی مین علوم فلسفہ کو بھی پڑھا اور ارسطو کی تمام کتابون کو جمع کیا چنانچہ ان کتابون پر خاص فارابی کے قلم سے لکھا ہوا تھا کہ مین نے ان کتابون کو دو دو سو مرتبہ پڑھا ہے نیز اسی کا قول ہے کہ مین نے ارسطو کی کتاب (سماع طبعی) کا چالیس مرتبہ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور میری رائے مین ابھی اسکے مکرر مطالعہ کا محتاج ہون کسی نے فارابی سے پوچھا کہ اس فن کا سب سے بڑھ کر کون ماہر ہے تم یا ارسطو' اُس نے کہا کہ "اگر مین ارسطو کا زمانہ پاتا تو اُسکے شاگردون مین خاص امتیاز رکھتا۔

فلسفہ کے متعلق ابونصر کا یہ قول ہے کہ فلسفہ یونانی لفظ فلاسفی کا معرب ہے۔ کلمہ فلاسفی "فیلا" اور "سوفیا" دو لفظون سے مرکب ہے "فیلا" "محبت و دوستی" کو کہتے ہین۔ اور

[1] یہ شرح ۷۰ جز کی قلمبند ہوئی تھی ۱۲

"سوفیا"، "حکمت" کے معنون مین آتا ہے لفظ فیلسوف اسی فلاسفی سے مشتق ہے۔ اس کا صحیح یونانی تلفظ "فیلسوفوس" تھا، عربی لب ولہجہ نے اسکی صورت بدل کر "فیلسوف" بنا لیا۔ اسکے معنی "حُب حکمت" یا حکمت دوست" کے ہین یہ لقب اُسی شخص کے لئے موزون ہے اور اُسی کو مل سکتا ہے جس نے اپنی زندگی کا مقصد علم وحکمت کی خدمت اور اُسکی ترقی کی کوشش ٹھہرا لیا ہو۔

ابو نصر فلسفہ کا امام تھا، اُس نے محققانہ بلکہ مجتہدانہ انداز سے فلسفہ کے تمام شعبون مین اپنے کمالات کا حقیقی ثبوت دیا ہے۔ ابو القسم بن ساعد القرطبی نے "طبقات الحکما" مین لکھا ہے کہ "فارابی فی الحقیقت مسلمانون کا فیلسوف ہے" فن منطق کو یوحنّا بن خیلان سے (جسکا انتقال بغداد مین بہ عہد خلیفہ مقتدر ہوا) اخذ کیا۔ اسلام کے تمام فنون کو قید ضبط مین لایا ان علوم کی تحقیق وتدقیق مین سب پر فوقیت لے گیا، اُنکے غوامض اسرار کو حل کیا۔ اُنکی تعلیم وتعلم اور ضروری باتون کو آسان اور قریب الفہم کر دیا۔ ان علوم مین متعدد کتابین دلکش عبارت ولطیف اشارون مین تصنیف کین جن مین فن تحلیل و انحاد تعلیم کو بھی ظاہر کر دیا، جن کو کندی وغیرہ نے نظر انداز کر دیا تھا نیز ان کتابون مین منطق کے "مواد خمسہ"[1] کو جن سے "قیاس" مرکب ہوتا ہے اور مواد کے طرق انتفاع واستعمال کو مفصّل بیان کر دیا اور اسکی بھی وضاحت کر دی کہ مواد سے قیاس کی کیا کیا صورتین بنتی ہین۔ ان تمام خوبیون کے لحاظ سے اس کی کتابین اس فن مین بہترین اور مستند ترین مانی گئی ہین، ان کتابون کے علاوہ ایک اور نادر کتاب جو علوم کی "تقسیم وغائتہ" کے بیان مین اس نے لکھی ہے اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے اس سے پہلے کسی نے اس مبحث پر کچھ نہین لکھا تھا۔ اسکا صرف ایک نسخہ اسکیوریال (واقع اسپین) کے کتبخانہ مین موجود ہے۔

[1] جنس۔ نوع۔ فصل۔ خاصہ۔ عرض عام۔

فارابی نے بغداد مین مسلسل تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھا یہان تک کہ ان مین کامل اور اپنے ہمعصرون سے ممتاز ہوگیا بغداد ہی مین رہ کر بڑی بڑی کتابین تصنیف کین۔ بغداد سے دمشق پہنچا اور وہان چند روز قیام کر کے مصر چلا گیا۔ اِس نے اپنی کتاب "سیاست مدنیّہ" مین تذکرہ کیا ہے کہ اسکی تالیف کا آغاز بغداد مین ہوا اور اتمام مصر مین ۵۹۰ھ۔ ۱۸۹۵ء مین یہ کتاب لیڈن (ہالینڈ) مین طبع ہوئی اور اب مصر مین بھی چھپ گئی ہے، مصریون کی حلاوت سے جب فارابی کے علم کا ذائقہ سیر ہوگیا تو سیاح فارابی نے دمشق کا راستہ لیا اور وہین کا ہو کر رہ گیا۔ اُس وقت وہان سیف الدولہ بن حمدان کا شاہی عہد تھا جس نے فارابی کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا اور قدردانی کا سلوک۔

طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے ابو نصر نے خود درس کا سلسلہ شروع کیا۔ طلبہ کثرت سے اس کی طرف رجوع ہونے لگے تنہائی کو نعمت سمجھتا تھا اور مسائل پر غور و خوض اور تصنیف و تالیف کا شغلہ رکھنے کے لئے دریا کا کنارہ و رباغون کی سبزی اسکو مرغوب تھی۔ درویشانہ زندگی نے اسبابِ راحت کو ٹھکرا دیا تھا دُنیاوی شان و شوکت کو وہ نمایشِ سراب سمجھتا تھا۔

امیر سیف الدولہ نے اپنے بیت المال سے چار درہم یومیہ مقرر کر دیے تھے اُسی پر قناعت کرتا تھا اِس حکیم جلیل القدر کو دیکھئے اور چار درہم یومیہ کو خیال کیجئے۔ ایک درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کا ہوتا ہے گویا اسکی ساری معیشت چاندی کی آج کل کی ارزانی کے لحاظ سے ایک روپیہ کے قریب یا اُس زمانہ کے نرخ کا لحاظ کر کے اس سے دوگنی یا تگنی ہوگی۔

ابو نصر کا نہ گھر تھا اور نہ سامان خانہ داری، اس پر نظر کر کے یہ خیال ہوتا ہے کہ فارابی شاید حضرت مسیحؑ کی زندگی کا مقلد تھا نہ لباس کی صفائی کا خیال تھا اور نہ پھٹے پرانے پر نظر، علم اسکا اوڑھنا بچھونا تھا اور ہر وقت اسی کی تلاش و جستجو مین انہماک یا سیر و سیاحت سے دلچسپی اگر اسے لگاؤ نہ ہوتا اور اسکے پاؤن فاراب سے نہ نکلتے تو دنیا اسکو معلم ثانی سے بھی یاد نہ کرتی۔ سیاحی ہی نے

اُسکو اس مرتبہ پر پہنچایا۔

فارابی کی طالب علمی کا زمانہ خلیفہ مقتدر باللہ عباسی کے عہد حکومت سے مطابق تھا علم منطق کے پیچیدہ اور مشکل مسائل فارابی نے نہایت عمدگی اور سلیقہ کے ساتھ حل کر دیئے اور اس فن عمیق کو تمام لوگون کی سطح عقل کے قابل بنا دیا اسکی مصنفہ کتابین نہایت صحیح اور پڑھنے والے اور اس فن کے جاننے والون کی سمجھ مین غور و فکر کے بعد آجاتی ہین۔ ارسطو کے فلسفہ کا اصلی مفہوم سب سے پہلے ابو نصر ہی نے سمجھا اور پھر اُسکو اس قابل بنا دیا کہ دوسرے بھی اُس سے فائدہ اُٹھا سکین اسی وجہ سے اہل منطق اُسے معلم ثانی کہنے پر مجبور ہوے اور اُسکے اجتہادات علمیہ کے سامنے سر جھکا دیا۔

ابو نصر کی تصانیف سوا سو کے قریب بتائی جاتی ہین ان مین ضخیم اور کئی کئی جلدون کی کتابون سے لیکر چھوٹے چھوٹے رسائل تک شامل ہین اسکی تصانیف کا بڑا حصہ چھوٹے چھوٹے پرزون پر تھا اسی لئے اکثر کمیاب ہین اور نا پید اور اکثر فصول و تعلیقات کے ہین اور بعض ناقص و نا تمام۔ چند گنتی کی کچھ اصل عربی مین اور بعض کا عبرانی ترجمہ پایا جاتا ہے۔ ارسطو کی کتاب "ارغنون" "تنظیم المنطق" کا اس نے اس قدر پاکیزہ ترجمہ کیا ہے کہ اسکو بالکل حل کر کے رکھدیا۔ فارابی کی تصنیف و تالیف کے اصول مین قابل تقلید یہ بات ہے کہ ترجمہ لفظی نہین کرتا تھا، بلکہ اصل کتاب کے صحیح مفہوم کو اپنے روزمرہ کی سیدھی سادی زبان مین اس قدر خوبی کے ساتھ ادا کر دیتا تھا گویا خود اپنا خیال بے تکلفی سے ظاہر کر رہا ہے منطق اور فلسفہ الٰہی مین فارابی امام فن مان لیا گیا ہے۔

امام غزالی اور اکثر علمائے اسلام نے فارابی پر کفر کے فتوے تک دیدیئے تھے، بظاہر اس تکفیر کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی کتابین "دنیا کی قدامت" اور "حشر اجساد" سے انکار کرتی ہین، جو درحقیقت حکمائے یونان کے اقوال کی ترجمانی ہے نہ کہ فارابی کا عقیدہ۔ چنانچہ رسالہ "فصوص" جو فارابی سے منسوب کیا جاتا ہے ان خیالات کا مخالف ہے اور اسکی کوئی تصنیف امامت کی بابت

اسکے عقیدہ کو ظاہر نہین کرتی، اگر اس سے اُسکی بدعقیدگی یا مذہبی معتقدات کا سُراغ لگا کر "کافر" قرار دیا گیا ہے کہ اُس نے اُس زمانہ کے خلفا و سلاطین کو چھوڑ کر سیف الدولہ کے شاہی دربار مین اپنی زندگی گزاردی تو یہ اُسکی حکیمانہ رائے تھی یہ فطرت انسانی ہے کہ وہ اسی کو پسند کرتا ہے جو اُسکا ہم مذاق اور ہم خیال ہو سیف الدولہ کی یا تو قدر دانی علم اُسکو کھینچ لے گئی ہوگی یا اُسکے شریفانہ برتاؤ نے فارابی کو حلقہ بگوش کر لیا ہوگا، یا سیف الدولہ کے معتقدات مذہبی فارابی ایسے حکیم و فلسفی کو پسند آگئے ہونگے فارابی ایک وقت مین حکیم بھی تھا اور فلسفی بھی، منطقی بھی تھا اور ادیب بھی، فقہ و احادیث مذہب و مناظرہ غرضکہ جملہ علوم عقلی و نقلی سب اُسکے حکیمانہ دماغ مین فلسفیانہ بحث اور منطقی استدلال کے بعد طے ہو کر صبح کی پرسکون موجون کی طرح "ساحل یقین" بنے ہوے تھے۔ یہ جامعیت اسکو مشکل سے کافر قرار دے سکیگی۔

مولانا نفیسی جو بہت بڑے حاذق اطبا مین گذرے ہین۔ اپنی کتاب "شرح اسباب" مین فرماتے ہین کہ فارابی مالیخولیا مین مبتلا تھا اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ اکثر فلاسفہ جیسے افلاطون اور دوسرے حکما، جو اسکے ہم پلہ تھے یہ سب لوگ اپنے دماغی افکار کی وجہ سے اسی مرض مین مبتلا تھے بوعلی مے خواری مین مشہور تھا جیسا کہ اہل تاریخ نے مشہور کیا ہے۔

سیف الدولہ کے دربار مین ہر فن کے کاملین کا مجمع تھا۔ ایکروز فارابی بھی ترکی لباس مین ملبوس اُسکے شاہانہ دربار مین پہنچ گیا اور سیف الدولہ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سیف الدولہ نے بیٹھ جانے کے لئے اشارہ کیا، فارابی نے کہا کہاں بیٹھون مین جس جگہ کے لائق ہون وہان یا تم جس جگہ کے لائق ہو وہان؟ بادشاہ نے کہا تم جس جگہ کے لائق ہو۔ اسکو سُن کر فارابی لوگون کو پھاندتا ہوا بادشاہ کی مسند پر جا بیٹھا اور اسکو دھکے دیکر وہان سے ہٹا دیا۔ بادشاہ کے جلو مین چند غلام حاضر رہتے تھے جن سے وہ ایک غیر معروف زبان مین بات چیت کیا کرتا تھا، جسکو ان غلامون کے سوا کوئی دوسرا نہین سمجھ سکتا تھا۔ بادشاہ نے غلامون سے کہا کہ اس شخص کو اپنی گستاخی و بے ادبی کا خمیازہ

اِس طرح بھگتنا چاہئے کہ اگر اس نے میرے سوالات کے معقول جواب دیئے تو تم لوگ اسکو جلا کر خاک میں ملا دینا" فارابی اسی زبان میں جواب دیتا ہے کہ "اے بادشاہ صبر سے کام لے ہر کام کے انجام کا لحاظ ضروری ہے" بادشاہ تعجب سے پوچھنے لگا کیا تم اس زبان کو جانتے ہو؟ فارابی نے کہا کہ میں ستر[1] زبانوں سے زیادہ جانتا ہوں، یہ واقعہ "روضۃ الصفا" سے ماخوذ ہے مگر عقل سلیم اسکو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتی اِس لئے کہ فارابی کا علم و حکمت تہذیب و انسانیت اور بادشاہ کا رعب و سطوت یہ تمام باتیں ہرگز اِس امر کی مقتضی نہیں کہ فارابی سے ایسا خلاف تہذیب امر وقوع میں آیا ہو۔

فارابی نے سیف الدولہ کے درباری علما و فضلاء سے مختلف مباحث پر مکالمہ شروع کیا کون تھا جو اسکے مقابلہ میں ٹھہر سکتا، جو لفظ نکلتا تھا وہ علمی خراد پر اترا ہوا۔ علمائے دربار حیران ہو گئے اور جواب دینے کے بجائے اُسکی تقریر کو قلمبند کرنا شروع کر دیا۔ جب دربار برخاست ہوا تو بادشاہ نے فارابی کو روک لیا اور شراب کی صلاح کی، فارابی نے کہا کہ میں اس کا عادی نہیں ورنہ اس سے کبھی اپنے ہونٹوں کو تر کیا ہے ہاں گانا جسکو میں "غذائے روحانی" سمجھتا ہوں اس سے ضرور دل بہلا سکتا ہوں، بادشاہ نے مغنیوں کے حاضر ہونے کا حکم دیا جنہیں کوئلوں کی طرح کوکنے لگیں، قیامت خیز تار چھیڑے گئے لیکن جو باجہ چھڑتا تھا فارابی ٹوک دیتا تھا اور کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ کیا موسیقی سے بھی واقف ہو؟ فارابی نے کہا کہ جی ہاں جانتا ہوں، اور یہ کہکر اپنی کمر سے ایک تھیلی نکالی اور اُس میں سے چند لکڑیاں، جن کو آپس میں ملا کر اس ترکیب سے بجایا کہ تمام دربار زعفران زار بن گیا، بادشاہ سے لیکر خدمتگار تک اپنی زندگی کے اگلے پچھلے قہقہے بقایا ہو کر صرف کرنے لگے۔ دوسری ترکیب سے اس ساز کا چھڑنا تھا کہ قہقہوں کا خمیازہ آنکھوں کے بے چین آنسوؤں نے اُٹھایا تیسری ترکیب نے ہنسنے رونے کی دونوں حالتوں کو خواب کی صورت میں بدل کر چہل پہل کو سناٹے کے سپرد کر دیا اور سب کو

---

[1] ستر کا لفظ عربی کے محاورہ میں بہت کے معنوں میں آتا ہے اس سے یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ بھی ۷۰ زبانیں فارابی جانتا تھا۔

اسی غفلت مین چھوڑکر اپنے مرکز کا راستہ لیا۔ فارابی موسیقی مین بھی مسلم الثبوت مانا گیا ہے۔ "تاریخ الحکما" کا مولف لکھتا ہے کہ اس نے ایک ایسا حیرت انگیز باجہ ایجاد کیا تھا جسکے نغمے سامعین کے جذبات مین آگ لگا دیتے تھے۔ کسی جگہ اگر فارابی کا اتفاق سے گذر ہوگیا اور اُس نے باجہ کو بھی اپنی انگلیون کی حرکت سے "صولتِ روح" دیدی تو ہنسانا، رُلانا اور سلا دینا، اُس باجہ کی الحان معجز نما کا ایک معمولی کرشمہ تھا۔ چنانچہ ایک واقعہ دوسرے طریقہ سے اسی مین ہے (جو روضۃ الصفا کے متذکرہ بالا واقعہ سے ملتا جلتا ہے) کہ صاحب بن عُبّاد ایک علم دوست امیر ابونصر سے ملنے کا مشتاق تھا۔ ابونصر کی آزاد طبیعت ہمیشہ ٹالے بالے بتاتی رہی، ایک دن لہر آگئی اور صاحب بن عُبّاد کے پاس چلا گیا باجہ بھی ساتھ تھا صاحب بن عُبّاد کا دستر خوان لگا ہوا تھا حسین و گل اندام گلون سے موسیقی کی فرحت بخش ہوا پڑ رہی تھی، ہر شخص کیفِ ترنم کا مصداق ہو رہا تھا، آنکھین جمی ہوئی دیکھ رہی تھین اور کانون مین لحن داؤدی کے سوا کسی صدا کا گذر تک نہ تھا، کسکو ہوش تھا کہ وہ ادھر اُدھر دیکھے دربان اپنی اپنی جگہون پر پتھر کی مورت بنے ہوے تھے، حرکت کرنا انکے ذوق مین جرم تھا اور ادھر اُدھر دیکھنا ان کی محویت کی تعزیر تھی، جہان کا یہ عالم ہو وہان روک ٹوک اور دربانون کی مزاحمت کا کیا ذکر۔ ابونصر اپنی فقیرانہ حالت کا احترام کرتا ہوا دربار امیر مین داخل ہوجاتا ہے اور اس محویت و استغراق کا خود بھی تماشائی بنجاتا ہے کچھ دیر کے بعد اس محویت مین کمی ہوتی ہے تو حاضرین دربار مین سے کسی کی نظر اس اجنبی پر پڑتی ہے تو "مسخرے" اور ظریف الطبع اسکی حالت پر پھبتیان اُڑانا شروع کر دیتے ہین۔ ابونصر یہ سب کچھ دیکھکر اپنا باجہ نکالتا ہے اور اُن تارون کو حرکت دیتا ہے، جنکی سرشت ہنسا دینا، جنکی خاصیت رُلا دینا اور جنکی فطرت سُلا دینا ہے۔ جب سب کو بیخبر کر دیا اور دربانون تک نے چادرین تان لین تو ابونصر ایک باجہ پر یہ لکھ کر چل دیا کہ تم کو ابونصر سے ملنے کا اشتیاق تھا، وہ آیا تم نے اسکا مضحکہ اڑایا، اب وہ تم کو ہنسا، رُلا، اور سُلا کر جاتا ہے" (مگر یہ امر محال، عادی ہی نہین بلکہ محال عقلی کی حد تک پہنچ گیا ہے، جیسے کہ

ہوش آیا اور آنکھیں کھلیں تو اُس قانون نواز کو نہ پایا، باجہ پر لکھا ہوا دیکھا تو صاحب بن عبّاد نے بہت افسوس کیا، سانڈنی سواروں کی دوڑ ہمہ شما کی جستجو فارابی کی گرد راہ تک نہ پہونچ سکی - جس باجہ کا نام "قانون" ہے اُسکا موجد بھی فارابی ہے

"روضتہ الصفا" میں لکھا ہے کہ فارابی عسقلان کے سفر میں ڈاکوؤں کے ہاتھ سے مارا گیا جبکہ اُسکے پاس سے وہ سب تیر ختم ہو چکے تھے، جن سے وہ ڈاکوؤں کے مقابلہ میں ہمیشہ کام لیا کرتا تھا (فن تیر اندازی میں فارابی کو خاص ملکہ تھا) سیف الدولہ کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو اُس نے قاتلوں کی گرفتاری کا حکم دیا، جب وہ پابزنجیر حاضر ہوے تو سیف الدولہ نے حکم دیا کہ ان ظالموں کو فارابی کی قبر کے پاس لیجا کر سر کے بل لٹکا کر سولی دو اور درختوں کے تنوں پر اُسی حالت میں چھوڑ دو، چنانچہ اسی طرح کی سزا سے ہلاک کیے گئے اور عالم کی نگاہوں میں موجبِ عبرت ہوے -

۳۳۷ھ یا ۳۳۹ھ میں ۷۶ یا ۹۶ برس کی عمر پا کر فارابی نے دمشق ہی میں اپنی فلسفیانہ وحکیمانہ زندگی کو خیرباد کہا اور دمشق کے باہر بیرون "باب الصغیر" دفن ہوا - سیف الدولہ نے اپنے چار خاص عالموں کے ساتھ جنازہ کی نماز پڑھی - چار عالم اور ایک سیف الدولہ کے سوا کوئی چھٹا مسلمان اسکے جنازہ کی نماز میں شریک نہ تھا اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شامیوں کے تعصّب کی وجہ سے سیف الدولہ ایسے جلیل القدر بادشاہ نے یہ پسند نہ کیا کہ مرنے کے بعد فارابی کے معتقدات مذہبی کو صدمہ پہونچے اس لئے اس نے چند اپنے ہی علما کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھا کر معلّم ثانی کو سپرد خاک کر دیا - یہ بھی مشہور ہے کہ فارابی نے سیف الدولہ سے اسکی وصیّت بھی کی تھی - یہ ابن خلکان اور طبقات الاطبّار کی مورخانہ روایتیں ہیں -

فارابی کی تصنیفات میں اسکے کہے ہوئے اشعار بھی پائے جاتے ہیں - منجملہ اِن اشعار کے جو اسکی طرف منسوب ہیں بعض وہ ہیں جو اس نے اپنے احباب کو خطوں میں لکھے تھے ایک حکیم و فلسفی کی

شاعرانہ فکر بھی دیکھ لیجئے۔

ماان لقاعد جسمی عن لقائکم　　الا و قلبی الیکم شیق عجل

گو میرا جسم تمہاری ملاقات سے باز رہا　　میرا دل تمہارا ہی آرزومند تھا اور تمہارے پاس پہنچنے میں جلدی کرنیوالا تھا

وکیف یقعد مشتاق بحرکم　　الیکم الیا عثمان الشوق والامل

بھلا وہ مشتاق (دل) قرار سے کیونکر بیٹھ سکتا ہے　　جبکہ شوق اور امید دونوں چیزیں اُبھارنیوالی تمہاری طرف دوڑا رہی ہوں

فان نھفت فمالی غیرکم وطن　　وکیف ذاك ومال عنکم بدل

پس اگر میں اٹھوں تو تمہارے سوا میرا کوئی وطن نہیں　　اور ایسا کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ تمہارا بدل میرے لئے نہیں ہے

وکم تعرض بی الاقوام قبلکم　　یستاذفون علی قلبی فما وصلوا

اور تم سے پہلے لوگوں نے مجھے کتنا ہی چھیڑ چھیڑ کر　　میرے دل میں جگہ کرنے کی اجازت چاہی لیکن انکی رسائی نہ ہو سکی

شہریارِ دکن

الحمد للہ ہمارے اشتیاق و انتظار کا زمانہ بخیر و خوبی ختم ہوا اور سال بھر کے بعد اپنے آقائے ولی نعمت شہریارِ دکن کی سالگرہ کے مبارک و مسعود ایام سے ہم پھر سعادت اندوز ہوئے اہل دکن کے لئے ۲۹ - جمادی الاخری کا دن ایک نہایت مبارک و مسعود دن ہے جسکی شب کو ۱۳۰۳ھ میں ہمارے ولی نعمت آصفجاہ سابع جلوہ افروز بزم عالم ہوئے یہ ایسی خوشی ہے کہ حلقہ بگوشانِ دولت آصفیہ اس تاریخ سالگرہ مبارک کی تقریب میں اپنے عقیدتمندانہ جوش مسرت کی وجہ سے ہر طرح خوشیاں مناتے اور بزم آرائیاں کرتے ہیں چہل پہل کا عالم رہتا ہے، اس ہمایوں تقریب کی خوشی میں دکن کے کوہ و وادی تک روشن ہو جاتے ہیں ہر کہ و مہ اپنی اپنی توفیق کے مطابق اپنی عقیدت کیشی اور وفاداری کا اظہار کرتا ہے کہیں جلسے ہوتے ہیں کہیں مدحیہ اور دعائیہ قصائد پڑھے جاتے ہیں کہیں کوئی مضمون مناسب حال پڑھا جاتا ہے۔ غرض وابستگانِ دولت اور نمکخوارانِ ریاست شاہ دکن کی عمر و دولت کی دعائیں مانگتے اور خوشی و مسرت کے ترانے گاتے ہیں۔ ہم بھی جو اس خوانِ کرم کے ریزہ ربا ہیں اس موقع پر بطور تشکر و امتنان اپنے خلوص و مسرت کے اظہار میں بصد ادب پرچہ سالگرہ نمبر پیش کر رہے ہیں اور اپنی زبان و قلم کو اس سعادت سے محروم رکھنا موجب کفرانِ نعمت سمجھتے ہیں، لیکن ہم کیا اور ہماری زبان کیا جو اس حق سے عہدہ برآ ہو سکیں، چھوٹا منہ بڑی بات کا مصداق ہے۔ اس تاجدار ستودہ صفات کے اوصاف کا بام ہمارے حوصلۂ پرواز سے کہیں بلند ہے بلکہ ہمارا طائر خیال اور کمندِ وہم بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہمارا حسن عقیدت اور جوش مسرت ہمارے دل کو بے چین کئے دیتا ہے لہذا کچھ عرض کئے بغیر بھی ہم نہیں رہ سکتے۔

اِس مُبارک عہد مین ہمکو جس قدر برکتین میسّر ہوئی ہین وہ اس سے پہلے شاید سو دو سو سال مین بھی کسی کو نصیب نہین ہوئی ہونگی ہماری اور ہماری اولاد کی جان و مال، عزت و آبرو، صحت و عافیت، مسرّت راحت، غرض ہر ایک چیز پر اِس مبارک زمانہ کا کافی و وافی اثر پڑ رہا ہے یہ صرف دکن ہی کے لئے نہین بلکہ تمام ہندوستان اس سے مستفیض ہے اور دیگر اقالیم بھی اس فیض سے بہرہ اندوز ہین -

اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع کے عہد مبارک مین یون تو ملک دکن کے ہر گوشہ سے ترقی کے آثار ہویدا ہین اور ہر شعبہ مین خاطر خواہ اصلاح ہوئی ہے لیکن بعض شعبون نے خاص طور سے نظر خسروانہ سے دن دونی رونق پائی ہے - از انجملہ ایک شعبۂ تعلیمات ہے جس پر آئندہ نسلون کی صلاح و فلاح کا انحصار ہے اسکو اعلیٰحضرت کے عہد ہمایون مین جو نمایان ترقی ہوئی ہے اسکو ہر شخص جانتا ہے سابق کی بہ نسبت اِس وقت مدارس تحتانیہ و وسطانیہ کی تعداد دو چند سہ چند سے زیادہ ہوگئی ہے اور لائق مدرسین اور مہتممون کے تقرر مین اس قدر فراخ دلی سے کام لیا گیا ہے کہ موازنۂ حال کا پلہ موازنۂ سابق سے کہین بھاری ہوگیا ہے تعلیمی معاملات سے جو دلچسپی ہے اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ آپکے دست کرم نے ابتدا ہی مین مسلم یونیورسٹی کی جو شاہانہ امداد فرمائی ہے اُس پر خوشی کے نعرون سے سارا ہندوستان گونج اُٹھا ہے سب سے زیادہ اِس سررشتہ مین قابلِ قدر یادگار "عثمانیہ یونیورسٹی" کا سنگِ بنیاد ہے یہ عمارت ہے کہ ایک روز اُسکے کُنگرے ہم کو سر بفلک نظر آئین گے اگرچہ یہ پودا ابھی نوخیز ہے لیکن جب انتہائی نمو پر پہونچیگا تو اُسکی شاخین سدرۃ المنتہیٰ سے بھی کچھ اونچی نظر آئینگی اور ملک و قوم کے لئے اسکا جو نیک ثمرہ حاصل ہوگا اسکا اندازہ وہی لوگ اچھی طرح کر سکتے ہین کہ جن کے دل و دماغ اسکے ادراک کا ذوق رکھتے ہین اسکے پہلو بہ پہلو سررشتۂ تالیف و تراجم کا قیام ہے جسکی کرسیون پر فخر ہندوستان ماہرین فن جلوہ گر نظر آرہے ہین جن مین سے ہر ایک اپنے وقت کا ابن رشد اور ابو نصر سمجھا جاتا ہے اس سررشتہ کے

قیام کے سبب سے یہ دورِ عثمانی بھی آئندہ زمانہ میں دورِ عباسیہ کی طرح یاد کیا جائیگا اس سررشتہ کے قیام سے اعلیحضرت نے زبانِ اُردو پر وہ احسان کیا ہے جو خلفائے بنی عباس نے زبانِ عربی کے ساتھ کیا تھا ایک زمانہ میں اُردو زبان بھی علوم و فنون کا ذخیرہ بن جائیگی اور جب تک یہ ذخیرہ باقی ہے اس میں اعلیٰ حضرت ہی کے نام نامی کے زرین حروف لعل و گوہر بن کر چمکتے رہیں گے

امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کو مسخ و نسخ سے محفوظ رکھنے کے لئے تو جہات خسروی منعطف ہوئے ہیں جو علیگڈھ کالج میں طبع ہو رہا ہے تین مثنویاں اعلیحضرت ہی کی سرپرستی میں چھپ چکی ہیں خدا کرے انکا غیر مطبوعہ کلام بھی انجمن اشاعتِ کلام خسرو کو کہیں سے ہاتھ آجائے تو توجہات شاہانہ اُسکے چھپکر شایع ہو جانے کی بھی کامل امید ہے۔

اشاعتِ علوم کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم کا بھی جسکی ضرورت عایائے دکن کے اُس طبقہ کو ہے جو نہایت بے سر و سامان اور شمار میں سب سے زیادہ ہیں انتظام فرمایا گیا ہے چنانچہ حال ہی میں ایک یورپین افسر اور اسکے مددگاروں اور عملے وغیرہ کا اس سررشتہ میں تقرر ہوا ہے اور اُسکے لئے مشین و آلات منگوانے کے لئے کئی لاکھ روپیہ کی منظوری فرمائی گئی ہے اسکے علاوہ اس مبارک عہد میں دفاتر و مدارس کے لئے بڑی بڑی عالی شان عمارتیں تعمیر ہوئیں سب سے زیادہ یہ کہ آرایش بلدہ کا کام ہو رہا ہے جہاں خارستان تھا اب وہاں گلستان نظر آرہا ہے۔ الغرض دکن کی خاک میں اب قرطبہ و بغداد و مصر کی ترقی کے زمانہ کی شان نمایاں ہو رہی ہے اور یہاں کے تاجدار ستودہ صفات نے ہارون و مامون کی بھولی ہوئی عظمت کو زندہ کر دیا ہے دور دراز کے ممالک بھی اِس آفتاب کی شعاعوں سے منور ہو رہے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کی فیاضی اور داد و دہش دکن کی سرحد تک محدود نہیں ہے بلکہ بلادِ عرب و عجم، ہندو یورپ تمام ممالک کی سرزمین آپکے ابرِ کرم سے سرسبز و شاداب نظر آتی ہے۔ حال ہی میں مدینہ منورہ

مین ایک مدرسہ کے اخراجات کے لئے فرمان صادر فرمایا ہے اور اسکو مدرسہ عثمانیہ سے موسوم فرمایا ہے
ہندوستان مین مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی سر بفلک عمارتون کو جاکر دیکھ لیجئے۔ انکے بام و در پر ہمارے
آقائے ولی نعمت کی فیاضیون کے سنہرے حروف جگمگا رہے ہین مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جو اعانت
خسروانہ ہو رہی ہے اس نے مامون الرشید کی اعانت بیت الحکمۃ کی یاد کو دلون سے محو کر دیا ہے دار المصنفین
اعظم گڑھ جیسی خالص علمی اکاڈیمی کے ستون محض اعلیحضرت ہی کی گہر پاشیون کی بنیاد پر قائم ہین، دیوبند
کے مدرسہ کو ملاحظہ کیجئے اسکی اینٹ اینٹ اس شہریار کے جود و ایثار کی گواہی دے رہی ہے، خزان
رسیدگان ملک بہار سے ملئے انکے اجڑے ہوے چمن پر بھی حیدرآباد ہی کے ابر نیسان گوہر افشان
پائین گے، الہ آباد کا مدرسہ سبحانیہ ہو یا اجمیر شریف کا مدرسہ معینیہ عثمانیہ ریاست کوٹھا پور کا دینی مدرسہ ہو
یا وانمباڑی (مدراس) کا عثمانیہ کالج یا اور اسی طرح کے تمام قومی درسگاہون کی زندگی اعلیحضرت
حضور پرنور ہی کی مسیحا نفسی کا اعجاز ہے اسی پر کیا منحصر ہے ہندوستان کا کون سا ایسا گوشہ ہے جہان
میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہ کا دست و دل بحر و کان ہوکر نمودار نہ ہوا ہو
اور ہندوستان کے عرض و طول مین شاید ہی کوئی ایسا بدبخت مقام ہوگا جہان اس سرکار ابد
پائدار کے نمکخوار موجود نہ ہون

بنی نوع انسان کے ساتھ اعلیحضرت کو جو ہمدردی ہے تمام عالم مین اسکی
نظیر ملنا دشوار ہے اسکی ایک ادنی مثال یہ ہے کہ انسداد طاعون کی تدابیر کے لئے لاکھون روپیہ
کی منظوری صادر فرما کر سدگان عالی نے اپنی عزیز رعایا کی جانون کو اس بلائے عظیم کے خوفناک پنجہ
سے بچا لیا۔ رعایا کی بہبود کے لئے کسی سررشتہ سے جب کوئی تحریک پیش ہوتی ہے اگرچہ اسمین لاکھون ہی
کا تقدمہ کیون نہو اسکی منظوری مین ایک لمحہ کی بھی دیر نہین ہوتی۔

اعلیحضرت کو اپنی رعایا کے ساتھ جو شاہانہ شفقت و ہمدردی ہے اسکی نظیر مین یہ واقعہ پیش کرنا

کافی ہوگا کہ آج سے قریب تین سال قبل حضرت اقدس و اعلی نے ایک فرمان نافذ فرمایا تھا کہ شادی بیاہ مین
ناشروع رسوم سے اجتناب کیا جائے کیونکہ اسراف احکام الٰہی کے خلاف ہے۔ اِس حکم سے شریعت کے علاوہ اپنی
رعایا کے ساتھ حضرت اقدس کی دلی ہمدردی کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ ایسا مدبرانہ اور دوراندیشی پر مبنی حکم ہے
کہ اگر اسکی تعمیل ممالک محروسہ سرکار عالی سے باہر بھی کیجائے تو وہان بھی صدہا تمدنی و معاشری فوائد
حاصل ہو سکتے ہین۔

گدک ریلوے کا جاری کرنا اِس عہد ہمایون کا وہ فیض عام ہے جس نے اہل ملک کے لئے آرام
وراحت و ترقی تجارت کی راہ کھولدی ہے یورپ کی جنگ مین فوجی و مالی ہر طریقہ پر جو مدد شمار سے فزون
ترملک دکن او فرمانروائے دکن کی طرف سے ہوئی ہے دولت برطانیہ نے بار بار اسکا اعتراف کیا ہے۔

اعلیحضرت کو سُنن اسلام کا لحاظ و پاس ادب شریعت ہر وقت ملحوظ خاطر اقدس رہا کرتا ہے۔
چنانچہ ایک نوروز کے دربار مین یہ حکم صادر فرمایا کہ سلام اور نذر پیش کرتے وقت لوگ رکوع و سجود کی سی
ہیات پیدا کرتے ہین اسکی ضرورت نہین۔ سالگرہ مبارک کے دربار مین خاکسار بھی حاضر تھا کسی نے نذر
دیکر قدمبوسی کی حکم ہوا کہ کوئی شخص قدمبوسی یا زمین بوسی نہ کرے اس لئے کہ یہ امر سراسر خلاف شرع ہے
اکبر کے زمانہ سے مسلمانون مین سلام کے وقت رکوع و سجود کی رسم داخل ہوئی۔ شاہجہان نے اسکی
ممانعت کی اسکے دو ایک نسل کے بعد پھر یہ رسم داخل دربار ہوگئی یہانتک کہ دربار آصفجاہی مین بھی یہی رسم
آج تک جاری رہی۔ خدا اِس بادشاہ ظل اللہ کا سایہ دراز کرے کہ اِس خلاف شرع رسم کو قطعاً موقوف
کرنے کا حکم دیا اِس مبارک عہد کا یہ ایک کارنامہ ہے جو ہمیشہ مسلمانان ہند مین یادگار رہیگا۔

طرز حکمرانی کو دیکھا جائے تو بڑے بڑے مدبرین کی عقل دنگ ہے، خداوند عالم نے اپنے دبستان حکمت سے
اعلیحضرت کو آئین حکومت تعلیم فرمایا ہے مشیر اور مدارالمہام کے بغیر تمام مہام سلطنت کا بار بنفس نفیس اُٹھائے ہوئے
ہین اور وہ بھی اس خوبی کے ساتھ کہ جس سے سرکار عالی اور سرکار عظمت مدار مین سررشتۂ اتحاد روز بروز

مستحکم اور پائدار ہوتا جاتا ہے احکام دینی کی ترویج کے لئے جابجا واعظون اور خطیبون کا تقرر فرمایا گیا ہے اور بیسیون متوکلین کے نام وظائف اجرا فرمائے گئے۔ اسکے ساتھ ہی آپ کی صلح کل اور غیر متعصب طبیعت کی زمانہ بھر مین دھوم ہے مسلمانون کی مساجد کی طرح دیگر اقوام و مذاہب کے معابد کے لئے جو بیش قرار وظائف اور معاشین مقرر ہین انکی کامل نگہداشت اور رعایت ملحوظ خاطر عالی رہتی ہے۔

یون تو اس ریاست مین سابق سے اعلیحضرت کے اسلاف نے بھی خیر و برکت کے راستے کھول رکھے تھے لیکن مذکورہ بالا بطور ابواب خاص بندگان عالی کی ذات سے منسوب ہین جسمے یکے از ہزار اور اندکے از بسیار بطور اجمال و اختصار ہم نے عرض کیا ہے۔ ابھی اعلیحضرت کو تخت شاہی پر جلوہ فرما ہوئے سات ہی برس کا زمانہ گذرا ہے جسمین صلاح و فلاح و خیر و برکت اور بہبود و رفاہ نے اسقدر ترقی کی[1]

این قدرہا کہ دیدۂ جزئیست کارِ کُلّی ہنوز در قدرست

ہم بھی اس سرکار کے نمکخوار ہین اور اسی دولتِ ابد مدت کے ایک خوشہ چین ہین۔ ہم نے رسالہ "ذخیرہ" تیسوین سالگرہ ہمایون کی تقریب مین جاری کیا تھا جس سے اہلِ ملک مین نظم و نثر کے لٹریچر کا مذاق صحیح اور تاریخی و علمی معارف و اسرار کا ذوق پیدا ہو رہا ہے، اسکی آبیاری حضرتِ اقدس ہی کے رشحاتِ فیض نے کی اسکو آبحیات اسی خضر کائنات کے دستِ کرم نے پلایا اور یہ اسی کی برکت ہے کہ "ذخیرہ" زمانہ کی چشمِ زخم سے ابتک محفوظ اور ملک کی خدمت بجالانے مین مصروف ہے اور کیا عجب کہ یہی برکت اسکی حیاتِ جاودانی کا باعث ہو جائے۔

اِس خاکسار اڈیٹر کے لئے یہ امر بھی باعثِ فخر و مباہات ہے کہ اعلیحضرتِ اقدس نے سالگرہ ہمایون کی مبارک تقریب مین خاکسار کو یاد فرما کر شرف باریابی عطا فرمایا، نذر مین شرکت کا اعزاز بخشا، نذر قبول فرما کر ہمچشمون مین ممتاز فرمایا جسکی سپاس گزاری سے زبان قاصر ہے۔ اہل قلم کے

[1] اس دعا نے اُلٹا اثر کیا اور قصر شاہی کی دیوارون سے ٹکرا کر مایوس واپس آ گئی ۱۲

ساتھ شاہانِ سلف کی جو فیاضیاں اور قدردانیاں سُنی تھیں خاکسار نے اُسکو برای العین مشاہدہ کرلیا۔

اِس عہد مبارک کی برکتیں بیشمار ہیں۔ ان سب کو شرح و بسط سے بیان کرنا ہیچمدان کی طاقت سے باہر ہے ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکران کے لئے (غالب)

بی بی کا عَلَم

ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست (حیدرآباد دکن) مین ہر سال دسوین محرم کو "بی بی کا عَلَم" اپنے "الاوہ" (امام باڑہ) سے سالانہ جلوس کے ساتھ نکلتا ہے۔ یہ علم قطب الملک (شاہ گولکنڈہ) کی خوش عقیدہ ماں کی منت کی یادگار ہے۔ قطب الملک کسی بڑی مہم پر بہ نفس نفیس گئے تھے کہ اتنے مین محرم کا مہینہ آگیا جسمین کربلا کے میدان مین خاندان نبوت پر دل ہلا دینے والا واقعہ گذرا ہے۔

قطب الملک کی ماں اپنے بچے کی مفارقت سے بیقرار و مضطر تھی دعاؤن اور منتون کا ایک غیر متناہی سلسلہ تھا جو چلا جا رہا تھا، ماں کی پریشانی بیٹے کے لئے فطری ہے دعائین مانگتے اور الحاح وزاری کرتے کرتے ضعیف آنکھ لگ جاتی ہے۔ عالم رویا مین جناب فاطمہؑ تشریف لاتی ہین اور اپنی عقیدتمند کو پریشان دیکھ کر تسلیون کی بشارتین دیتی ہین۔ فکرمند کی آنکھ کھلتی ہے تو پریشانی مین کمی پاتی ہے اور قلب کو مطمئن۔ مبارک خواب کی تعبیر خود دیوان دیتی ہے کہ "بی بی" کے مبارک نام سے سونے کا علم بنواتی ہے علم کے کانون مین بیش قیمت جواہرات پہناتی ہے، خوبصورت اور بھاری ملبوس سے اسکی زیبائش مین چار چاند لگاتی ہے اور علم کو ہر طرح سے آراستہ کر کے ایک متقی و پرہیزگار کے ہاتھون مین دیکر اور ہاتھی پر بٹھا کر اس طرف بھیجتی ہے جدھر قطب الملک اس کا نور نظر اور گولکنڈہ کا گوہر شب چراغ سرگرم پیکار تھا اور اپنی جوانمرد سپاہ کو حق نمک ادا کرنے کی توفیق دلا رہا تھا کہ اتنے مین پیچھے سے گرد و غبار دکھائی دیتا ہے۔ قطب الملک پیچھے مڑ کر جو دیکھتا ہے اور ہاتھی کو اپنی ہی طرف التفات سے قدم بڑھاتے ہوئے پاتا ہے اور اس پر اسلامی علم کا پرچم لہراتا ہوا نظر آتا ہے دل بڑھ جاتا ہے

غیبی امداد کا یقین ہو جاتا ہے۔ بزرگ ہاتھی سے اُترتے ہین اور قطب الملک کی مان کا پیام محبت سُناتے ہین، قطب الملک سر جُھکا کر ارادت سے سُنتا ہے اور بزرگ کے ہاتھون سے علم لیکر بوسہ دیتا ہے اور بلا توقف میدان کارزار مین یا حسینؑ کے نعرے لگاتا ہوا گھوڑا ڈال دیتا ہے علم ایک ہاتھ مین ہے تلوار ایک ہاتھ مین، اِس قوت و جوش سے مخالف سپاہ پر حملہ کرتا ہے کہ شیر دل جوانون کے چھکّے چھوٹ جاتے ہین۔ گھبرا کر مخالف سپاہ تتر بتر ہو جاتی ہے، فتحمندی کے نشہ مین جھومتا ہوا قطبیہ کا پہلا تاجدار اپنے مرکز کو واپس آتا ہے۔ گھوڑے سے اُترتا ہے علم کو ایک پاک و صاف جگہ پر رکھکر مجلس حسینؑ منعقد کرتا ہے بعد ختم مجلس کوچ کا نقارہ بجوا تا ہے اور اُسی حیثیت سے سفر کی منزلین طے کرتا ہے کہ ایک ہاتھ مین علم ہے اور دوسرے مین بے نیام تلوار! دارالسلطنت کی سرزمین پر قدم رکھتا ہی تو حسینؑ و فاطمہؑ کے نعرون سے گولکنڈہ کی خوش عقیدہ زمین چونک پڑتی ہے، قلعہ کے اندر خبر ہوتے ہی مضطرب الحال مان بےچین ہو جاتی ہے، قطب الملک اُسی ہیئت سے اندر داخل ہوتا ہے اور مان کے حضور مین ادب سے جُھک کر قدمبوسی کا فریضہ سب سے پہلے ادا کرتا ہے، مان ہزارون دعائین دیکر پیار کرتی ہے اور علم کو قطب الملک کے ہاتھون سے لیکر "عزاخانہ" مین ممتاز جگہ پر نصب کرا دیتی ہے۔

قطبیہ سلطنت کی یہ صدیون کی مذہبی یادگار دولتِ آصفیہ مین اب بھی باقی ہے ہزارون روپیہ کی سالانہ جاگیر اب تک بی بی کے "الاوہ" کے لئے وقف ہے۔ بڑی شان و شوکت سے اب بھی علم کی سواری دسوین محرم کو نکلتی ہے، حکومتِ آصفیہ کی تمام باقاعدہ و بےقاعدہ فوج علم کے آگے آگے ہوتی ہے۔ "پُرانی حویلی" کے شاہی قصر مین حضرتِ آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ مع اپنے شاہزادون اور اسٹاف کے ہر سال بلاناغہ برآمد ہوتے ہین، علم کی زیارت سے مُشرّف ہوتے ہین اور عقیدت کے پھول چڑھاتے ہین اور نہایت خلوص و عقیدت سے تبرکات لیتے ہین، سرِشام بیرون "چادر گھاٹ" موسیٰ ندی کے کنارے اِس علم کے پھول وغیرہ دفن کر دیئے جاتے ہین یا موسیٰ ندی کی موجین اپنی آغوش مین

لے لیتی ہین، اور پھر ایک سال کے لئے اس مذہبی شاہانہ جلوس کے نظارہ کے لئے سب کی آنکھین ترستی رہتی ہین -

اِس علم کے کانون مین لاکھون روپیہ کے جواہرات اِس وقت بھی زینت پا رہے ہین نہایت باریک ریشمی کپڑے کے نقاب غلاف کی صورت مین فاطمہؑ کے زیورون کے پردہ پوش ہین اِن جواہرات کی قدرتی چمک ریشمی نقاب سے چھن چھن کر نظرون کو خیرہ کرتی ہے، بہت بڑا ہاتھی دولتِ آصفیہ کی طرف سے اِس علم کی سواری کے لئے مخصوص ہے جو صرف سال مین اسی دسوین کو "بی بی کے علم" کو اپنے خوش قسمت دوش پر اٹھائے گلیون گلیون اور سڑکون سڑکون نہایت سکوت و خاموشی سے پھرتا ہے، چھوٹے چھوٹے بچے، بڑے بڑے بوڑھے اور اچھے اچھے جوان ہاتھی کے پیرون سے لپٹ کر بالواسطہ سعادت حاصل کرتے ہین، متولیٔ علم کے ہاتھون سے تبرکات مانگ مانگ کر لیتے ہین اس مین بادشاہ بھی ہین اور فقیر بھی، امیر بھی ہین اور غریب بھی، ہندو بھی ہین اور مسلمان بھی، سُنی بھی ہین اور شیعہ بھی، غرضکہ ہر مذہب و ملت کے لوگ جوق جوق آتے ہین اور زیارت کر کے ناتوان قلب کو متاثر کرتے ہین، ذرا سے تبرک کو نعمت کثیر سمجھتے ہین، یہ کیا ہے! یہ اسلام کی حقانیت اور اہلبیت کی قدرتی اور سچی عظمت کا اقرار ہے، تیرہ صدیان گذر گیئن مگر عقیدت کا جوش صدیون کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کر رہا ہے -

(۳- اگست ۱۹۲۷ء مطبوعہ روزنامہ "ہمدم" لکھنو)

ڈیڑھ مہینہ اِدھر اُدھر

۳۱- اگست ۱۹۲۴ء کو ۴ بجے ہز اکسلنسی مہاراجہ سر یمین السلطنت بہادر بالقابہ کا تار ملتا ہے کہ:-

"اجمیر میں آکر ملئے"

تو میں مسرت سے اُچھل پڑتا ہوں، دیرینہ اشتیاق مچلنے لگتا ہے اور خوابیدہ ولولے بیدار ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اگر ملازمت کے قیود سے آزاد ہوتا اور قدرت میرے بازوؤں کو پرواز عطا کر دیتی تو اُس وقت آزاد پرندوں کی طرح اُڑ جاتا، اور راستہ میں سانس لینے کی بھی قسم کھا لیتا- اپنی بےبسی سے لاچار ہو کر اعلیحضرت مدظلہٗ (شہریار رام پور) کے حضور میں بمبئی تار دیکر اذن سفر کی درخواست کرتا ہوں، دوسرے روز رات کے دس بجے اجازت نامہ آتا ہے، میں سامان سفر اُٹھواتا ہوں، بیگم کی انتظامی قابلیت اور سلیقہ شعاری سے مطمئن تھا، اس لئے مجھے کوئی زحمت نہ اُٹھانی پڑی، ہر چیز بالکل تیار ملی، مجھکو ایک منٹ کی بھی تعویق شاق تھی، اُسی وقت بارہ بجے کے اکسپرس سے رخت سفر باندھ لیا، جس وقت اسٹیشن پر پہنچا ہوں، اکسپرس آچکا تھا اور جانے کے لئے بھی تیار تھا، اتنا وقت کہاں تھا کہ ٹکٹ لیتا، ایک درجہ میں خود بھی گھس گیا اور آدمی کو بھی گھسیٹ لیا- یہ درجہ اُس وقت میری قسمت کی طرح تاریک تھا، نظر تو کچھ نہ آتا تھا، مگر اُسکی ہر سیٹ پر سونے والے حضرت مسیحؑ سے قبل کی زبان بے زبانی (خراٹے) میں بول رہے تھے، کھڑے کھڑے مراد آباد تک پہنچا، ٹکٹ چیکر نے باوجودیکہ میں اپنے پیروں پر آیا تھا کسی سیٹ پر سہارا بھی نہ دے سکا تھا مگر اُس نے مقررہ کرایہ لیکر اپنی ڈیوٹی

اور ایمانداری کے ثبوت مین ایک کاغذ کا ٹکڑا دیدیا۔

مرادآباد کے پلیٹ فارم پر دہلی جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی، دو گھنٹہ کے بعد اُسنے پلیٹ فارم کو چھوڑا، میرے ڈبہ مین تنہا مین ہی نہ تھا بلکہ تین گورے بھی اپنی تثلیث پرستی مین چور آنکھون کو مخمور کئے بیٹھے تھے، مین اُنکی فطری شرارتون کو ہوشیاری سے لیٹا ہوا اطمینان سے دیکھتا رہا، میرے وقت کو کتاب بینی خاموشی سے کاٹ رہی تھی اُنکے اوقات بوتل کے ارغوانی عرق سے کٹ رہے تھے، اسی عالم مین خدا خدا کرکے صبح ہوگئی، دہلی کا اسٹیشن آیا، آدمی نے اسباب اُتروایا اور قلی کے حوالہ کیا، مین اُس پلیٹ فارم کی طرف بڑھا جدھر اجمیر کی طرف جانے والی ٹرین مسافرون کا خیر مقدم کررہی تھی، گاڑی مین ابھی سامان بھی سلیقہ سے رکھا تھا کہ دہلی کے سید سرفراز حسین خان صاحب ارمان جو تحصیلدار بھی ہین اور قیصری مونچھین بھی اپنے ہونٹون پر سلیقہ سے رکھتے ہین وارد ہوگئے۔ ارمان و ہوش کی ملاقات سفر مین لطف سے خالی نہ تھی، ہم مذاق جو مل گئے تو دونون کی طرف سے تکلف کا پردہ اُٹھ گیا، دو تین گھنٹے اُنکی معیت مین نہایت دلچسپی سے گذرے، چند شعر مین نے سنائے، چند اُنھون نے، مذاقِ سخن کا اندازہ دونون نے اپنے اپنے دلون مین کیا، آخر وہ تو مجھکو تنہا چھوڑ کر اُتر گئے، میری منزل ابھی نصف سے زائد باقی تھی، تنہا کبھی لیٹ جاتا کبھی گھبرا کر ٹہلنے لگتا، کبھی کھڑکیون سے جھانکنے لگتا اور اسکے خمیازہ مین آنکھین ملنے لگتا۔

گاڑی مختلف اسٹیشنون پر ٹھہرتی ہوئی جیپور کے اسٹیشن پر بھی ٹھہری اور تقریباً آدھ گھنٹہ رُکی رہی، یہ راجپوتانہ کی ایک قدیم اور بڑی خودمختار ریاست ہے، جُہلا اسکو "جھاڑ شاہی" بھی کہتے ہین، مہاراجہ مادھو سنگھ جبتک جھاڑ شاہی گدی پر عیش و عشرت کی رنگ رلیون مین مصروف رہے، ریاست اپنی وضع و معاشرت مین سو برس پہلے کے تمدن پر باقی تھی، اور سختی سے قائم اب جب سے انکا خاکی جسم خاک مین مل گیا ہے، انگریزون نے ریاست کی عنانِ انتظام ایک محدود

عرصہ کے لئے اپنے ہاتھون مین لے لی ہے، اب "جھاڑشاہی" مین انگریزی تمدن پرورش پارہا ہے، پرانے کنول و موم بتیان اُتر رہی ہین، برقی رو دوڑ رہی ہے، نئے نئے انتظامات علم سے جو مین آرہے ہین نابالغ مہاراجہ اجمیر کالج مین تعلیم کے لئے بھیجدیئے گئے ہین، سُنا ہے کہ بعض مصالح سیاسی کے خوف سے جانشین جیپور کو کبھی کبھی "گھڑی سواری" آنے کے باوجود محلات مین جانے کی اجازت نہین ہے، سابق مہاراجہ کے حضور مین مجھکو بھی ۱۹۱۸ء مین باریابی کا موقع ملا ہے، اُنکی وضعداری میری نظرون مین اب بھی پھر رہی ہے اُنکی زبردست ڈاڑھی کا چڑھاؤ اُنکے چہرہ کو شاندار بنائے ہوئے تھا۔ کمر تک کا کرتہ اُنکے جسم توانا کو ڈھانکے ہوا تھا، دھوتی بندھی ہوئی تھی، مرحوم نواب سر محمد فیاض علیخان مجھ کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے گئے تھے۔

جیپور سابق مہاراجہ کے "جھاڑشاہی" عہد تک اپنی بے تعصبی مین بھی اپنی ہمسایہ ریاستون کے مقابلہ مین ممتاز رہا ہے، ہندو مسلمانون کے حقوق مہاراجہ کی نظرون مین قریب قریب مساوی تھے، بڑے بڑے عہدون پر مسلمان بھی رہتے تھے اور ہندو بھی، مہاراجہ مین اتنی مذہبیت ضرور تھی، کہ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے "گئوماتا" کے درشن کرتے تھے۔

جیپور کی عمارتین اکبری عہد کو یاد دلاتی ہین، نواب سر فیاض علیخان صاحب کی ایک کوٹھی تو مین نے مغربی طرز کی پائی ورنہ عموماً امراء اور راج کے ایوان تک اپنے قدیم ملکی وضع پر باقی اور اپنی مشرقیت پر نازان ہین، سڑکین چوڑی چوڑی اور اکثر محکمۂ صفائی کے توجہات سے صاف ستھری بھی نظر آگئی تھین، جیپور کی دکانون پر چنریان اور ریشمی کلابتونی ہلکے ہلکے بینک جوتے بکثرت دکھائی دیتے تھے جو جیپور کی صنعت کے خوبصورت نمونے ہین، صافے وہان عموماً باندھتے اور بہت خوبصورت باندھتے ہین، دُنبالہ دار سُرمہ عموماً لوگ بالالتزام لگاتے ہین، مسلمانون کے بھی جسم پر پائجامون کی جگہ دھوتیان دکھائی دیتی ہین، عورتون کا لباس بھی قدیم ہے جوان عورتین سُرخ

ڈول کی تان ہنستی ہیں اور گھونگھٹ بہت گہرا اور لمبا نکالتی ہیں۔

موسیقی کا گھر گھر چرچا ہے، شام کو گلیاں ہارمونیم و ستار کی مست صداؤں اور طبلہ و مردنگ کی سُریلی تھاپوں سے گونجتی رہتی ہیں۔

رات کو ۹ بجے اجمیر کے اسٹیشن پر اُترا، درگاہِ خواجہؒ کے خدام و مجاور وہاں مسافروں کی تاک میں لگے رہتے ہیں جو اُترتا ہے اسکو لڑ جھگڑ کر گانٹھ لے جاتے ہیں، میں نے اپنے پہلے اتفاق کی وجہ سے اس جہالت پر کچھ دیر تو تحمل کیا مشکل سے جان چھڑا کر ایک کے ساتھ اس لئے ہو لیا کہ وہ ہمارے شاہ آباد ریاستہ کے وکیل کا بھانجہ تھا۔ اُن سے اسٹیشن ہی پر یہ معلوم ہو گیا کہ مہاراجہ بہادر اب تک اجمیر نہیں پہونچ سکے ہیں، افسوس کرتا ہوا درگاہ کے بلند و بالا دروازہ تک پہونچا، تانگہ سے اُترا، کثیف گلیوں سے گذرتا ہوا سید محمد حنیف صاحب وکیل کے مکان پر پہنچا، بالاخانہ پر پہنچکر مجبوراً یقین کرنا پڑا کہ مہاراجہ بہادر کا انتظار ناگزیر ہے، وکیل صاحب نے بالاخانہ کے کمرے میں ایک دری بچھوا دی، خادم نے بستر اُسی پر کھول دیا پلنگ سے احتراماً وہاں کوئی نہ لیٹ سکتا تھا اس لئے کہ مزار خواجہ کا گنبد اس کمرہ کی کھڑکیوں سے صاف نظر آتا تھا، خیر کھانا کھایا اور سو رہا۔ دوسرے روز پھولوں کی چادر اور مٹھائی کا دونہ لیکر فاتحہ کے لئے خواجہ صاحب کے مزار پر گیا۔ اگر وکیل صاحب ہمراہ ہوتے تو وہاں کے خدام کپڑے بھی اُتروا لیتے، وہاں کے عام رواج کے مطابق تو میرے وکیل صاحب بھی یہ چاہتے ہونگے کہ سر بسجود ہو جاؤں کیونکہ وہاں مسلمان ہوں یا ہندو سب سجدہ کرتے ہیں مجھے اس رسم پر اس لئے افسوس ہوا بلکہ مسلمانوں کی جہالت پر صدمہ کہ اُنکی قرآن و حدیث سے ناواقفیت اس حد تک پہنچ گئی ہے، کاش مسلمان مولانا حالی کے مسدس کا یہ بند ہی پڑھ لیتے جسمیں پیغمبر اسلام کا فرمان نظم کر دیا گیا ہے: ؎

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم ۔۔۔ نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم ۔۔۔ کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم

مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اُسکا اور ایلچی بھی

وہاں تو سجدہ کرنے کی بھی ممانعت ہے، یہاں اگر کوئی ذرا بھی تکلف کرتا ہے تو خدام زبردستی گردن پکڑ کر سر جھکائے بغیر جبیں ہی نہیں لیتے وہ اپنے نزدیک تارک کی طرح اسکو بھی فرائض میں سمجھتے ہیں خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے گناہوں میں اسکا اضافہ نہیں کیا، میرے وکیل چونکہ بس پیدا و مہذب رگ تھے اس لئے اُنہوں نے وہاں کے طریقے تو بتائے مگر میری عقیدت کو ان طریقوں کے برتنے سے پامال نہ ہونے دیا جسکا میں ممنون ہوں۔

ہندوستان میں اسلام کی چھٹی صدی نوید مسرت لاتی ہے، راجپوتانہ کے عرب کا ریگستانوں میں اُس مجاہد اعظم کا گذر ہوتا ہے جسکو دنیائے ہندوستان ”سلطان الہند“ کے نام سے یاد ہی نہیں کرتی بلکہ اُسکے مزار پر عقیدتمندانہ سجدہ کرتی، طواف کرتی، رو رو کے دعائیں مانگتی، اور دربار خواجہ میں باوضو حاضر ہوتی ہے، یہ ”سلطان الہند“ خواجہ اجمیری ؒ وہ ہیں جنہوں نے پیغمبر عربی ؐ کی بشارت پر آنکھیں کھولتے ہوئے ہند کی طرف قدم اُٹھایا تھا، چالیس ساتھیوں کی معیت نے سفر کی مسافت کو آسان کر دیا تھا اور راہ پیمائی کے لئے اسلامی تذکروں نے ”افسانۂ کہن“ کی ایک دلچسپ حیثیت اختیار کر لی تھی، جس وقت پہلا قدم ہند کی سرزمیں پر پڑتا ہے تو بلند و بالا پہاڑ ادب سے ساکت ہو کر بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں، لق و دق میدان اپنے سکوت و سناٹے سے آپکی عظمت و احترام کا قدرتی نمونہ پیش کرتے ہیں پرندوں کی رفتار پرواز میں ایک سکون پیدا ہو جاتا ہے اور چرندوں کی آزاد کلیلیں ٹھٹھک کر رہ جاتی ہیں، بتھوڑی معبدوں کے بے حس بت اسلام کے ایک فقیر نما مجاہد کو دیکھکر اپنی زندگیوں سے مایوس ہو جاتے ہیں، خواجہ اجمیری ؒ کی نظروں میں اپنے ریگستانی مولد کے تابناک ذرّے چمکنے لگتے ہیں، آخر راجپوتانہ کو اپنا مرکز اس محبوب مناسبت سے قرار دیتے ہیں کہ اس ملک میں بھی عرب کی سی

ہوائیں آتی ہیں، یہاں بھی ویسا ہی پانی کا قحط ہے جیسا عرب کی پیاسی اور تپتی ہوئی زمین میں، یہاں بھی ریگستانی مناظر عرب کی یاد دلاتے ہیں، یہاں بھی بتوں کی کثرت عرب کے زمانہ جاہلیت سے کم نہیں ہے، یہاں بھی ہر رہ گزر کا ایک ایک بت ایسی ایسی جلوہ گری دکھا رہا ہے اور پرستش کے لئے پکار رہا ہے، یہیں سنتِ نبوی کو پورا کرنا چاہئے، یہیں توحید کی موثر صدائیں "اللہ اکبر" کی "صوتِ دلکش" سے بلند کرنی چاہئیں۔

خواجہ اجمیری پہاڑوں کے نشیب و فراز سے اترتے چڑھتے اجمیر کے جب اس مقام پر پہنچے ہیں جہاں تھوڑا کے اونٹوں کی چراگاہ اور اقامت گاہ تھی تو دو رکعت نماز ادا کرکے قدرتی فرش (زمین) پر بیٹھ جاتے ہیں، ساربانوں نے جب اپنے ہی جیسے چند انسانوں کو مگر غیریت و اجنبیت کے لباس میں دیکھا تو خواجہ اجمیری ہی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ "یہاں سے اٹھ جاؤ یہ جگہ تھوڑا کے اونٹوں کے بیٹھنے کی ہے نہ کہ غیر جنس مسافروں کے ٹھہرنے کی"، خواجہ جب انکے غیر مہذب طرز کلام سے تنگ ہو جاتے ہیں اور ہٹ کر تو یہ کہہ کر راستہ لیتے ہیں کہ "اچھا ہم تو اٹھے جاتے ہیں لیکن تمہارے اونٹ بیٹھے ہی رہینگے"۔

اناساگر تالاب[1] پر پہونچکر وضو کرکے نماز کا فریضہ ادا کرتے ہیں، یہاں اونٹوں کے محافظ اونٹوں کو اٹھانے پر اپنی جان لڑا کر قوت صرف کرتے ہیں مگر اونٹ اٹھنا تو کجا جنبش بھی نہیں کرتے ساربان جب عاجز ہو جاتے ہیں اور اونٹوں کے اٹھنے سے مایوس تو تھوڑا سے فریاد کرتے ہیں۔

---

[1] ۱۰۴۷ھ مطابق ۱۶۳۷ء میں شاہجہاں نے اپنے عہد کے یادگار کارناموں میں اس کا بھی اضافہ کیا، تالاب کی روانی کو چوڑائی میں ایک طرف پہاڑوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ گھیرے ہوئے ہے اور دوسری طرف شاہجہانی سنگ مرمر کی حسین بارہ دریاں، ایک برج پر پہاڑ کی چوٹیوں پر ایجنٹ گورنر جنرل کی عالی شان کوٹھی ہے اور گوشوں میں باغوں کی سرسبزی، شہر کے چار میل سے یہ مقام ایک دلچسپ تفریح گاہ کا کام دیتا ہے، انگریز بھی آتے ہیں اور ہندوستانی بھی، جوان بھی آتے ہیں اور بوڑھے بھی، غرضکہ دن بھر کے تھکے ماندے آتے والی کی ٹھنڈی ہواؤں سے دل بہلاتے اور سرسبز پہاڑوں کے قدرتی مناظر سے لطف اٹھاتے ہیں جس سے کبھی مرتبہ تھی وہ آنا ساگر کی سیر میں شاہجہاں کی اس سیاہ روح کے حصہ میں آنسوؤں کی ڈگیں طرح کی ہو اور سنگ مرمر کے کٹہرے پر جھککر یہ معلوم کس کس کو حسرت سے یاد کیا ہے۔

اجمیر اُس وقت پتھورا کی راجدھانی میں تھا اور پہاڑ کی چوٹیوں پر اُسکا پایہ تخت تھا۔ پتھورا کی
ماں نے پیشینگوئی کردی تھی اور سحر و طلسم کی ناسی قوت سے خواجہ اور خواجہ کے ساتھیوں کی صورتوں کی
تصویریں تک پتھورا کے مرنے سے پہلے محفوظ کرادی تھیں اور پتھورا کو سمجھا دیا تھا کہ ایک فقیر با مسلمان آئیگا
اُسکے اسقدر ساتھی ہونگے جو تیرے راج کو اُلٹ دینگے۔ پتھورا کو ماں کی پیشینگوئی خواب کی سچی تعبیر کیطرح
نظروں کے سامنے آجاتی ہے تصویریں نکلوائی جاتی ہیں اور معتمد علیہ جاسوسوں کو دیجاتی ہیں کہ وہ ان تصویروں
سے مسلمانوں کو پہچانیں۔ یہ لوگ تصویروں کے مطابق قریب قریب ہر ایک کو پاتے ہیں اور اُلٹے پاؤں
پھر کر پتھورا کو اطلاع دیتے ہیں۔ پتھورا اجئے پال جوگی کو بلا کر (جسکی جادوگری کے محیر العقول کرشمے قصبے
راجپوتانہ پر چھائے ہوئے تھے) کہتا ہے کہ یہی وقت وہ ہے جسکی پیشینگوئی ماتا جی کی تھی تیری تمام
قوتوں کے صرف کرنے کا وقت آگیا۔ اِن مسلمانوں کو اپنے طلسمی کرشموں میں پھنسا۔ پولیس و فوج کو
بھی احکام دیے جاتے ہیں کہ بغیر کسی قسم کی تکلیف دیے ہوئے سب کو حاضر کرو۔ اُدھر اونٹوں کے محافظ پتھورا
کی ہدایت کے مواقف خواجہ کو تلاش کرتے کرتے اناساگر پہونچتے ہیں اور خواجہ کے پیروں پر بے تحاشا
گر پڑتے ہیں اور رو رو کر کہتے ہیں کہ "ہمارے اونٹوں کو اُٹھا دو ورنہ ہماری روزیاں خطرہ میں پڑ جائینگی"۔
"سلطان الہند" اسلامی رحم و کرم سے کام لیکر فرماتے ہیں کہ "اچھا جاؤ اونٹ اُٹھ جائینگے"۔

اِدھر اجئے پال اپنے خوابیدہ جادو ایک ایک کر کے جگانا شروع کرتا ہے سلطان الہند کو غیب سے
امداد ملتی ہے اور ہر کارروائی کی اطلاع کانوں میں کسی کی بھیجی ہوئی پہونچتی ہے زمین پر ایک حلقہ کھینچ کر
اور اس میں اپنے عزیز ساتھیوں کو لیکر بیٹھ جاتے ہیں ہر ایک کو حلقہ سے نکلنے کی ممانعت فرما دیتے ہیں اور خود
خدائے قادر و توانا کی عبادت میں سر جھکا دیتے ہیں۔ اجئے پال کے جادو اپنے قوت کامل کے زعم میں ارض و
سما کا چکر لگاتے ہوئے سلطان الہند کے حلقہ سے دُور دُور پہونچتے ہیں مگر حلقہ سے باہر ہی بے اثر ہو کر
فنا ہو جاتے ہیں اجئے پال اپنی مسلسل ناکامیوں سے منفعل ہو کر جوش میں آتا ہے اور غصہ سے آگ بگولا ہو کر جادوؤں کی

بارش کر دیتا ہے مگر اسکی ہر بوند ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے اور خوش سماہی پر ہر جادو اپنی کامیابی کے لئے بجلی کی طرح تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہے، کہتے ہیں کہ جب جیپال نے گیارہ حملوں کی ناکامیاں یکے بعد دیگرے دیکھ لیں، تو مسفعلانہ شکست کو مزید صدمہ سے بچانے کے لئے ہرن کی کھال پر بیٹھ کر اڑتا ہے، خواجہ کی کھڑاؤں (نعلین) کو قدرت پرواز کی قوت عطا کرتی ہے کھڑاؤں مل ہو کر آسمان پر ایک بے ہیبت نظر آنے لگتی ہے جب جے پال کے سر پر اپنا غصبناک سایہ کر لیتی ہے تو جے پال کو بیٹھے بیٹھے زمین پر گرا دیتی ہے، جے پال خواجہ کے پیروں پر گر کر رحم کی التجا اور اپنی شکست کا اعتراف کرتا ہے، اور خواجہ کے حلقہ اسلام میں داخل ہو کر اپنے ہمیشہ نذر رہنے کی درخواست کرتا ہے، اسکا نام خواجہ نے "عبداللہ غول بیابانی" رکھا اور اسکے سپرد وہ خدمت کی جو بارگاہ خداوندی سے حضرت خضر کو ازل سے سپرد ہوئی تھی، یہ بیابانی بھی بھولے ہوؤں کو راستہ بتاتا ہے، پیاسوں کو پانی پلاتا ہے اور بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے اسکے نام سے اجمیر میں میلا ہوتا ہے اور فقرا گلیوں گلیوں اسکا نام لیکر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔

اجے پال ہرن کی کھال پر اڑتے اڑتے پتھورا سے یہ کہلا بھیجتا ہے کہ میری قوتیں تو مجروح ہو چکیں آخری حربہ قسمت کا فیصلہ کر گیا اب معبدوں میں "کنیا داتوں" کو پوجا کے لئے بھیجو۔ اگر ان مسلمانوں نے انکو عصمت دری کے لئے نہ چھیڑا تو سمجھ لینا کہ حق انکے ساتھ ہے، تمہاری مغلوبیت تقدیر! خواجہ کو القا ہو رہا ہے وہ اپنے ساتھیوں کو اس گروہ کی طرف نظر اٹھانے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ کپڑے جھڑے سجاتا ہوا رنگین گروہ معبدوں میں جاتا ہے اور بے حس و بے جان بتوں سے التجاؤں کی ناکام کوشش کر کے اپنے نقش قدم پر واپس ہوتا ہے۔ خواجہ مخاطب ہو کر دریافت فرماتے ہیں کہ "کہو تمہارے "خداؤں" نے تمکو طمانیت کی بھی کوئی جھلک دکھائی"، جواب سر کوبی کی ہلکی سی جنبش دیکر ملتا ہے، خواجہ اپنی روحانی قوت سے ان میں سے ایک بت کو انسان کی صورت میں بلاتے ہیں، وہ بت ہیکل اپنی عریانیت سے اس خوبصورت گروہ کو محجوب کرتا اور انکے دلوں کو دہلاتا ہوا

حاضر ہوتا ہے، سوا ایک کے سب خوف زدہ ہو کر اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتے ہیں، صرف پتھورا کی "شمع" خواجہؒ کے سامنے باقی رہ جاتی ہے، خواجہؒ کے باطنی نور کی کرنیں تیزی سے پڑتی ہیں "پتھوری شمع" آخر اسلام کے پہلے سبق کو پڑھ کر نورانیت کا لباس پہن لیتی ہے۔

اجے پال کی تمام قوت صرف ہو جانے کے باوجود پتھورا کی تمامت اعمال شکوہ موت کی دعوت دیتی ہی رہی، نشۂ حکومت میں سرشار رہ کر ایک مجاہد فقیر سے مقابلہ کا عزم کر کے میدان میں فوج لات کی آہنی دیوار قائم کر دیتا ہے، غیبی قوت محمد غوری کو فوج لے کر چڑھائی کرنے پر تیار کرتی ہے، حق و باطل کے معرکہ میں خون کی ندیاں بہتی ہیں، کفر و اسلام کی نبرد آزمائی کا تماشہ قدرت دیکھتی ہے، تلواریں میانوں سے نکلتی ہیں، مسلمان اپنی جانیں دے دے کر ابدی زندگی اختیار کرتے جاتے ہیں۔

خواجہؒ کی دعائیں عرش تک پہنچ کر قبولیت کے گہوارہ میں جھولتی ہیں، پتھورا زندہ گرفتار ہو کر اسیر حیثیت سے پیش ہوتا ہے، اس سے اتمام حجت کی جاتی ہے، مگر سر چڑھا ہوا بھوت کب اترتا ہے، قضا کب زندگی کے ڈھکوسلوں میں آتی ہے، فرعونیت کب سر جھکانے دیتی ہے، تعلیم و تلقین بھی جب بے اثر رہتی ہے تو قتل کر کے اس کی خود سر زندگی کو شکوں پہنچایا جاتا ہے۔

۵۳۳ھ میں خواجہؒ کی زندگی کی پہلی صبح سنجر میں طلوع ہوتی ہے، جس کی شام ۶۳۳ھ کے وسط میں اجمیر میں غروب ہوتی ہے۔ ۲۵ جمادی الثانی ۶۳۳ھ سے اُس صبح کی سہ پہر شروع ہوتی ہے، خواجہ اپنے حجرہ کو اپنی آنے والی شام کو "خوش آمدید" کہنے کے لئے بند کر لیتے ہیں تاکہ "ابدی شام" کا "فطری نقاب" اُلٹ دیا جائے۔ اور یہیں شانتی و سکون سے "اپنی شام" کو لبیک کہا، ساٹھویں سال عالم رویا نے تجرد کی زندگی کو خیرباد کہنے کی تعبیر دی، مختلف وقتوں میں دو مرتبہ سنّتِ نبوی پر عمل کیا، ایک صاحبزادی دو صاحبزادوں نے اُمّت میں اضافہ کیا۔ آخر عمر محو عبادت تھی، یہی افطار کے وقت سامنے آ جاتی تھی، اسی سے ۲۴ گھنٹہ تک سکون ہوتا تھا، [illegible]

حاص محبت تھی، اُنکی مفارقت ناگوار تھی، اب بھی پانچ من کا لنگر اسی آش جو کا غربا و مساکین کو صبح و شام تقسیم ہوتا ہے ایک وقت درگاہ کی طرف سے، ایک وقت اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے، گو غربا کے بھوکے پیٹوں کو اس سے تسکین نہیں ہوتی، مگر خواجہؒ کے صدقے میں پیاس بجھ جاتی ہے، صدیوں سے یہ لنگر خواجہؒ کی محبوب غذا کو یاد دلاتا رہتا ہے، اور یابدی سے یہ فیض خواجہؒ جاری ہے۔

صدیوں سے ستائیس گاؤں کی جاگیر درگاہ سے متعلق چلی آتی ہے۔ اکبر، شاہجہان، جہانگیر اور فرخ سیر کی شاہانہ فیاضیوں سے اب بھی ہزاروں بندگان خدا پرورش پا رہے ہیں، یہ جاگیر اِس طرح تقسیم ہے، کہ درگاہ کے مصارف کے لئے ۲ ½ گاؤں، خدامان درگاہ کی پرورش کے لئے ۷ ½، دیوان کے لئے دو، اور متولی کے لئے ایک، ۲۰ ½ گاؤں جو آستانہ کے مصارف کے لئے ہیں اُنکی آمدنی اِس وقت تقریباً ۸۰ ہزار روپیہ سالانہ ہے مگر آمدنی کی فراوانی پر نظر کر کے مصارف کی قلت قابل لحاظ ہے، اس میں سے بھی منتظمین درگاہ مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

درگاہ کا گنبد شیخ خواجہ حسین ناگوری کی خوش عقیدی یادگار ہے جو سنگ مرمر کا ہے، اور اندرونی حصہ میں خوبصورت نقش و نگار ہیں، مزار کے چاروں طرف چاندی کا شاہجہانی کٹہرا، اور میمن حاجی محمد کی چاندی کی سہری مزار کے شان و شوکت میں چار چاند لگا رہے ہیں، ہے، بیگمی دالان اور گنبد کے گرد و پیش کی سنگ مرمر کی حسین عمارتیں شاہجہان کی عصمت شاہزادی گیتی آرا بیگم کی بنوائی ہوئی ہیں، جو مزار خواجہ کی پائیں قیامت کی نیند سو رہی ہے۔

درگاہ کا نو تعمیر صدر دروازہ حضرت آصفجاہ سابع کی شاہانہ فیاضیوں پر نازاں اور اپنی ممتاز سربلندی پر فخر کرتا ہے۔ خزانہ آصفیہ سے پچاس ہزار کی گراں قدر رقم اِس پر صرف کر کے درگاہ اجمیر میں اپنی مستقل یادگار اور اُسی دروازے کے سب سے پہلی اور اونچی منزل پر نوبت و روشن چوکی بھی قائم کر دی ہے جس سے دن اور رات کے اکثر حصے موسیقی کی دلاویز صداؤں سے شاہانہ کر و فر کی

یاد مین مست و متاثر رہتے ہیں۔

سماع خانہ کی وسیع و کشادہ عمارت مملکت آصفیہ کے مرحوم وزیر نواب سر آسمان جاہ بہادر کی امارت کا یقین دلاتی ہے، یہی وہ عمارت ہے جسمیں عُرس کے موقع پر "حال و قال" کی متحرک محفلیں منعقد ہوتی ہیں، خوش الحان قوالوں کی صدائیں اسی کی مستحکم دیواروں سے ٹکرا کر "آواز بازگشت" کی مصداق ہوتی ہیں، اسی مین بوریوں پر بیٹھکر نادار مسلمان عربی کا درس لیتے ہیں، اسی مین "معینیہ عثمانیہ" کے نام سے عربی کی درسگاہ شہریار دکن کے علم دوست توجہات سے وجود مین آئی ہے، اسی مین سو برس پہلے کی تعلیم کا نمونہ نظر آتا ہے، اسی مین مُلاؤن کی وسعتِ نظر کا راز کھلتا ہے، اسی مین ہل ہل کر پڑھنے کا پچھلا سبق یاد آتا ہے، یہیں ایشیائیت اپنے اصلی رنگ میں دکھلائی دیتی ہے۔ جتنے مصارف خزانۂ آصفیہ کی طرف سے اِس درسگاہ کے لئے مقرر ہین اِس تناسب سے تعلیمی رفتار بہت سُست ہے۔

درگاہ کے چاروں طرف سینکڑوں حجرے ہین جو رامپور، ٹونک، اور ملارگڈھ کے خوش صفات فرمانرواؤن نے تعمیر کرادیے ہین جسمین غریب زائر سر چھپا لیتے ہیں، درگاہ کے اُس گروہی حصّہ مین جہاں خواجۂ محو خواب ہین چاندی کے دس دروازہ ہیں جو سیاحوں کو ہمیوں اور مسیح الملک دہلوی کے کسی خاندانی بزرگ کی یاد دلاتے ہیں کٹہرے و مسہری کے چاروں طرف نہایت قیمتی زرچوبی کام کے پردے پڑے رہتے ہیں، زردوزی کام کا مخملی غلاف گنبد کے اندرونی چہرہ کو چھپائے ہوئے ہے جو نواب حامد علیخان (رام پور) کا نذر کیا ہوا ہے گو اب بہت پُرانا ہو گیا ہے مگر اپنے معمل خط و خال سے اب بھی سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ مزار کے چاروں طرف مخملی غلاف مزارِ خواجۂ کو ڈھاکے رہتا ہے اسی غلاف کے چاروں کونون پر اللہ کے ساتھ ساتھ پنجتن پاک کے بھی نام نامی لکھے ہوئے ہین۔

تین بجے مزار پر صندل مالی ہوتی ہے اور شام کو مغرب کے وقت پہلے بد موم بتیوں کی روشنی ہوتی

ہے۔ روشنی کے وقت حاضرین مزار کے چارون طرف پروانون کی طرح جمع ہوجاتے ہین اُس وقت ہر شخص عاجزی مانگتا اور منتین ماتا رہتا ہے۔ یہی موم بتیان وہ شمعدانوں مین لگائی جاتی ہین جنکو دو آدمی اپنے اپنے سرون پر رکھکر ادب سے کھڑے رہتے ہین۔ کلام مجید کی مقررہ آیت کو تلاوت کیا جاتا ہے اسکے بعد یہ شمعدان بطور حصول ثواب ہر شخص اپنے سر پر رکھوتا ہے اِس رسم کے بعد شمعدانوں سے موم بتیان نکال نکال کر کٹہرے کے چارون طرف مقررہ مقامون پر نصب کردی جاتی ہین۔

نو بجے شب کو (جسکی وہاں پانچ بجے اصطلاح ہے) فراشہ ہوتا ہے اور دس بجے (جسکی اصطلاح چھ بجے ہے) آستانہ کے دروازے بند ہوجاتے ہین، اِن اوقات کی پابندی صدیون سے جاری ہے، مین پہلے تو حیران تھا کہ نو بجے کے وقت ایک خادم پکار کر کہتا ہے کہ پانچ بجے ہین اور دس بجے وہی آکر پکارتا ہے کہ چھ بجے ہین۔ غور کرنے کے بعد سمجھ مین آیا کہ قمری مہینہ کے حساب سے اُس زمانہ مین فراشہ اور آستانہ بند ہونے کے اوقات یہی ہونگے، چونکہ ہم لوگ قدامت پرست ہین، اِسکو بھی وحی آسمانی کے قریب تر سمجھتے ہین، تبدیلی اگر گناہ نہین تو وضعداری کے خلاف ضرور ہے

سر کریم بھائی فضل بھائی کی دولتمندی کی روشن یادگار بجلی کی روشنی ہے، جس نے درگاہ کے گوشہ گوشہ سے ظلمت کا نام ونشان مٹا دیا ہے، بیگمی دالان مین متعدد بجلی کے حوض وجھاڑ لٹک رہے ہین۔

یونانی شفاخانہ بھی آستانہ خواجہ سے متعلق ہین کئی حکیم مطب کرتے اور درگاہ کی جاگیر سے تنخواہین پاتے ہین، بیمار زائرون کا علاج اور اُنکی دیکھ بھال کرتے ہین۔

دانیال اور دانیال کی مان کی قبرین درگاہ کے صحن مین واقع ہین، جو گلستان اکبری کا نہر لڑ خانہ نظام سقہ کی بھی اسی درگاہ مین قبر ہے جس نے ہمایوں کو ڈوبنے سے بچایا تھا اور جس کا چمڑے کا سکہ چلائی دن کے لئے تاریخ کی زبان پر موجود ہے۔

درگاہ کے احاطہ میں متعدد مسجدیں بھی ہیں، جو اکبر، شاہجہاں اور عالمگیر کی اسلامیت کا علم بلند کئے ہوئے ہیں، شاہجہانی مسجد سنگ مرمر کی ہے جسمیں ایک وقت میں ہزاروں سر جھکاتے ہیں، اس میں پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ہوتی ہے، عالمگیری مسجد کو بھی نمازی نماز کی موثر صداؤں سے خاموش نہیں رکھتے، مگر اکبری مسجد سنسان رہتی ہے اور نمازیوں سے اکثر خالی، اُسکی جسمانی حالت بھی خستہ و خراب ہے منتظمین درگاہ اگر اپنے آثار قدیمہ کی دیکھ بھال اور انکی تربیت کی "سرپرستی" کرتے رہیں تو وہ عمارتیں جو ہمارے سلف کی زندہ یادگار ہیں اپنی جنکی بربادی کی خاموش داستاں ستاحوں کو سنا سکیں گی، مرنے والوں کو جلانے بنانے کی توفیق دی تھی، ہم قایم رکھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔

درگاہ اجمیر کی دیگیں ہندستان میں بہت شہرت رکھتی ہیں، تین ساڑھے تین صدیوں سے اسکا رواج چلا آتا ہے، ملا بدآری جو مالوہ کا رہنے والا تھا اُسکے کرتبوں سے ان کا وجود ہوا۔ سب سے پہلے اُسی نے دونوں دیگوں کو بنوایا اور لٹوایا، بڑی دیگ سو من غلہ سے لبریز ہوتی ہے، اور چھوٹی اس سے نصف ہیں، یہ دیگیں لوہے کی چادروں کی ہیں، انکو میں دیگ تو نہ کہونگا۔ ہاں اُنکی صورت اور ساخت کے اعتبار سے "کڑھاؤ" کہہ سکتے ہیں۔ اسکے لوٹنے کا ہنگامہ میں نے بھی اپنی آنکھوں سے خود دیکھا، مہاراجہ بہادر بالقابہ بھی تشریف فرما تھے اور ایک انگریز بھی جو غالباً اجمیر کا اسسٹنٹ کمشنر تھا، اجمیر کی ہزاروں مخلوق بھی تماشائی تھی، جس وقت متولی صاحب نے چھانجھ بجوایا ہے (یہ لوٹنے کا عام اعلان ہے) تو وہ لوگ جو بکواتے ہیں "خاندانی لٹیرا" کہونگا، اپنا صرف مُنہ تو کھلا رکھتے ہیں بقیہ تمام جسم کا حصہ یعنی پیر تک گودڑ نما لباس میں لپیٹ کر اور ڈوریوں سے مضبوط کس کر اُس حوض نما گرم گرم "کڑھاؤ" کے اندر سیڑھیوں کے سہارہ سے کود جاتے ہیں اور بالٹیوں میں بھر بھر کر اپنے گروہ کے آدمیوں کو دیتے جاتے ہیں "کڑھاؤ" کے پیچھے بڑے بڑے برتن اُن میٹھے چاولوں کو

جمع کرنے کے لئے رکھے رہتے ہین، اس مین بھرتے جاتے ہین، اُن لوگون کے گودڑ نما کثیف کپڑون سے تو وہ تبرک کسی نفیس مزاج شخص کے چکھنے کے بھی قابل نہین ہوتا، غیر قومین اہین وحشیانہ حرکتون پہ مسکراتی ہی نہین بلکہ قہقہہ لگاتی ہین، ہم اس قہقہہ کو زندہ دلی کا مرادف سمجھ کر اور اسکو اپنا مذہبی کارنامہ یقین کرکے قرآن و حدیث سے بیگانہ ہوے ہین۔ یہ "موروثی لٹیرے" اس عقیدتمندانہ تبرک کی تجارت کرتے ہین، روپیہ کماتے ہین، اور دو دو آنہ چار چار آنہ مین ایک ایک پیالہ بیچ ڈالتے ہین، ہندو مسلمان دونون اس مین مبتلا ہین کاش پکوانے اور لٹوانے والے اس خطیر رقم کو مستحقین و غربا پر حصہ رسدی تقسیم کردیا کرین تو اس صورت سے حقیقی ثواب سے قریب تر ہو جاینگے اور خواجہ صاحب کی برگزیدہ روح اس سے بہت زیادہ مطمئن و خوش ہو سکے گی۔ اگر غور کیا جائیگا کہ اس رواج مین کہان تک معقولیت ہے اور کس حد تک مذہبیت اور اس مذہبیت کو قرآن و حدیث نے کہان تک سراہا ہے تو اُمید ہے کہ سمجھدار ہستیان آسانی سے بہترین نتیجہ پر پہونچ جائینگی۔

سید نثار احمد صاحب متولی ہین، اور سید آل رسول صاحب دیوان، انکے اعزاز و مراتب کا فرق اس طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر جمعرات کو جو محفل سماع ہوتی ہے اور نیاز، اسمین شرکت کے لئے متولی صاحب اور دیوان جسوقت اپنے روحانی اختیارات کی حفاظت کرتے ہوے تشریف لاتے ہین تو اول الذکر کے جلو مین دو چوبدار، چار چپراسی، ایک مشعل اور ایک قندیل ہوتی ہے۔ آخر الذکر کے ساتھ صرف ایک مشعل، دو قندیلین اور دو چپراسی ہی ہوتے ہین، مگر آخر الذکر کی واپسی کے وقت صرف مشعل ہی رہبری کے لئے رہ جاتی ہے، یہ رسم صدیون سے جاری ہے، جس وقت یہ حضرات اپنا گیروا لباس زیب تن کرکے مسند تولیت و دیوانی پر متمکن ہوتے ہین تو حاضرین محفل دوڑ دوڑ کر "دست بوسی" کا فرض سنگ اسود کی ابراہیمی سنت کی طرح ادا کرتے ہین، کیونکہ اُسوقت اُنکے روحانی اختیارات کا بادل درگاہ کی فضا پر چھایا ہوتا ہے، یہ حضرات پہلے مزار پر حاضر ہوکر سجدہ

ساز بجا لاتے ہین، جاتے وقت دہلیز کی جبہ سائی حسین یہاں پر خاک آستانہ صیقل کر دیتی ہے۔ اِن فرائض اسلامی کو پورا کرتے ہوئے اپنے اپنے عشرت کدوں کو واپس ہو جاتے ہین۔

درگاہ کا تمام نظم و نسق متولی کی نگرانی میں ایک کمیٹی کے سپرد ہے، اجمیر کی گورنمنٹ اُن لاینحل مسئلوں کا فیصلہ اپنی آخری قوت سے کر دیتی ہے، جنکو کمیٹی کے ممبران انصاف و صداقت سے طے نہین کر سکتے۔

اجمیر کی عام گذرگاہین اور وہان کا تمدن و معاشرت میرے لئے تو مطلق دلچسپی کا باعث نہین ہوا، مین نے گلیوں کے بھی چکر لگائے اور سڑکون کی بھی خاک چھانی، گلیان متعفن تھین اور سڑکین بھی مرمت و صفائی سے بے نیاز، گلیوں اور سڑکوں، بالاؤں اور راستوں مین نظر سوز چہرون کا بھی مطالعہ کیا، مگر یہان جیسے میرے مطالعہ کو ندامت ہوئی اور شکست، ویسا میری نظرون کو کہین شرمسار ہونا پڑا تھا حزان سیہ کلیون کی افراط و فراوانی کو دیکھتے ہوئے سواری پر بیٹھا یا معدہ کو ہلکا کرنے کی غرض سے پیدل اپنی آنکھون کو اپنا ہی مطالعہ کرنے کی ہی ہدایت کرتا مگر کبھی کبھی باوجود "عہدِ ہدایت" کے اگر آنکھین اپنی فطری شوخیون پر آجاتین تو اپنی "تماشے ناکام" پر "صبر شکن" نوحہ پڑھتی ہوئی جھک جاتی تھین۔

آنا ساگر کے قریب پہاڑ کی ایک چوٹی پر عشق و محبت کی وہ خوش قسمت ہستیان وصال حقیقی کا لطف اُٹھا رہی ہیں جنکو ہندوستان "منصور موہنا" کے نام سے یاد کرتا اور تاریخ انکی بےبسی کی داستان دُہرایا کرتی ہے، اُنکی قبرون کو بھی بغیر "پروانہ راہداری" کوئی دور سے بھی نہین دیکھ سکتا سمجھ مین نہین آتا کہ ان مُردہ ہستیون کا شمار کس صنف کے قیدیوں مین کیا گیا ہے جو باوجود قیامت کے انتظار مین مقید ہونے کے نہ رہا ہوتے ہیں اور وہاں تک کوئی فاتحہ ہی کا خاموش پیام سنایا جا سکتا ہے یہ حکومتِ عشق کے تو مسلمہ مجرم ہین جسکے سرفروش لیڈر مجنون و لیلیٰ، وامق و عذرا، شیرین و فرہاد

اُن مین ایسی ایسی زندگیون مین عشق و محبت کا اولین سبق پڑھکر فضیلت کی پگڑی بندھوا چکے
ہین، اِن فاضل لیڈرون نے ہجر و وصل کی کانفرنسین کی ہین اور غمزہ و ناز کے رزولیوشن پاس کیے
ہین، یہی اُس حکومت کا مطمحِ نظر تھا اور یہی اُس حکومت کی سیاست، منصور موہنا نے بھی اِسی
سبق کو دلون مین پڑھا تھا اور اسکے معنی و مطالب کا یقین کرکے پریم محبت کے ابتدائی فلسفہ کو
ذہن نشین ہی نہیں کر لیا تھا بلکہ اُسکے گہرے نقوش دلون پر بن گئے تھے۔ "منصور موہنا" کا عشق
مسلمانون اور ہندوؤں کا اتحادی عشق ہے، مہاتما گاندھی کی صدائیں حسن اتحاد کو پکارتی ہیں
"مُنصور موہنا" نے صدیون پہلے اسکی خوشگوار بنیاد رکھدی تھی، خدا کرے کہ زندہ گروہ اُن کے درس
عشق کو دُہرانا شروع کر دے۔

جہان خواجہ کی روحانی حکومت ہے، وہان سیاحون کے لیے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے
کہ نہ ٹھہرنے کے لئے مہذب ہوٹل ہین اور نہ آرام سے رہنے کی صاف ستھری جگہین، بازاری کھانے
سوا اگر ایک وقت "مبتلائے اعتماد" ہوکر بھوک کی بڑھی ہوئی شدت حلق کے نیچے زبردستی اُتار بھی دے
تو دوسرے وقت اُسکی "حسِ ذائقہ" بھوکا رہنے پر سختی سے آمادہ رکھتی ہے، تھوڑے زمانہ سے گو
اسٹیشن کے چند قدم پر "کنگ ایڈورڈ میموریل" کی سنگی عمارت اِس قابل ہوگئی ہے کہ وہان سیاح
دو چار روز مسافرون کی طرح زندگی بسر کر سکین، مگر اِس یادگار کے منتظمین نے بھی کھانے پینے کے
انتظام سے بدستور لاپروائی برتی ہے۔

اجمیر مین ایک ہفتہ قیام کے بعد مہاراجہ بہادر باقاعدہ تشریف لائے جنکی ملاقات نے میری کلفتون کو
دُور کر دیا، چونکہ بمبئی مین مہاراجہ بہادر کے قیام کے لئے کوٹھی کا انتظام میرے سپرد ہو گیا تھا،
اِس لئے ۲۵- دسمبر ۱۹۲۵ء کو آٹھ بجے بی بی ریل سے روانہ ہوگیا، ناظرین سے وہین ملاقات
ہوگی جہان پہونچنے کے لئے مین بیتاب ہون۔

اجمیر سے روانگی کے وقت احباب اجمیر نے از راہ مسافر نوازی مجھکو الوداع کہنے کی زحمت
اسٹیشن تک گوارا کی یعنی وہاں آئے اس کے اس خلوص کو مین ہمیشہ یاد رکھونگا، میل ٹرین بھرا ہوا تھا،
لیکن احباب کی جستجو نے ایک سیٹ کو خالی دیکھکر میرا سامان وہین رکھدیا، ریل کی روانگی کے بعد اُن
لوگون کے مطالعہ مین مصروف ہو گیا جو میرے ہمسفر تھے، لیکن باوجود کوشش کے مین نے اُن مین کوئی
بات ایسی نہیں پائی جو میرے لئے باعث دلچسپی ہو سکتی، اِس لئے اپنے آپ کو بیگانہ بناکر ایک طرف
خاموش بیٹھ گیا اور احمد آباد تک اسی طرح بیٹھا رہا، احمد آباد میں اُتر کر گجرات میل مین سوار ہوا، اور
اور چونکہ جگہ کافی تھی اِس لئے پوری ایک سیٹ مجھے مل گئی اور کپڑے اُتار کر لیٹ گیا۔

احمد آباد ڈیڑھ سو برس تک سلاطین گجرات کا پایہ تخت رہا ہے گیارھوین صدی میں اسکی
بنیاد ڈالی گئی تھی، سبرمتی ندی جسکا طول دو سو میل ہے اس پر احمد آباد واقع ہے اسکا رقبہ گریٹ
برٹن کے برابر ہے یہ ہمیشہ سے صنعت و حرفت اور علم و ادب کے لئے مشہور رہا ہے یہاں صدیوں سے
پہلے عربستان اور مصر سے تجارت ہوا کرتی تھی، ۱۳۹۱ء میں ایک ہندو راجپوت جس نے اسلام قبول
کیا تھا، اور مظفر کے نام سے مشہور ہوا، اسکے پوتے سلطان احمد نے ۱۴۱۲ء میں احمد آباد کو اپنے نام کا
آخری جزو دیکر احمد آباد دار الحکومت بنایا۔ پرانی جینی عمارتین مسجدین بن گئین اور جو بھی عمارتیں
تعمیر ہوئین وہ بھی جینی طرز کو لئے ہوئے۔ اگر احمد آباد کی عمارتون سے مینار، محرابین اور کتبے نکال
دیئے جائین تو اتنے سے تغیر سے یہ عمارتین ہندو طرز کی صحیح نمونہ ہو جائینگی، ۱۵۷۲ء میں اکبر نے
احمد آباد کو فتح کیا، اُس وقت سے یہ سلطنت مغلیہ کا ایک جزو بن گیا، ڈیڑھ سو برس تک دار الحکومت
دہلی سے اسکے والی مقرر ہوا کئے۔ انہین شاہجہان اور عالمگیر بھی اپنی اپنی شاہزادگی کے زمانہ میں
اِس صوبہ کے والی کی حیثیت سے حکمرانی کرتے رہے ہین، مغلیہ زمانہ مین احمد آباد ترقی کے آخری زینہ
پر پہونچ گیا تھا۔ اِسکا شمار ہندوستان کے نہایت پُر شان و پُر رونق شہروں میں ہوتا تھا، بلکہ اُس

وقت یہ کہا جاتا تھا کہ اسپی گوناگون خوبیون کے لحاظ سے بھی اسکی نظیر دنیا مین نہ تھی اُسوقت
کی مردم شماری کے لحاظ سے بھی جو ۲۰ لاکھ تھی اس وقت کے بڑے بڑے شہرون کی مردم شماری سے
بڑھا ہوا تھا۔ یہان کے تاجر اور سیاح عرب، افریقیہ اور ہند کے تمام ملکون سے تعلقات رکھتے
تھے یہان کی صنعتین زربفت، مخمل، ساٹن، ریشمین کپڑا اور کاغذ وغیرہ ہر جگہ مشہور تھین، احمد آبادی
سفید چکنا کاغذ اب بھی ہندوستان مین مروج ہے اور ساہوکار لوگ اسی کے بنے بہی کھاتے استعمال کرتے ہین،
دکن مین بھی اسکا بازار کھلا ہوا ہے یہان کے صناع لکڑی، سونا اور ہاتھی دانت کے کام مین کمال
رکھتے تھے اسوقت بھی صندل کی صندوقچیان جن پر منبت کاری اچھی طرح ہوتی ہے اور جو مینی کی صنعت سے مشہور
ہین۔ احمد آباد کی اسلامی عمارتون مین ہندو طرز غالب ہونے کی وجہ سے ایک ایسی خصوصیت پیدا
ہوگئی ہے جو دوسری جگہ مطلق نظر نہیں آتی یہان کی مسجدون کا نقشہ بالکل وہی ہے جو عموماً اسلامی
مساجد کا ہوا کرتا ہے یعنی ایک بہت بڑا مستطیل صحن جسکے گرد بٹی ہوئی غلام گردش ہے اس مستطیل صحن کے
مغرب جانب "سجدہ گاہ" ہے اور اس پر عموماً تین گنبد ہین جنمین سے ہر ایک جینی عمارتون کیطرح بارہ ستونون پر قائم ہے
بیچ کا گنبد زیادہ بلند ہے یہ بلندی اسطرح حاصل کیگئی ہے کہ جن ستونون پر یہ قائم ہے وہ دوسرے گنبدونکے ستونون سے
دو چند بلند ہین اس درمیانی گنبد کے تین جانب چھت پر گنبد قائم کئے گئے ہین اور ان پر وہ دونون گنبد دائین اور
بائین قائم ہین۔ یہ جینی عمارتون کا طرز احمد آباد کے سوا کہین پایا نہین جاتا اور اسکا بڑا فائدہ یہ ہے کہ عمارتون کے
اندر روشنی کثرت سے آتی ہے جب کبھی مسجد کے اندرونی رقبہ کو بڑھانے کی ضرورت ہوئی، گنبدون کی تعداد
بڑھا دی گئی۔ مثلاً احمد آباد کی بڑی مسجد مین بجائے تین گنبدون کے پانچ گنبد ہین جن مین سے
ہر ایک بارہ ستونون پر قائم ہے۔ انہین پانچ گنبدون کو عمق میں سہ چند بڑھا دیا گیا ہے اور اس طرح
پندرہ گنبد بن گئے ہین جن کی وجہ سے عمارت کی وسعت انتہا بڑھ گئی ہے ان مسجدون مین جسقدر
طاقچے ہین انکے اندر اقلیدس کی شکل کی سنگتراشیان کی گئی ہین، اُن اصلی مسجدون مین جنکو بدل کر

یہ مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں، یہ سب طاقچے سنگی مورتوں سے بھرے ہوئے "خدائی" دعوی کر رہے تھے، چونکہ انکی خدائی اسلام کے خدا نے مٹا دی تھی اور ان طاقچوں سے ان مورتوں کو علیحدہ کر دیا تھا، اس لیے ان طاقچوں کا خلوا قلیدسی شکلوں میں بھر دیا گیا۔

احمد آباد کی تاراجی میں مرہٹوں نے بھی کافی دلچسپی لی تھی، شاہجہان کے مقید عہد میں عالمگیر کے بھائی عالمگیر کی سختیوں سے جان چھڑاتے ہوئے یہاں سانس لیا کرتے تھے اور دوجون کی تیاری میں مصروف رہتے تھے، اب ہندوستان کے قائد اعظم مہاتما گاندھی کا مرکز ہے، جہاں گاندھی آشرم ہے اور جہاں سے "ینگ انڈیا" انگریزی زبان میں، اور "نوجیون" گجراتی میں نکلتے ہیں۔ اب یہاں کھدر کی کاشت کی جاتی ہے پہلے "ہمگر" (جولاہے) اس کاشتکاری کے لئے قدرت کی طرف سے پیدا ہوتے تھے اب اس نے ہندوستان کے ہر طبقے کو زبردستی چرخہ کی موسیقیت کا متوالا بنا دیا ہے اور اس "بنجر زمین" کو تعلیم یافتہ ہاتھوں سے بھی ہموار کرانے کی کوشش کی جاتی ہے، احمد آباد اپنے روایات کو اب بھی لئے ہوئے ہے اور اپنی وضعداری پر نازاں۔

دس بجے رات کو "گجرات میل" احمد آباد سے چھوٹا اور بمبئی کے راستہ پر اپنی تیز رفتار کے ساتھ روانہ ہو گیا، تقریبًا ایک گھنٹہ تک تو میں جاگتا رہا آخر آنکھیں تھکیں اور بند ہوئیں اور پھر صبح کے پھر نہ کھلنا تھیں نہ کھلیں، جس وقت میری آنکھیں کھلی ہیں تو بمبئی کے گرد و پیش کے عریاں مناظر میری خواب آلودہ آنکھوں میں سمائے جا رہے تھے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو آٹھ بجے بمبئی کے گرانٹ روڈ اسٹیشن پر گجرات میل پہونچا، گو میرا ٹکٹ کلابہ تک تھا، مگر وارڈن روڈ کے قربت کی وجہ سے یہیں اتر گیا، دروازہ پر ٹکٹ دیکر باہر آیا، جہاں وکٹوریہ گاڑیاں کثرت سے باقاعدہ صف میں کھڑی ہوئی تھیں، ایک پر اسباب رکھوا دیا اور بیٹھ گیا، کوچبان کو وارڈن روڈ چلنے کی ہدایت کی جہاں ہمارے "خداوند نعمت" سرکار رام پور چند دنوں سے

"سرسٹ سلیبن" مین فروکست ہین ملٹی کے بلند و پست راستے گھوڑون کو موت کا پیام دیتے رہتے ہین، حقیقت یہ ہے کہ جب بے زبان جانور چڑھائی پر چڑھتا ہے تو اسکے جسم کا رونگٹا رونگٹا پسینہ مین ڈوب جاتا ہے مگر بے زبان والون کی زحمت کا احساس واقعی نہین ہوسکتا تو بے زبانون کی حقیقی تکلیف کا احساس تو ناممکنات سے ہے، عربی گھوڑے نے کچھ راستہ تو مدہم دلکی سے طے کیا اور کچھ لمبی دلکی سے، غرضکہ گھنٹہ بھر مین اسی نے منزل مقصود پر پہنچکر دم لیا۔ جانورون کی علو ہمتی ہم انسانون کے لئے سبق آموز ہے۔ ارادہ کی پختگی اور ہمت کی بلندی مستحکم قلعے فتح کرلیتی ہے کسی کسی غیر معروف زمینون کا پتہ لگا لیتی ہے، جزیرے کو بیچا دکھا دیتی ہے، ہندوستان پر اپنا تسلط جما لیتی ہے، اسلام کی اشاعت اور ملکون کی تسخیر اسی ارادہ کی پختگی اور ہمت کی بلندی کی روشن مثالیں ہین۔ عرب کے ریگستان مین پیغمبر اسلام، کربلا کے بیابان مین حسینؑ، اجمیر کے کفرستان مین خواجہ چشتیؒ، اور ریف کے پہاڑون مین امیر المجاہدین کو دیکھئے، کلمبس، نپولین اور فرہاد کے ہمت و ارادہ سے سبق لیجئے یہ وہ تاریخی افسانے ہین جو ہمارے ارادہ کی کمزوری اور ہمت کی پستی کا موازنہ کرسکینگے۔

سنہ عیسوی سے پہلے اس جزیرہ (ملٹی) کے باشندے زراعت پیشہ اور ماہی گیر تھے جنھون نے اسکا نام اپنی دیوی "کالس" کے کسی مجسمہ پر "ممیا" رکھا تھا، قصبہ کی صورت مین اس جزیرہ کی پہلی آبادی راجہ بھیم (۱۳۶۸ء) کے عہد کی ممنون ہے، اس نے جزیرہ (ممیا) کے قالب کو بدلا اور نام تک تبدیل کرکے "مہیمؔ" رکھا، ۱۳۴۸ء تک اس پر ہندو راج رہا۔ بعد کو شاہان گجرات نے لڑ بھڑ کر اپنا ہلالی پھریرا اڑادیا اور ۱۵۳۴ء (۱۸۶ برس) تک یہاں "اللہ اکبر" کی تکبیرون کے موثر نالے بلند ہوتے رہے۔ پرتگیز سب سے اجنبی قوم ہے جس نے ہندوستان کا راستہ تلاش کیا، اسکے نقش قدم پر برطانیہ نے بھی سمندر کو عبور کرکے ہندوستان کے زرخیز ساحل کو

سلہ ملٹی مین اس نام کا محلہ اب تک باقی ہے۔

اپنی دُکان لگا دی' انکی حریص نگاہیں اس قصبہ پر پڑی تھیں اور اُسکی زرخیزی انکی مستقل دولتمندی کا یقین دلا رہی تھی۔ ۱۵۱۴-۱۵۱۶ء میں اسکو قبضہ مین لانے کے لئے لڑائی کی گئی جب فتح و نصرت کی صورت مین جنگ کا خاتمہ ہوا تو ۱۶۲۶ء میں "سورت کاونسل" نے پرتگیزوں کو فروخت کرنے کا پیغام دیا۔ ۱۶۵۴ء مین کمپنی کے ڈائرکٹروں نے کرامویل کی عنان اس طرف موڑی اور اسکو بندرگاہ کی خوبیون اور اسکو ہر ممکن تدبیر سے مغلوب کرنے کے پہلو دکھلائے اس کامیابی کے آثار خلوت کے راز و نیاز سے پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۶۶۱ء مین شاہ چارلس ثانی (انگلستان) کا عقد "شاہزادی" انفنٹا کیتھرائن سے ہوتا ہے پرتگیز یہ جزیرہ ملکہ دوسرے ملحق جزیرے بھی شاہزادی کے جہیز میں شاہِ برطانیہ کو لطفِ مسرت سے مغلوب ہو کر دے ڈالتے ہیں، اس وقت اسکی آبادی صرف دس ہزار تھی' اب دس بارہ لاکھ ہے' سات ہی برس کے بعد ۱۶۶۸ء مین شاہ چارلس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہ جزیرہ عطا فرما دیا بمبئی کا رقبہ ۲۴ مربع میل ہے تقسیم ملکی کے لحاظ سے بمبئی مغربی ہند کا ایک ممتاز حصہ سمجھا جاتا ہے اسکا وقوع ایسی مناسب جگہ پر ہوا ہے کہ یورپ کے لئے اس سے قریب تر ساحل کوئی ہو ہی نہین سکتا اور نہ تجارتی منڈی اس سے بہتر ہو سکتی ہے اس مغربی ساحل پر مسافرون اور مال کے اترنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لنگرگاہ تو نہایت عمدہ و موزون ہے مگر مال کے اُترنے کے رستے کم ہیں' کئی سال سے ساحل پر "انڈین گیٹ" (ہندوستانی دروازہ) تاج اور گرین ہوٹل کے سامنے بن رہا ہے جو اپنی بلندی کے لحاظ سے ہند کا دروازہ کہا جا سکتا ہے۔

مین اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے بمبئی کی جادہ پیمائی کرنے پر دن بھر مجبور تھا، البتہ رات کو آزاد ہوتا تھا، اور اُس وقت میرا چلنا پھرنا میری خوشی پر ہوتا تھا، فلک نما عمارتوں سے بجلی کی تیز شعاعون کو میں نے سمندر مین غوطے لگاتے دیکھا ہے اور یہ ایسا پر لطف منظر ہوتا ہے

کہ اگر نظام کائنات کو بدلنے کی ہمیں قدرت رکھتا تو سب سے پہلے جس تبدیلی کے لئے اپنی طبیعت کو متوجہ کرتا وہ بمبئی میں آفتاب کی حکومت کا زوال ہوتا۔

بمبئی کو حُسن کی مادے سے تعبیر کرنا ایک واقعہ کا اظہار ہے، وہاں قوموں کا مجموعہ ہے، عرب بھی ہیں اور عجم بھی چینی بھی ہیں اور جاپانی بھی۔ انگلش بھی ہیں اور جرمنی بھی۔ خوجے بھی ہیں اور بوہرے بھی۔ کاٹھیاواری بھی ہیں اور ہندوستانی بھی، مگر وہ حُسن جہاں پرتگیزوں نے اپنا پہلا ڈیرہ (گوا) ڈالا تھا، جاذب نظر ہی نہیں بلکہ قدرت کے ناقابل برداشت جلوے رکھتا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ انسان کے لئے یہ مصیبتوں کا مرکز ہے۔

وارڈن روڈ کا کنارہ سمندر کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھے "سمرسٹ پیلس" کی وہ منزل جہاں ہمارے تاجدار رامپور کی خوابگاہ تھی، وہاں سے سمندر کی لہروں اور بیقرار موجوں کی اٹکھیلیاں دیکھنے کے قابل تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان اپنی پیاس بجھانے کے لئے کھڑے ظرف (سمندر) میں بیقراری سے منہ ڈال رہا ہے۔

"سمرسٹ پیلس" کا گلی میں واقع ہونا ناموزوں ہی نہیں بلکہ حقیقتاً حُسن کی اہانت ہے، پیلس میں پہونچکر پہلے صاحب چیف سکرٹری بہادر رامپور سے ملا، پھر سیڑھیوں کے سہارے سے اُس منزل پر پہونچا، جو میری اقامتگاہ تجویز ہو چکی تھی، سفر کے تکان سے پریشان تھا اور گرمی کی شدت سے بیچین۔ سب سے پہلے غسل خانہ میں گیا اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد صاحب ممدوح کی خدمت میں پہونچا، اُنکے ساتھ ناشتہ کیا اور پھر صاحب پرائیویٹ سکرٹری بہادر کی معیت میں کوٹھی پسند کرنے کے لئے روانہ ہوا جہاں ہز ایکسلنسی سر مہاراجہ بہادر بالقابہ اقامت گزین ہونگے، واکشیر پراپکیسے منزلہ کوٹھی تین ہزار روپیہ ماہوار پر لیگئی

جس وقت قیامگاہ پر واپس آیا ہوں تین بج چکے تھے اور "شہریار" رامپور خواب راحت سے بیدار ہو چکے تھے "قصر عالی" کا سکوت چہل پہل سے بدلا ہوا تھا، چوبدار نے حضرت پیر و مرشد کی یاد فرمائی کا حکم سنایا، قدموں کو آہستہ اٹھاتا ہوا "بارگاہ عالی" تک پہونچا، "آداب گاہ" پر جُھکا اور

تسلیمین بجالایا بیٹھنے کی اجازت ملی تو سلام کرکے فرش پر دوزانو بیٹھ گیا۔ اعلیٰ حضرت اپنی
وضع و معاشرت کی سادگی میں ایشیائی بادشاہون کے سچے جانشین ہین۔ ڈیڑھ ہزار کا وزیر او
یکپیس و یکہ کا اہلکار ظل سبحانی کے شاہانہ دربار مین مساوات کا مرتبہ رکھتا ہے۔ بندگان عالی کے
اسلامی اخلاق اور شاہانہ سادگی ہر انسان کو مساوات کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ بے تکلف
باتین کرتے اور برادرانہ طریقہ سے تخاطب فرماتے ہین، اپنی خداداد ذہانت اور قوی حافظہ کی وجہ
سے بڑے بڑے علمار کو حیران کر دیتے ہین تاریخ ہو یا فلسفہ، فقہ ہو یا حدیث پالٹکس ہو یا سائنس مذہب
ہو یا مناظرہ، اعلیحضرت کے معلومات کی وسعت سمندر کی وسعت و گہرائی کا یقین دلاتی ہے جس نے
ایک مرتبہ گفتگو کی اسکو اپنے حافظہ و ذہانت کی شکست کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔

بڑی دیر تک حضور پرنور مہاراجہ بہادر کے تذکرہ اور اُنکی آمد کی خبر سُنکر حقیقی مسرت کا اظہار
فرماتے رہے، عصر کی نماز کا وقت چونکہ ختم ہوا جاتا تھا اِس لئے بندگانِ عالی نے اُس معبود حقیقی کے
حضور مین گردن جھکا دی جو مغرب کا بھی مالک ہے اور مشرق کا بھی، جنوب مین بھی اُسکی خدائی
ہے اور شمال مین بھی، پانی پر بھی قابض ہے اور ہوا پر بھی اُسی کے اشارہ سے سورج گرمی پہنچاتا ہے،
اور اُسی کے کنایہ سے چاند ٹھنڈک۔ مین اُسی روز مہاراجہ بہادر کا خیر مقدم کرنے کے لئے احمد آباد
واپس جانے کے لئے تیار تھا، بندگانِ عالی سے جب اجازت ملی تو سلام کرکے باہر آیا، اور
گرانٹ روڈ اسٹیشن کا راستہ لیا، اُسوقت میری معیت مین ایک نوجوان لمپوسی حکیم بھی تھے اُس
وقت ترشح ہو رہا تھا اور سڑکون پر دو طرفہ بجلی کی روشنی چاندنی کا دھوکہ دے رہی تھی، سڑکون اور
چوراہون پر پولیس کا انتظام مستعدی کا ثبوت دے رہا تھا، یہان کے پولیس کی وردی ہندوستان
کے دوسرے ملکون سے بالکل علیحدہ ہے خصوصاً ٹوپیون (پگڑیون) سے پرانے زمانے کے برہمنون
کی وضع آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اِس پگڑی مین اتنی مغربیت ہے کہ انگریزی ٹوپیون کی طرح

ایک چمڑہ کا تسمہ نیچے لگا رہتا ہے، ہر جو ہر لے ہے پر ایک ایک گورا کھی ایسی ڈیوٹی کے ثبوت مین بھیگ رہا تھا مگر فرض کی بجا آوری مین بارش انکے لئے زندگی کا فرحت بخش غسل تھی، گورے افسر اور پولیس کے کالے جوانون کے ہاتھون کی بلندی ہر موٹر کو اپنی جگہ پر کھڑا کر دیتی تھی اور ہر گنتوہ کو روک دیتی تھی اگر اس احتیاط سے کام نہ لیا جاتا تو ہر سڑک انسانی جانون کی قربانگاہ بنجاتی۔

دس بجے گجرات میل پھر اُسی طرف لئے جا رہا ہے جدھر سے لایا تھا، دوسرے روز دس بجے احمد آباد کے اسٹیشن پر اُترا، جہان مہاراجہ شاد باالقابہ اپنی امیرانہ سادگی کو لئے ہوئے اپنے پیارے و مہذب بچون کے ساتھ پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ فرسٹ اور سکنڈ گاڑیون کا ملاحظہ ہو چکا تھا، اسباب منتقل ہو رہا تھا، مہارانیان اور بیگمات چھوٹی لائن کی گاڑیون سے اُتر کر اُن پر سوار ہو چکی تھین، راجہ پلٹن کے مسلح سپاہیون چوبدارون، خدمتگارون، حقہ بردارون، فراش، پہرے والے اور ماماؤن سے پلیٹ فارم پر خاص چہل پہل تھی، جس سے دکن کے وزیر اعظم کے امیرانہ کروفر کا یقین ہو رہا تھا، مین نے موقع پا کر راجہ اقبال چند بہادر کے ساتھ احمد آباد کے رفرشمنٹ روم مین کاٹھیاواری ذائقہ کا برکفاسٹ کھایا، کھلانے والون کی بدسلیقگی اور اُبلے ہوئے کھانون کی لذت میرے حافظہ و ذہن کو ہمیشہ یاد رہیگی، مگر وہ غریب اپنے ملکی ذوق سے مجبور تھے، خیر ۲ دو بجے ٹرین نے پلیٹ فارم کو چھوڑا۔ ہز اکسلنسی کی امیرانہ فیاضی کی عالمگیر شہرت نے اسٹیشن پر مہذب فقیرون کی بھیڑ لگا دی تھی، ہر ایک کی اُسکی حیثیت کے مطابق تواضع کی گئی۔

راستہ مین بعض نئے واقعات پیش آئے، اگر اُنکو بھی لکھون تو مضمون بہت طویل ہو جائے، چڑھتے اُترتے، سوتے، جاگتے، کلابہ اسٹیشن پر میری منزل ختم ہو گئی، اس وقت ۸ بجے صبح کا وقت تھا، بوندین پڑ رہی تھین، رامپور کے پرائیوٹ سکرٹیری بہادر جو خاندان شاہی سے منسلک ہونے کے علاوہ ایک مغربی تعلیم یافتہ اور خوش خلق و مہذب انسان ہین مع ایڈیکانگ کے موٹرون، گاڑیون اور

خمار شب اُتارنے والی چیز (حیا) لئے ہوئے ہز اکسلنسی کا خیر مقدم بارش کے ساتھ کر رہے تھے۔ نواب لیاقت جنگ بہادر جو ہز اکسلنسی کے ہمدمی اور حکومتِ آصفیہ کے پیشتر تعلقہ دار ہیں ایسی صورت و شکل کے لحاظ سے اگر خالص یوروپین نہیں تو سرد ملک کی پیدائش کا یقین دلاتے ہیں گو وضع و معاشرت کے لحاظ سے انگریز نما ہیں مگر باطنی خصائل کے لحاظ سے اسلام کے دلدادہ ہیں یہ بھی ہز اکسلنسی کو "خوش آمدید" کہنے کے لئے کلابہ پر موجود تھے، ہز اکسلنسی اور اُنکے محلات نے وہیں چائے پی۔

اِسلامی پردہ نے اسٹیشن کو رامپوری قناتوں سے چھپا دیا تھا، مہارانیاں اور بیگمات اُتریں، موٹروں پر سوار ہوئیں، میری حیثیت اُس وقت "خضرِ طریقت" کی تھی، آگے آگے میرا موٹر راستہ صاف کرتا ہوا رہبری کا کام دے رہا تھا اور میرے موٹر سے ملے ہوئے کئی موٹروں کی قطار جن پر ہز اکسلنسی محلات کے ساتھ بمبئی کے متمدن مناظر دیکھتے چلے آ رہے تھے۔ ہز اکسلنسی مع تمام اپنے اسٹاف کے ہمارے آقائے ولی نعمت تاجدار رامپور کے مہمان عزیز ہوئے۔ ہز اکسلنسی اور ہز ہائینس کی روزانہ ملاقاتیں جس محبت و خلوص سے ہوا کرتی تھیں اُسکا اظہار میرے قلم سے ناممکن ہے خدا کرے کہ مشتاق آنکھیں اُس منظر کو دوبارہ دیکھ سکیں۔

(مطبوعہ نگار)

⁂

مدھنا ئک بلگرامی

ہندوستان میں بلگرام کا وہی مرتبہ ہے جو دنیا میں یونان کا ہے علم و فضل تو گویا اس قصبہ کی میراث رہے ہیں، علامہ عبدالجلیل، علامہ سید مرتضیٰ، اور حسان الہند علامہ آزاد کی بہاریں اگر پچھلی صدیوں نے دیکھی ہیں تو تیرھویں صدی بھی ان سے شرمندہ نہیں رہی، اس نے بھی نواب عماد الملک بہادر شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی اور میجر سید حسن بلگرامی ایسی ہستیاں پیدا کر کے اُنکے فضل و کمال کے ڈنکے چار دانگ عالم میں بجوا دیئے آخر الذکر دونوں ہستیاں اپنی زندگیاں پوری کر کے پیوند زمین ہو گئیں مگر اُنکے علمی کارنامے اُنکی ہمہ دانی کے افسانے ہمیشہ زبانوں پر رہینگے خدا نواب عماد الملک بہادر کے محترم وجود کو دیر گاہ سلامت رکھے جنکی باوقار شخصیت سے بلگرام اب بھی زندہ ہے اور جنکی تجلی کمالات سے ہندوستان و یورپ اب بھی روشن۔

پچھلی صدیوں کے بلگرامی فضلا نے اگر عربیت میں اپنے سکے بٹھا کر عرب کو مرعوب کر رکھا تھا تو اس صدی کے بھی کاملین نے ششدر کر دیا ہے، پچھلے فضلا اگر بھاکا میں تلسی داس اور کبیر داس کے ہم پلہ نظر آتے تھے تو ڈاکٹر بلگرامی کی جامع ذات نے کیمبرج یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے سنسکرت مرہٹی اور تلنگی کا درس دیکر جرمنوں اور ہندی پنڈتوں کو مدتوں متحیر رکھا۔

یہ ذکر آج کا ہے کل کی سرگزشت یہ ہے کہ اگر گوالیار میں "تان سین" دیپک راگ سے آگ لگا دیا کرتے تھے تو بلگرام میں مدھنا ئک "میگھ راگ" سے اُن بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ابر رحمت سے ٹھنڈا کر دیا کرتے تھے، سطور ذیل میں اُسی باکمال سے تعارف کرانا ہے۔

سید نظام الدین "مدھ نایک" کا بلگرام میں وہی زمانہ ہے جو گوالیار میں "تان سین" کا تھا،
ایک فن کے دو اُستاد ایک وقت میں آگ اور پانی پر حکمرانی کر رہے تھے۔ ایک کو (تان سین) اکبری
عہد نے چمکایا، دوسرے (مدھ نایک) کو چادرِ گمنامی نے چھپایا۔ مدھ نایک بلگرام ہی میں پیدا
ہوئے، بلگرام ہی میں نشو و نما پائی اور بلگرام ہی میں جان دی۔ صغرویٰ سادات میں اُن کا بھی شمار ہے
ابتدا میں نظم و نثر سے طبیعت کو لگاؤ رہا۔ فارسی اس پایہ کی تھی کہ مستعدی سے درس دیتے تھے،
ہندی سے دلچسپی ہوئی تو بنارس کو سنسکرت بھاشا کا مرکز سمجھ کر وہاں جا پہونچے، پڑھا اور دل
لگا کر پڑھا، موسیقی ازل سے ساتھ لیکر آئے تھے پیدا ہوتے ہی دُنیا میں آنے کے لئے روئے تو وہ رونا
بھی لَے سے خالی نہ تھا، قدرت نے تعلیم دی تھی، کمسنی ہی میں چرچے ہونے لگے شہرت کی مست خوشبو
پھیلنے لگی، بلگرام میں میں نے بوڑھوں بوڑھوں سے سنا ہے اور روایت سینہ بسینہ چلی آتی ہے، قرینہ
بھی اسکو نہیں جھٹلاتا، تان سین کے کانوں میں جب مدھ نایک کی سُریلی اور پاٹ دار صدائیں
پہونچنے لگیں تو وہ اس قدر مشتاق ہوا کہ گوالیار سے پیدل سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے جب
بلگرام کی سرزمین پر قدم رکھا اور پہنچیں کوئیں کے قریب دم لینے اور پانی پینے کے لئے ٹھہرا تو دیکھتا
ہے کہ کوئیں پر مرد عورتیں پانی بھر رہے ہیں۔ انہیں سے ایک عورت نے جب کوئیں کے اندر گھڑے کو
ڈالا تو وہ گھڑا بتدریج ڈوب کر اپنے خالی جسم کو سیراب کرنے لگا اور ڈوبنے کے وقت جو "بُڑ بُڑک
بُڑک" کی ایک بے اختیار آواز اُس گھڑے سے پیدا ہوئی تو اُس عورت کو اِس وجہ سے ناگوار
گزری کہ "موا بیوقت کا راگ الاپتا ہے" اور یہ کہکر وہ اُسے توڑ ڈالتی ہے یہ صدا تان سین کے
کانوں میں بھی پڑتی ہے وہ حیران ہو کر دریافت کرتا ہے تو وہ "مدھ نایک" کے گھر کی کنیز بتائی جاتی ہے
تان سین کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی ہے، وہ دل میں کہتا ہے کہ جسکے یہاں کی ایک لونڈی
اِس قدر موسیقی کی جاننے والی ہے تو خود آقا کی مہارت کا کیا عالم ہوگا جس کا میں مشتاق ہو کر اتنی

دُور سے آیا ہوں، کنیز اپنی اُنگلیوں کی حرکت اور رسّی کے سہارے سے اُس ظرف میں بھی موسیقی کی صوتِ دلکش پیدا کرنا چاہتی تھی، اتفاق سے وہ دلکشی کرختگی سے ہمنوا ہوگئی، کنیز کی برہمی، نزاکت احساس و رکاوٹ کی سچائی تحسین و داد کی مستحق ہے کہ وہ اپنے گھر کے فطری مذاق کو بیجان چیزوں میں بھی اُسی طرح دیکھنا چاہتی تھی، تان سین نے طے کرلیا کہ مدھنا نک سے ملنے کی آرزو لئے ہوئے واپس چلا جاؤنگا۔ چنانچہ اُلٹے پاؤں واپس ہوتا ہے، مدھنا نک کو اطلاع ہوتی ہے وہ اپنے معزز مہمان کو اس طرح واپس جاتے سن کر بیتاب ہوجاتا ہے اور خود جاکر لے آتا ہے۔ علامۂ آزاد بلگرامی "سروِ آزاد" میں لکھتے ہیں کہ "مدھنا نک" فنِ موسیقی میں نائک مانے تسلیم کرلئے گئے تھے، اسی رعایت سے مدھنا نک تخلص رکھا، ہندی موسیقی میں علم نادو تال اور سنگیت میں یکتائی کا سار بجایا "نادچندرکا" "مدھنا نک سنگار" انکی مستقل تصنیفیں انکے کمال کی یادگار ہیں، مدھنا نک کے راگ مشہور ہیں گوئیے انکا نام لیکر کان[1] پکڑتے ہیں۔

مدھنا نک کے گانے سے تنہا انسان ہی متاثر نہیں ہوتے تھے اُڑنے والے طیور بھی اپنی اُس لچکدار شاخ کو اُس وقت تک کے لئے اپنا مستقل نشیمن بنا لیتے تھے جبتک مدھنا نک کے گلے سے موسیقی کی بارش تھم نہ جاتی تھی، چلنے پھرنے والے جانور بھی کھڑے کے کھڑے رہ جاتے تھے۔ علامہ آزاد لکھتے ہیں کہ "ایک سال پانی نہ برسنا تھا نہ برسا۔ سید محمد فیض بلگرامی نے مدھنا نک کی خدمت میں عرض کیا کہ پچھلے عہد کے نائکوں کے تصرفات زمانہ کی زبان دُہرایا کرتی ہے آج کل امساک باران سے بندگانِ خدا پریشان و تباہ ہورہے ہیں، موسیقی کی زبان میں بارگاہِ احدیت میں دُعا کیجئے، مدھنا نک نے اپنے عجز کا اقرار اور خدائے بزرگ و برتر کی ہر شئے پر قدرت کا اظہار کیا، کرسی

---

[1] مرزا صائب نے "دوگوش گرفتن" تعظیم کے محل پر صرف کیا ہے اس سے پایا جاتا ہے کہ ایران میں بھی کسی کا نام لیتے ہوئے تعظیماً کان پکڑ لیتے ہیں، صائب کا شعر ہے ؎

آتش بعساں گوش بہ تعظیم بگیرند ۔۔۔ ہر جا کہ بہ من سوختہ را نام برآید

منگوائی اور سید محمد قیص کے دیوان خانہ کے صحن میں بچھوا کر بیٹھ گئے اور "میگھ راگ" کو اُس وقت
تک گاتے رہے جبتک ابر کے ٹکڑے آسمان پر نمودار ہو گئے۔ حالانکہ اس راگ کے چھیڑنے سے
پہلے مطلع بالکل صاف تھا، راگ جوں جوں اثر پذیر ہوتا گیا اُسی رفتار سے ابر کے ٹکڑے بھی
اِدھر اُدھر سے آ آ کر آسمان پر پھیلتے گئے اور آپس میں مل مل کر "وصال حقیقی" اور "اتحاد باہمی"
کا سبق دینے لگے۔ ابھی مدھنا نائک اُٹھنے بھی نہ پائے تھے اور ابھی "دعائے موسیقی" کو ختم بھی نہ کر سکے
تھے کہ ابر نے آسمان کو چھپا کر اپنی مطلق العنان حکومت کا دنیا میں اعلان کر دیا، خشک
و پیاسی زمینوں کو جی بھر کر سیراب کر دیا جل تھل بھر دیئے، ندی نالے بہا دیئے۔

علامہ آزاد نے **سرو آزاد** میں لکھا ہے کہ "مدھنا نائک کو ایک ہندو دوشیزہ (سُندر)
سے عشق ہوا، عشق کامل تھا، اور محبت صادق، سُندر بھی مدھنا نائک کی حقیقی کشش سے
بے اختیارانہ کھنچی چلی جا رہی تھی، گل و بلبل کی محبت کے راز و نیاز برسوں پھولوں کے کنجوں میں سہمے ہوئے
رہے، مگر وہ عشق کیا جو بدنام نہ ہو، وہ محبت کیا جو رُسوا نہ ہو، گُل کھلتا ہے خوشبو پھیلتی ہے،
گلیوں گلیوں کو مست و معطر کرتی ہوئی سُندر کے خاندان والوں کے بھی دماغوں کو برہم کرتی ہے
ہندوؤں کا گروہ مدھنا نائک کے درپئے آزار ہو جاتا ہے، مگر ع

"دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی"

خاندان والے ان محبت کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو چھینٹوں سے نہیں بجھا سکتے تھے اسکو محسوس کر کے
سُندر اپنے پرستار کی دائمی پرستش کے لئے دل و جان سے طیار ہو گئی اور مدھنا نائک کا سہارا
لیکر شاہ آباد (ضلع ہردوئی) چلی گئی، وہاں پہونچکر اسلام کے اُس نور سے سُندر کو آراستہ کیا گیا
اور اُس گرہ سے عشق و محبت کی لڑ کو ہمیشہ کے لئے مضبوط کر دیا گیا جسکو کلمہ کے بعد عقد سے تعبیر
کرتے ہیں، کامل عشق اور صادق محبت اس طرح سے جلوت سے خلوت میں منتقل ہو جاتی ہے، ذالک ما ال لدن

رئیس شاہ آباد مدھنانک کی شایان شان مدارات کرتے ہین، مہمان رکھتے ہین، بہت دنون حلبِ و محبوب ہین رہتے ہین، تاکہ مخالفین کی آتش غضب ٹھنڈی ہو جائے، سندر کے خاندان کو کی شورش دَب جائے۔ اسکے بعد بلگرام گئے اور مدتون زندہ رہے۔

بلگرام کے ایک باغ مین موسیقی کا یہ بولتا ہوا سارصدیون سے صورِ اسرافیل کے انتظار مین خاموش پڑا ہے اسکی قبر پر ایک املی کا درخت سایہ کئے ہوے ہے، یہ تو مین نے بھی دیکھا ہو کہ گانے والے اور گانے والیان املی کی پتیان اسقدر عقیدت و رغبت سے کھاتی ہین جس طرح جانور ایسی غذا سمجھ کر کھاتے رہتے ہین۔ علامہ آزاد لکھتے ہین کہ مدھنانک لطیفہ گوئی اور نکتہ سنجی مین بھی فرد تھے، جس صحبت مین بیٹھ جاتے تھے ہر ایک اُنہین کی طرف متوجہ ہو جاتا تھا تاکہ ع

"یہ کہین اور سُنا کرے کوئی"

اخلاق کے مُتلے تھے مروّت جزو ایمان تھی، سخاوت اپنی حیثیت سے زیادہ کرتے تھے، ناکام کسی کو واپس کرنا مدھنانک کے مذہب مین کفر تھا جو سادات کے حقیقی اوصاف تھے۔

مدھنانک کے پانچ کبت علامہ آزاد نے "سروِ آزاد" مین لکھے ہین، لیکن چونکہ ناظرین کے لئے وہ نا مانوس صدا ہوگی اس لئے ہم صرف ایک کبت نقل کر کے انکے رنگ شاعری کو بھی دکھلا دینا چاہتے ہین۔

(کبت)

جو چِترا تن جیت چڑھے، نہ پڑھے مدھ بیدن گرنتھ سہ گائے

فرشتہ دل، ترکیبِ صوت، مغلا کتب اسمائی، قدیم کتابیں

بھار تھی، بھوری کری بھرین، جپ جوگن، جوگ ابھیہ گنائے

گویائی، سبھائی ریاضت مرتاض

مکھ جوت جگی، نہ تھکی مدھانک، گھونگھٹ جھیل تائے

چہرہ   روشنی ماہ ساعر،   شوخی،

جھلیں دو کول، جیسے جھلکی، ایچھ، براحت، رچھ رچیائے

باریک دوپٹہ، ریت بیا، سے مستل، ورلیست کرنا،

یہ کبت "سندر" کی آنکھون کا قصیدہ ہے مطلب یہ ہے کہ تیری آنکھیں نقاب کے اندر جسقدر خوشنما ہیں اُسکی خوبی فرشتون کے بھی خیال مین نہین آسکتی اور نہ آسمان کی کتابون مین اُنکی توصیف پائی جاتی ہے۔ قوتِ نطق خود محو حیرت ہے، اور زاہد مرتاض سبحہ گردانی سے بھی زیادہ اسکا مداح ہے، نقاب ان آنکھوں کی خوبی کو چھپا نہین سکتی، بلکہ باریک دوپٹہ اسکی خوبی کو دوبالا کر دیتا ہے۔

(نگار)

ایک بزرگ قوم کی حالت

جو سرسید کا ساتھی اور علمی دنیا کا ایک روشن چراغ ہے گو ٹمٹا رہا ہے مگر اب بھی مغرب و مشرق
مین اسکا اُجالا پھیلا ہوا ہے، اسکا اسم گرامی مولوی سید حسین صاحب بلگرامی ہے اور نواب عماد الملک
بہادر کے لقب سے بھی دنیا اسکو پکارتی ہے، علمی دنیا مین اسکا جو درجہ ہے، انگریزی علم ادب اُسکو جو عبور
ہے اسکا یورپ کو اعتراف ہے، عربیت جس پایہ کی ہے اُسکو زمانہ جانتا ہے اب وہ ہے اور پیری کی
ناز برداری اور بیماریون کی مدارات! آنکھون کی بصارت عرصہ سے مضمحل ہو چکی، اب پیرون نے
بھی جواب دیدیا اور نقل و حرکت سے مجبور!

سنہ ۱۹۲۱ء مین یہ بزرگ قوم ایک گاڑی سے ٹکر کھا کر گر پڑتا ہے (غالبًا انگلینڈ کا واقعہ ہے)
کولے کی ضعیف ہڈی ٹوٹ جاتی ہے، جو علاج کے بعد جڑ تو جاتی ہے مگر پاؤن ڈیڑھ انچ چھوٹا ہو جاتا ہے
مجروح کولے مین درد پیدا ہو جاتا ہے جو بڑھتے بڑھتے اپنا مستقل نشیمن بنا لیتا ہے، علاجون کا ایک
غیر متناہی سلسلہ قایم رہتا ہے مگر درد ہے اور اسکا وہی ثبات، ایک بوڑھے پر اپنی جوانی کا زور صرف
کر رہا ہے اس سے پیچھا چھڑانے اور اسکی قوت کو گھٹانے کے لئے جنوبی ہند کے حکیمون اور ڈاکٹرون نے
کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا مگر ظالم درد بدستور اپنی ابتدائی حالت پر باقی ہے ایک بزرگ کو مسلسل چار
سال سے ستا رہا ہے کسی طرح اُسکی علمی ہڈیوں سے کنارہ نہیں کرتا، بغیر دو آدمیون کے سہارہ کے
نہ یہ بزرگ چل پھر سکتا ہے اور نہ اُٹھ بیٹھ، نہ کسی علمی مشغلہ مین اپنا فطری انہماک صرف کر سکتا ہے اسکی
دنیا اسوقت صرف ایک پلنگ ہے! اور کتب و اخبار اسکی دماغی تفریح کلام مجید کا ترجمہ انہین بیماریون کی وجہ سے

ادھورا پڑا ہے اور دیگر علمی مشاغل ہیں صدمات کے سبب سے معطل ا

اسکی علمی فیاضیاں ندوہ سے پوچھیئے، دارالمصنفین سے دریافت کیجئے، علیگڑھ کی بنیادوں مین ڈھونڈھیئے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کاغذات کا مطالعہ کیجئے، دکن کی انقلاب پسند سرزمین سے سوال کیجئے، دائرۃ المعارف کتب خانہ آصفیہ اور مدرسۂ عالیہ کی در و دیوار سے جواب لیجئے، ہر ذی روح اور غیر ذی روح وجود اسکے بیشمار کارنامے بیان کرنے کے لئے بیچین ملیگا، ہمیشہ علم کی خدمت کی، طالب علمانہ زندگی بسر کی اور اپنی خوابیدہ قوم کو بیدار مشورے دیئے، وہی بزرگ چار سال سے تڑپ رہا ہے، پریشان ہے اور مضطر، درد سے پیچھا چھڑانے سے مایوس ہے اور نا امید۔

مین اس محترم طبقہ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو حاذق طبیب ہیں اور سند ی ڈاکٹر۔ جنوبی ہند کے حکما و ڈاکٹر اپنی اپنی تدبیرین کر چکے، اب شمالی ہند کے طبیب و ڈاکٹر اپنی حکیمانہ کوشش صرف کرین، درد کے دور ہونے کی تجویزین بتائیں، مفید مشوروں سے ایک نس رگ کی تکلیف کو دور کرین، اسکا درد قوم کا درد ہے، اسکی صحت قوم کی صحت ہے، اسکی صحتیابی سے علم و قوم کی زندگی ہے اسکی تندرستی سے قرآن کریم انگریزی مین قیامت تک کے لئے زندہ ہو سکیگا، مسیحی دنیا پڑھ سکیگی اور اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے بہرہ مند ہو کر تثلیث کے تین ٹکڑے کر ڈالیگی، پادری سیل اپنے ترجمہ پر نازان نہ رہ سکیگا، سیل مسیحی پادری ہے، نواب بلگرامی اسلامی سیل کی عربی اکتسابی ہے، نواب بلگرامی کی قومی و فطری۔

غرضکہ اسکی تندرستی کے لئے قوم کا ہر فرد دعائین مانگ رہا ہے اور اسکی سلامتی کے لئے درگاہ رب العزت مین گڑگڑا رہا ہے، مجھے امید ہے کہ میری یہ خواست ڈاکٹروں و طبیبون کی حکیمانہ بارگاہ مین پذیرائی کا درجہ حاصل کریگی اور وہ اپنی پہلی فرصت مین اس درد کا درمان بتائینگے، مجھ پر تو اس کا مستقل احسان ہوگا، مگر قوم بھی تشکر و امتنان کے لئے تیار رہیگی۔

(مطبوعہ روزنامہ "ہمدم" ۔ مورخہ ۵ ۔ مارچ سنہ ۱۹۲۵ء)

چار مینار

سولھوین صدی مین جب قطبیہ حکومت دکن مین رندہ تھی، تو کٹورہ حوض کیوڑہ گلاب سے لبریز
ہو کر ادام بیگمات کی سیر دریا کا کام دے رہا تھا جس مین سبک کشتیاں خوبصورت ہاتھون سے کھیلیان
بیٹھ رہی تھیں۔ اسلامی پرچم گولکنڈہ کے قلعہ پر لہرا رہا تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ اپنے آزاد تخت
سلطنت پر حکومت کی زندگی کی آخری سانسین لے رہا تھا۔ آرائشون اور زیبائشون سے ملک سدھر
رہا تھا۔ تمدن کے بے پناہ جلوے بے نقاب ہو رہے تھے۔ مذہبی عقائد آفتاب کی تیز کرنون سے
ٹکرا رہے تھے۔ قطب شاہ کو ایک مذہبی یادگار قایم کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور وہ "چار مینار" کی بنیاد
مذہبی جوش کو لئے ہوے اپنے عقیدتمند ہاتھون سے ڈالتا ہے جس شکل میں اسوقت "چار مینار" دنیا
کے سیاحون کو نظر آتا اور حیرت زدہ کر دیتا ہے وہ چالیس برس کی مدت مین ہزارون کاریگرون کی
کی شبانہ روز محنت اور لاکھون تھیلیون کی خزانہ شاہی سے جدائی کے بعد اپنی ہستی کو صدیون کی عمر دیکھا۔
یہ ایک پتھر کی محراب دار مربع شکل کی زرد پوش عمارت ہے جسکا ہر ضلع سو فٹ کا اور جس کے
میسارون کا ارتفاع ۱۸۴ فٹ اور محرابون کا پچاس فٹ ہے، وسط شہر مین یہ واقع ہے جہاں چار
سڑکین ایک دوسرے کے ہم ردیف اور ایک دوسرے سے پہلو جوڑے ہوے اپنے اتحاد پر نازاں اور اپنی
اس مستقل یکجائی سے خوش ہین۔ یہ حیدرآباد کا نہایت گلزار و آباد "چوراہہ" ہے، جہان تجارتی دکانیں
زندگی کے جملہ سامانون کو اپنے آغوش مین لئے ہوے ہر وقت کھلی رہتی ہین۔
کہتے ہین کہ اسکی سب سے آخری اور اونچی منزل پر ایک "ڈیڑھ اینٹ" کی مسجد بنی ہے جسکو

ممکن ہے کہ بسانے والون یا تین سو برس کے پہلے مرنے والون نے دیکھا ہو- اور "سر تسلیم" بھی خم کیا ہو ورنہ عام طور سے تو اللہ کے نام لینے والے اور اُس گھر مین مؤدب کھڑے ہونے والے خوش نصیبی سے محروم ہی نہیں، بلکہ اس لئے محجوب بھی ہین کہ اس "آسمانی کوٹھے" سے "محلات شاہی" اُسی طرح بے پردہ دکھائی دیتے ہین جسطرح زمین پر رینگنے والون کو "چار مینار" نظر آتا ہے-

سولھوین صدی مین جبتک عمارت اپنے شباب کی تیاریوں میں ہمہ تن مصروف تھی عین اُسی زمانہ مین ایک فرانسیسی سیاح کا دکن مین گزر ہوا تھا جس نے اسکی دلکش سمائیون کی داستان اپنی زبان مین یورپ والوں کو سُنائی تھی -

حکومت آصفیہ کے سکون (اشرفی روپیہ) کے ایک رُخ پر اِسی عمارت کی تصویر نے زمین کی گولائی کی طرح قبضہ کر رکھا ہے- جس نے آصفی سکہ کو خوبصورت سے خوبصورت تر بنا دیا ہے- اور اور پچھلے تاریخی کارنامہ کو سونے چاندی کے ٹھوس صفحوں پر ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا-

(مطبوعہ روزنامہ ہمدم مورخہ ۲۱ مئی ۱۹۲۵ء)

سیاسیات

رامپور مین ہندؤن کی زندگی

۱۲- مارچ کا اودھ اخبار جب میری نظر سے گذرا تو ریاست رامپور کے ہندؤن کی شکایت کی سُرخی دیکھکر توجہ سے پڑھنے کا شوق ہوا، جس قدر سطرین نظر سے گزرتی جاتی تھین وفور اشتیاق مضطربانہ نظرین ڈالنے کے لئے بڑھتا جاتا تھا، جون جون صفحہ طے ہوتا جاتا تھا ہر سطر حیرت و تعجب کی طرف رہبری کرتی جاتی تھی مضمون مذہبی فیلنگ کا آئینہ دار ہے۔ مگر اودھ اخبار نے اس متعصب میدان مین اپنی زبان کو دابتے اور قلم کو روکتے ہوے مسافت طے کی ہے یہ اُسکی پیرانہ سالی کا رکھ رکھاؤ اور ہمسائیگی کا حق محبت ہے۔

"پرتاب" ایک نادان دوست کے بے سروپا خیالات پر آمنّا و صدّقنا کہتے ہوے اس کی حمایت مین کمر باندھ لیتا ہے اور پنجابی قلم ہاتھ مین لیکر صفحات کو ماتمی لباس پہناتا چلا جاتا ہے اور اپنی دُھن مین بغیر سوچ بچار بلا غور و خوض اور بلا تحقیق و تفتیش پنجاب سے اودھ تک گرتا پڑتا چلا آتا ہے اس امید مین کہ اپنی آواز کو "تاجدار رامپور" کے قصر شاہی کی دیوارون سے ٹکرائے۔ آواز ٹکراتی ہے مگر بالواسطہ اس پر مین کان لگاتا ہوں اور سُنتا ہون، افسوس اس وجہ سے کرتا ہون کہ سمجھدار ہستیان اُلجھنے سے پہلے اُسکے ہر پہلو پر غور کرنے اور مختلف ذرایع و وسائل سے اُس بات کی تہ تک پہنچنے کی سعی کرتی ہین نہ کہ ناواقفیت سے بازاری اور بے بنیاد گپوں پر کان دھرتی ہین اور جوش مین حق و باطل کا بھی امتیاز باقی نہین رکھتین۔

"پرتاب" رامپور آئے اور رامپوری ہندوؤں سے خود پوچھے، اُنکی فارغ البالی و خوشحالی کا
طمانیت بخش منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، قومیت کے لحاظ سے اپنے ہندو بھائیوں کو ہندو اور حقوق و مساوات
کے اعتبار سے مسلمان دیکھے، رورا معاشرت کی آزادی اور تیوہاروں کی خوشگوار تقریبوں کو مسلمانوں
کے دوش بدوش دیکھے، ہولی و دیوالی کی تقریبیں عید و بکر عید سے ملتی جلتی دیکھے، تب تو وہ کہہ سکیگا
کہ رامپور اپنی بے تعصبی میں کیا درجہ رکھتا ہے ۔

"پرتاب" تاجدار رامپور کو مسلم نواز ٹھیک جانتا ہے مگر "پرتاب" جب یہ سنے گا کہ مسلمانان
رامپور اپنے شہریار کو ہندو نواز بھی کہتے ہیں تو تاجدار رامپور کی بے تعصبانہ خصلت شہنشاہ اکبر کے
مدبرانہ رنگ سے ملتی جلتی نظر آئیگی ۔ اگر دربار اکبری میں خزانۂ عامرہ کا وزیر ایک ہندو (راجہ ٹوڈرمل)
تھا تو دربار حامدی میں بھی ایک ہندو ہی وزیر روایات ماضیہ کو تازہ کئے ہوئے ہے ایک طرف وہ خزانۂ
عامرہ پر اپنا سکہ بٹھائے ہوئے ہے تو دوسری طرف کیبنٹ (Cabinet) کی بھی ایک
کرسی دوسرے مسلمان وزراء کے پہلو بہ پہلو اُسکے لئے مخصوص ہے ۔ دارالانشاء (
) اور خزانۂ عامرہ کی عمارتیں اور اُسکے در و دیوار سری کرشن ہی کے عقیدت
کیشوں سے معمور ہیں اور اُنکے پیروان عمارتوں میں انہیں کے جے کے نعرے لگاتے ہیں ۔ اِن
عمارتوں کی فضائیں انہیں صداؤں سے گونجتی ہیں، ان محکموں کی تمام جگہیں ہندوؤں ہی
سے لبریز ہیں ۔ یہ دونوں محکمے اِس قوم کی وراثت میں آ گئے ہیں اور بیشتر جگہیں نسلاً بعد نسلٍ ہو گئی ہیں
محکمۂ فوج، مال و اسٹاف میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کافی سے زیادہ تعداد میں
ہندو نظر آتے ہیں ۔ کیا اِس سے بڑھکر بے تعصبی اور ہندو نوازی کی کوئی روشن و کامیاب مثال کسی
ہندو ریاست میں مسلمانوں سے متعلق پیش کی جا سکتی ہے ۔ ؟!
ہاں "پرتاب" یہ کہہ سکیگا کہ اسکے برعکس دل تڑپا دینے والی نظیریں بغیر تلاش و جستجو کے

بآسانی مل سکینگی - پوتیچھ کا واقعہ ابھی بالکل تازہ ہے بیکس و مجبور مسلمانون کے ساتھ جیسا وحشیانہ
برتاؤ اس ہندو ریاست نے کیا ہے' اسکا اثر ہمارے قلب پر "صبر آزمائی" کے لئے نقش بن کر
رہیگا - مگر اس پر کسی منصف مزاج ہندو نے آج تک تو کوئی صدائے احتجاج و شیون بلند نہیں کی!
اس غیر متوقع صبر و خاموشی پر کیا ہم شکوہ کرنے کے بھی حقدار نہیں ہین؟ مسلمانون سے شکایت
کی جاتی ہے وہ سنتے ہین اور اس لئے سنتے ہین کہ اُنکے پیغمبر کا حکم ہی یہ ہے کہ "کسی کو برا نہ سمجھو اور
نہ تکلیف پہنچاؤ" مگر ہندو مسلمانون کی جائز شکایتون پر بھی تو کان نہین دھرتے - اسکے متعلق
ہم کیا کہہ سکتے ہین ہر ہندو منصفانہ فیصلہ اپنی جگہہ پر خود کر سکتا ہے -

ہندوؤن نے غالباً اُس واقعہ کو بھلا دیا ہے جو سینہ بسینہ چلا آتا ہے اور جس سے ایک
ہندو فرمانروا کے صلح کل مشرب کا پتہ چلتا ہے - مہاراجہ رنجیت سنگھ (لاہور) سے جب ہندوؤن نے
اسکی شکایت کی کہ مسلمان سویرے ہی سویرے مسجدون مین چلانا شروع کر دیتے ہین' ہماری نیندین اس آواز سے
اُچاٹ جاتی ہین' میٹھی نیند مین سونے والے ہمارے بچے چونک پڑتے ہین جس سے ہماری تکلیف مین اور
درد پیدا ہو جاتا ہے' مدبر اور بے تعصب مہاراجہ خاموشی سے سنتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ "یہ آواز
نقارۂ خدا اور مسلمانون کو عبادت کی طرف بلانے کے لئے بلند کیجاتی ہے - یہ اگر بند کر دی جائے
تو تم لوگ مسلمانون کے گھرون پر جاکر چپکے سے کہا کرو کہ نماز کا وقت ہے - مسجدون مین جاؤ اور خدا
کو یاد کرو" ہندوؤن نے ادب سے سُنا اور دو ایک روز ایسا کیا بھی مگر ڈیوٹی تو اُس سے سخت تر
تھی' "آواز سے تو نیند ہی اُچاٹ جاتی تھی' اب نیند بھی اچٹتی ہے اور پیر بھی ٹوٹتے ہین' ہم نے
ہتھیار ڈال دئیے اور آخر کار مدبر و بے تعصب مہاراجہ کے حضور مین عرض کرنا پڑا کہ اندا تا مسلمانون
کا وہی طریقہ اچھا تھا اِس نے تو ہمین وہری مصیبت مین ڈال دیا - مہاراجہ اپنی مصلحت آمیز تدبیر مین
کامیاب ہوتا ہے اور اس طرح مسلمانون کے دلون پر اپنی بے تعصبی کی ایک مستقل یادگار قایم کر جاتا

ہے۔ مہاراجہ ہندو مسلمانون کو ایک کی نکہ سے دیکھتا تھا۔ ایک اسکا دل تھا اور ایک اسکی جان، نہ جان قربان کی جاسکتی تھی اور نہ دل کو کھایا جاسکتا تھا وہ زمانہ لدگیا وہ وقت گزر گیا۔ ایسے ہندو فرمانروا ہین اور نہ اُنکی مصلحت کیش ہمدردیان۔

تاجدار رامپور کی بے تعصبی اور رعایا پروری کو جاننے والے ہی جان سکتے ہین کسی خود مختار فرمانروا کے لئے بے تعصبی سے بڑھکر کوئی جوہر نہین ہوسکتا۔ مولانا حالی کا ایک شعر جسکا حرف حرف اور نقطہ نقطہ ہمارے فرمانروا کی خصلت کا نباض ہے اور اُسکی حرکت انگلیون کو بتاتی ہے کہ کہ مولنائے مرحوم نے یہ شعر اسی تاجدار کی خصلت کو پڑھکر نظم کیا تھا۔ فرماتے ہین کہ ؎

سمجھنا ہر اک قوم و ملت کو یکسان ۔ کہ خصلت ہے یہ یورتھ ہماری

تاجدار رامپور کی صلح کل اور غیر متعصب طبیعت کا سکہ تنہا ہندو مسلمانون ہی پر نہین بیٹھا ہے، موسوی و عیسائی بھی قائل ہین تعصب کا دیو دُنیا کی بڑی بڑی ترقی یافتہ سلطنتون تک پر مُسلط ہے بڑے بڑے مُدعیانِ تہذیب و شائستگی بھی اِس متعدی مرض مین مبتلا ہین مگر ہمکو اسکا ناز ہے اور بجا ناز، کہ ہمارے اعلیٰ حضرت بے تعصبی مین اپنا نظیر نہین پاتے۔ مذہبًا شیعہ ہین مگر ریاست کے تمام مسلمان وزراء حنفی المذہب ہین۔ نواب خلد آشیان سنی المذہب مگر اسٹاف کلی شیعون سے مملو تھا، اور میر منشی اُنکے ایک ہندو تھے۔ کیا یہ نظیرین بے تعصبی کے لئے بس نہین ہین؟

رامپور شہر مین ہندؤن کی تعداد ۲۵ فیصدی سے زیادہ نہین ہے مگر تمول مین مسلمانون کو اِن سے کوئی نسبت نہین ہے، تمول انکا حصہ ہے اور فلاکت مسلمانون کی عام تقدیر۔ رامپور مین مناور کا وجود ہے اور اسمین پوجا پاٹ کرنے کے لئے پوری آزادی حاصل ہے۔

مجھے "پرتاپ" کے اِس فقرہ پر ہنسی آتی ہے کہ "معزز ہندو بیگار مین پکڑے جاتے ہین" یقینًا "پرتاب" کے حافظہ نے دھوکا کھایا۔ کشمیر کے شریف مسلمانون کا واقعہ رامپور کے معزز

ہندوؤن پر حملہ دیا۔ رامپور سوئے ہتیل مین امتیاز رکھتا ہے کھرے کھوٹے کو پرکھتا ہے پست و بلند کے درجہ تناسب سے واقف ہے، واقعہ کے قلب ماہیت پر "پرتاپ" خود ہی کہے کہ: ع

چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پہ

آخر مین ہم یہ بھی کہے بغیر نہین رہ سکتے کہ "پرتاپ" سے ہمکو کوئی گلہ نہیں ہے اس لیئے کہ بے تعصبی کے پردہ مین تعصب اور مظلومیت کے پردہ مین ظلم طرازی پرانا شیوہ ہے اور قدیم شعار اسلامی ریاستون پر تو ہندو اخبارون نے ہمیشہ کھس کھائے ہین ہمکو یہ کہکر سکوت بھی اختیار کرنا آتا ہے کہ

ع "ہوتی آئی ہے کہ اچھون کو برا کہتے ہین"

۱۹ر مارچ ۱۹۳۲ء

ضلع بیڑ (دکن) مین ایک بیرسٹر پر وحشیانہ حملہ

سال دو سال پہلے ہندوستان مین اتفاق و اتحاد کا اس قدر شور مچ رہا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہین دیتی تھی بچہ بچہ کی زبان پر یہی دو لفظ تھے اور یہی انکے جوش کی کائنات ، لیڈران قوم کی دھوان دھار تقریرین جہان دیکھو اسی موضوع پر ہوتی تھین اور انکی تقریرون پر پبلک کی غیر اختیاری صد آفرین پنڈال مین گونجتی تھین، لیڈران قوم اور قوم کے بھولے بھالے لیڈر پرست ہندو مسلم اتحاد کی کوشش مین اپنی جانین لڑائے دیتے تھے اور اس پر یقین بلکہ ایمان کہ یہ ہندو مسلم اتحاد کا سنگم گنگا جمنا کی طرح مل کر رہیگا۔ کہ تھوڑے دنون مین گاندھی اور علی برادران کی انتھک کوششین جیل مین جاکر ختم ہو جاتی ہین، ہوا کا رخ پلٹتا ہے بوڑھے اور زمانہ شناس مالویہ کا منتر خاموشی سے کام کر جاتا ہے اور اتحاد و اتفاق کا شیرازہ آناً فاناً مین بکھر کے رہ جاتا ہے ہندو مسلمان ایک دوسرے کی جان کے پیاسے ہو جاتے ہین، ہندوستان کے بڑے بڑے شہرون مین دونون کی خون کی ندیان بہ جاتی ہین جسمین مسلمانون کا خون زیادہ بہتا نظر آتا ہے اور مسلمان اپنی بیچارگی اور بے بسی پر

یہ کہکر دے دیتے ہین کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا (غالب)

یہان تک بھی غنیمت تھا کہ ایک قوم دوسری قوم کی خون کی پیاسی تھی، مسلمانون کی نا عاقبت اندیشی روز ازل سے مسلم ہے۔ یہ آپس ہی مین کٹے مرتے ہین، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی فکر مین رہتا ہے کوئی زخمی ہی کر کے چھوڑ دیتا ہے اور کوئی جان لیکر خوشیان مناتا ہے

یہ اُس قوم کی حالت ہے جو اپنی انہیں احمقانہ حرکتون کی وجہ سے دوسری قوموں کے مقابلہ مین پست و ذلیل ہو رہی ہے دوسری قومین اگر مسلمانون پر ہنستی ہین تو ہنسنا چاہئیے اور مسلمانون کو اپنی بدنصیبی پر آنسو بہانا چاہئیے۔

ضلع بیڑ (سلطنت آصفیہ) کا ایک تازہ ترین عظیم الشان حادثہ ہے۔ اسی نوین محرم کا سانحہ ہے، ناظم عدالت (سشن جج) مولوی سید اصغر حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا پر گزرا ہے۔ اُنہون نے میراث سمجھکر صبر و استقلال سے جھیلا ہے، سنا ہے بیڑ والون نے صرف اس شبہ پر بیرسٹر صاحب کو مارا، بلکہ ادھ مرا کر دیا، اور سخت زخمی و مجروح کہ اُنہون نے ایک سنی لڑکے کو قتل کر ڈالا مین بیرسٹر صاحب سے واقف اور اُنکے پاکیزہ خصائل کا جاننے والا ہون، مہینون ہم اور وہ ساتھ رہے ہین اُنکی نشو و نما ایسے برگزیدہ اور مشہور خاندان مین ہوئی ہے جسکی متانت و سنجیدگی اور تہذیب و اخلاق ہند سے یورپ تک مسلم ہو چکے ہین۔ مجروح بیرسٹر انگلستان کی آزاد تعلیم سے بہرہ یاب ہو چکے ہین مگر یورپی تعلیم اور طرز معاشرت کا سبق لینے کے باوجود نہ مذہب حق کو چھوڑا، اور نہ پان کھانا ترک کیا۔ بے تعصبی اِن کا جوہر تھا، یہ جوہر اُنکو اُن روشن خیال و تعلیم یافتہ بزرگون کے سایہ عاطفت مین رہ کر ملا تھا جنکی بے تعصبی سے دنیا واقف ہے، مجروح بیرسٹر کی تمام عمر دکن مین گزری اور سنی المذہب مخلص دوستون کے ساتھ انہین کے ساتھ بیٹھنا اُٹھنا، کھانا پینا اور ہر وقت انہین کی خوش مذاقیون مین نباہ۔ ایسی مذموم حرکتین اگر عالم شباب مین زخمی بیرسٹر کی طرف منسوب کیجاتین تو جوانی کی بڑھی ہوئی حرارت سے تعبیر کیا جا سکتا تھا تہمت اُس وقت لگائی جاتی ہے جب اُنکی عمر کا بڑا حصہ رنجان مرنج اور بے تعصب ہو کر گزر گیا اور ملنے جلنے والون کو کسی وقت بھی بیرسٹر صاحب کی طرف شبہ کا پیدا ہونا تو درکنار دل مین یہ موہوم سا خیال بھی نہ آیا اور نہ کبھی اُنکے حرکات و سکنات سے بھی اشارتاً اُنکے تعصب کا پتہ چلا۔ وہ شیعہ ہین مگر انگریزی خیال کے وہ شیعہ ہین

واقف ہین مگر اپنے عقیدہ کی محدود چار دیواری مین۔

برسون صوبۂ اورنگ آباد مین "سرکاری وکیل" رہے سُنّی رعایا کو زیادہ تر اپنی قانونی قابلیت کی پناہ مین لیا اُنکے حقوق کی پاسداری کی اُنکو قانونی گرفتون سے آزاد کرایا اور بچایا کیا اِس حد سے اِس زمانہ مین زخمی بیرسٹر اپنے تعصب کو بخوبی چمکا نہ سکتے تھے؟ چمکانا تو کجا جھلک بھی نہ آنے دی، یہ تعلیم کے قوی اثرات تھے۔ برسون سے بڑھ مین نظامت کی کرسی پر بھی زخمی بیرسٹر حق و انصاف کی داد دیتے رہے کیا اُنکی حکومت مین اُنکو ہر وقت اور ہر حیلہ سے اِسکا موقعہ بآسانی نہ مل سکتا تھا؟ کیا اختیارات مین اتنی وسعت نہ تھی؟ کہ وہ ہیر پھیر کر کسی کو قتل کسی کو قید اور کسی کو جرمانون کی سزائین اور سخت سزائین دیسکتے؟ وہ بخوبی دے سکتے تھے اور حُسن و حکمت کے ساتھ وہ قانون کی زنجیرون مین ہر وقت جکڑ سکتے تھے کیونکہ خدا نے انہین قانون مین بیرسٹر اور اختیارات مین ناظم کیا تھا، مگر وہ انسان تھے اور مکمل انسان، وہ شریف تھے اور شریف پرور، وہ شیعہ تھے مگر بالکل بے تعصب ہر مذہب و ملت کے ساتھ اُنکا یکسان سلوک تھا، نہ اُنہون نے تکلیفین پہونچائین اور نہ اذیتین، نہ شیعہ کا پاس کیا اور نہ سُنّی کا خیال، وہی کیا جو انصاف تھا اور حق۔

اگر سرحد کے قوی ہیکل جاہل پٹھان ایسے فعل کے مرتکب ہوتے تو کسی کو نہ تعجب ہوتا اور نہ حیرت، کیونکہ وہان یہ کھیل تماشے آئے دن ہوا ہی کرتے ہین مگر یہ واقعہ تو اُس جگہ کا ہے جہان مولوی عزیز مرزا بی اے مرحوم ایسے روشن خیال و تعلیم یافتہ بزرگ برسون اوّل تعلقداری کلکٹری پر بر سر حکومت رہ چکے ہین اور یہ کہ وہ ضلع (بیڑ) بہت کچھ اُنکے توجہات سے اصلاحات و ترقی کے منازل طے کر چکا ہے۔ ضلع کے باشندون کی تہذیب شائستگی اور اُسکی سرسبزی مین مولوی صاحب مرحوم کی زبان اور عالمانہ قلم بہت کچھ کوشش کر چکا ہے۔ ایسے بزرگ قوم کی صحبت کا اثر اگر بیڑ والون پر نہ پڑا اور روشن خیالی کی حد مین نہ پہونچے تو اُنکی اس ناسمجھی پر افسوس ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے باشندون پر جاہل مرہٹون کا اثر غالب ہے اسی اثر سے یہ دن دیکھلایا کہ انکو مذنام اور ایک سید نبی ہاشم کو مجروح' ایسے گستاخانہ اور بہیمانہ برتاؤ تو افریقہ کے وحشیون اور سرحد کے پٹھانون کے لئے اتنک مخصوص تھے' شہر والون نے خود اپنا اضافہ کرلیا' افسوس !!

شاہ دکس کا انصاف و بے تعصبی عام مین مشہور ہے تفتیش کے لئے کمیشن دولت آصفیہ کی طرف سے بٹھایا گیا ہے اور حکومت سے جو مدبر اور قابل عہدہ دارون کو انتخاب کرکے موقع واردات پر بھیجا گیا ہے امید ہے وہ حضرات مذہبی رواداری سے بحکم حق و باطل کا فیصلہ کرینگے اور اعلیحضرت آصفجاہ سابع کا منصفانہ و بے تعصبانہ آخری حکم زخمی بیرسٹر کے صدمہ[1] پہونچانے والون کو کافی سزائین دیگا۔ تاکہ وہ اپنے کئے کی سزا پائین۔

(۸- اکتوبر ۱۹۲۳ء مطبوعہ "اثنا عشری" دہلی)

[1] جراحت ہوئے' جرمانہ ہوئے اور جیل کی بھی سیر کی' جو شاہ دکس کی انصاف پسندی کا ثبوت ہے۔

مالوی جی کی بندش کے فرمان پر

غیر مہذبانہ نکتہ چینی

کشمیر میں ۹۵ فی صدی مسلمانوں پر قہر و غضب کی بجلیاں گرائی جاتی ہیں، اُنکی معصوم زندگیوں کو تباہ کیا جاتا ہے مگر وہ اُسی حد تک فریادیں کر کے خاموش ہو جاتے ہیں جس حد تک اُنکی موروثی تہذیب اُنکو اجازت دیتی ہے اُنکی مذہبی یادگاروں کی اشاعت پر بردستی روک دیجاتی ہے وہ اس لئے صبر کرتے ہیں کہ جنکا سالانہ ماتم کیا جاتا ہے وہی "صبر" کی زبردست تعلیم دے گئے ہیں اور خود صبر کا غیر فانی نمونہ پیش کر کے دُنیا والوں کو دکھلا گئے کہ ۔ ع

ایسے صابر ہیں محمدؐ کے گھرانے والے "

کشمیر کا پڑوسی تو تنخیہ مسلمانوں سے اپنی آبادی کا رقبہ خالی کرا لیتا ہے ۔ خالی کرنیوالے اپنے اپنے آشیانوں پر الوداعی نظریں ڈال کر یہ شعر پڑھتے ہوئے چلے جاتے ہیں کہ ؎

نہ شاخسارِ جہاں تنگ ہے نہ ہمتِ دل　　کہاں کہاں سے اُجاڑیگا آشیاں صیّاد

نہ تو صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور نہ شکوؤں ہی سے لبوں کو آشنا ۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے مسلمان طلبا ترک موالات پر لبیک کے نعرہ لگاتے ہوئے اپنی تعلیم کو مہاتما گاندھی کی آواز میں تحلیل کر دیتے ہیں اور کھدر میں ملبوس ہو کر کاسۂ گدائی کو رزق کا مہذب ذریعہ گردانتے ہیں، گاندھی جی کبھی یہ نہیں

یوچھتے کہ کھوتر کے معاملات نے کس کس قسم کے ذائقوں سے کام و دھن کو لذت بخشی یا اور اس قسم کے
متعدد واقعات ہیں اُن بدنصیب مسلمانوں کے جن کی ناعاقبت اندیشی کی داستانیں سنتے سنتے اب تو
جی گھبرا گیا اور سمجھدار مسلمان پریشان ہو گئے۔ اگر اتحاد و اتفاق کا راگ الایا جاتا تو یہ بے چین کر دینے والی
راگنیاں کیوں پیدا ہوتیں، کشت و خون کے دریا کیوں بہتے، غصہ و منافرت کے جذبات کیوں پیدا ہوتے
آخر مسلمانوں نے ہندوستان میں دو چار دن نہیں نو سو برس حکومت کی ہے انسانیت و آدمیت کے
مہذب سبق دیئے ہیں، تہذیب و تمدن کے قابل تقلید نمونے پیش کئے ہیں ہندوؤں کو سنوارا ہے ہندوؤں
کو اپنا سمجھ کر برتاؤ کیا ہے ہندو مسلم رشتوں کے سنگم راجپوتانہ میں ملائے ہیں ان تمام باتوں کے ہوتے
ہوئے گپتا جی ایڈیٹر "تیج" اپنی پچھلی تہذیب کو دعوت دیتے ہیں۔ سچ ہے ملمع کاری اپنی اصلیت کو
دیر سویر ظاہر کئے بغیر نہیں رہتی۔ موجودہ عہد کے مسلمان باوجود پیہم تجربات اور مسلسل ٹھوکروں کے
بھی سنبھلنا نہیں جانتے، آخر سادگی، یہ وضعداری اور یہ بھولا پن کب تک، اپنی ان خصوصیات سے
گپتا جی ایسے ہندو کو تو ناجائز فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ دیجئے۔

دکن کا بیدار مغز فرمانروا مالوی جی کے لئے دکن کے دروازے بند کر دیتا ہے اپنی سرحد میں
داخل ہونے کی ممانعت کا فرمان جاری کر دیتا ہے تو دہلی کے ایک جلسہ میں گپتا جی کی قدیم تہذیب
مہذب دنیا کے سامنے آ جاتی ہے، کہا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں سے تعلیم میں بہت بڑھ گئے ہیں،
مگر تربیت و تہذیب میں تو مسلمانوں کے گرد کارواں تک پہنچتے نہیں دکھائی دیتے جس ملک کے
رہنماؤں کا یہ سلیقہ ہو، جنکو مہذب سوسائٹی میں بات کرنی بھی نہ آتی ہو، جو بڑے چھوٹوں میں فرق
اور سونے و پیتل میں امتیاز نہ کر سکتے ہوں، وہ سوراج سے دل لگانا چاہتے ہیں۔ کیا تعلیم کی ترقی تہذیب
کے تنزل کی مترادف ہے؟ کیا ہندو اپنے راجاؤں بزرگوں اور قابل احترام دیوتاؤں سے اسی تہذیب کے
ساتھ التجائیں کرتے ہیں؟ راجاؤں کے حضور میں عرض و معروض اسی طریقہ سے کی جاتی ہے جس کا

نمونہ لالہ دیش بندھو گپتا نے ان لفظون مین پیش کیا ہے۔ آپ فرماتے ہین کہ:-

"نظام صاحب کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہندو قوم اُنکے متعصبانہ حکم کو خاموشی کے ساتھ نہین برداشت کریگی۔ مالوی جی ایسے لیڈر کو ریاست مین داخل ہونے کی اجازت دینا ہنسی کھیل نہین ہے اگر نظام صاحب نے یہ حکم واپس نہ لیا تو اُنہین پتہ چل جائیگا کہ ایسے حکم کا نتیجہ کیا ہوا کرتا ہے۔"

(روزنامہ "ہمدم" مورخہ ۲۳- مئی ۱۹۲۵ء)

گپتا جی کے اس طرز کلام سے اُنکی بڑھی ہوئی تعلیم و تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ گپتا جی صاحب آپ بکتے رہئے۔ اعلیٰ حضرت نظام سنتے رہینگے اور وہی کرینگے جو اُنکا شایستہ دماغ اور غیر متعصب فطرت اجازت دیگی۔ آپکی چیخ پکار صدا بہ صحرا کی مانند ہولناک سناٹے مین بدحواس ماری ماری پھرتی رہیگی۔ آپکی گیدڑ بھبکیون سے گنگا مین چاہے تلاطم پیدا ہو جائے، مگر موسیٰ ندی کی پُرسکون موجین تو کبھی کروٹ بھی نہ لینگی۔ تاجدار دکن حکومتِ برطانیہ کا قوتِ بازو اور ہندوستانی ریاستون کا "گل سرسبد" ہے آپکی دھمکیون سے مرعوب نہین ہو سکتا۔

خسروِ دکن شدھی و سنگھٹن سے خائف نہین، ہندو سبھاؤن سے مرعوب نہین، ہان اپنے ملک کو بدامنی کی فضا سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے ارجن و بھیشم کی زور آزمائی دیکھنا نہین چاہتا۔ دو مذاہب کو ٹکرانا نہین چاہتا، اُنکی تباہی و بربادی کے مناظر اسکی رعایا پرور آنکھین نہین دیکھنا چاہتین۔ گپتا صاحب آپکی دھمکیان آپکی لن ترانیان کسی فاتر العواس کی بڑ سے زیادہ وقعت نہین رکھتین۔ دکن مین ہندوؤن کی زندگیان، مسلمانون کے لئے جیسی قابل رشک ہین کیا کوئی نمونہ مسلمانون کے لئے کوئی ہندو ریاست پیش نہ کرسکیگی۔ یہ اسلامی رواداری ہے اور اسکے تنہا خصوصیات! دکن مین ہر ہندو اپنے مذہب مین اسی طرح آزاد ہے جس طرح ہندوؤن کا سانڈ (بیل) آزادی سے بازارون مین پھرتا ہے اور بےفکری سے دوسرون کے غلہ پر منہ مار کر اپنے تن و توش کو فربہ کرتا رہتا ہے۔

ہندوستان کی کثیر آبادی غیر تعلیم یافتہ اور جاہلِ مطلق ہے اُسکے لئے تا جی سگھٹن کا چنگاریاں شعلوں کا کام دیتی ہیں جن سے اُسکے اطمینان کا خون ہو رہا ہے۔ اُسکے آرام میں خلل پڑ رہا ہے گاؤں گاؤں میں اسکے خطرناک جراثیم پھیل گئے ہیں۔ اِس متعدی مرض سے اپنی رعایا کو بچانا حضور نظام کے لئے ضروری ہی نہیں نہایت ضروری تھا۔ یہ سیدار مغزی کی حکیمانہ تشخیص تھی کہ مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر ہی نسخہ تجویز کر دیا۔ شاہی فرمان کا مناسب وقت پر شایع ہو جانے سے تاجدار دکن کی نبض شناسی کا مخالفوں کو بھی اگر علانیہ نہیں تو دل میں اعتراف کرنا پڑا نبض کی حرکت نے اس حکیم دکن پر ظاہر کر دیا کہ سرزمین دکن پر ایسے فتنوں کی نمود رعایا کے امن و اطمینان کے لئے موت کا پیام ہے!

(۴۔ جون ۱۹۲۵ء مطبوعہ روزنامہ ہمدم لکھنو)

ہماری حالت

ہندی اصطلاح مین ہندوستان مین کبھی "پُروا" ہوا چلتی ہے اور کبھی "پچھوا"۔ "پُروا" مصرت کے سامان لاتی ہے اور "پچھوا" مسرت کے، حُسن اتفاق کہئیے یا ہماری بداعمالیون کے نتیجے کہ ہندوستان ایک عرصہ سے "پُروا" ہواؤن کا آماجگاہ بن رہا ہے اور اسکے تمام مُضر اثرات غریب مسلمانون کے حصے مین آگئے ہین آندھیون کی شدت و کثرت نے درختون کو ہلا ہلا کر کسی کی تو جڑ تک اُکھاڑ کر پھینک دیا اور کسی کی شاخون کو گرا گرا کر پتون کی آوارہ گردی کو خزان کا پیغام دیدیا۔

ہندوستان کا مزاج اپنی طبعی حرارت کی وجہ سے تلوّن پسند واقع ہوا ہے اسی تلوّن کے یہ نمایان برکات تھے کہ ترک موالات کا موسم اپنی چند روزہ بہارین دکھا کر گزر گیا ہجرت کی فصل آئی تو مہاجرین یہ شعر پڑھتے ہوئے "دارالامان" کی طرف بڑھے:۔

صیاد نے چھڑایا ہم سے وہ آشیانہ اک عمر جسکے خاطر تنکے چنا کئے ہم

ترک ملازمت نے بھوک کی بیچینیان اور معصوم بچون کی گریہ زاریان دکھلادین وکالتون کے انقطاع نے جیبین خالی کرادین، خطابون کی واپسی نے اعزازات کو ٹھکرادیا، ترک تعلیم نے طالبعلمون کو در بدر کی خاک چھنوادی، عورتون کے زیورات کی نمایش ختم ہوگئی، ولایتی کپڑون کی ہولیان جل گئین چرخے نے ہر گھر کو موسیقیت کا متوالا بنادیا، کھدّر نے اپنی آواز ما نچسٹر اور لنکاشائر تک پہنچادی جنھون نے حضرت مسیح کی تعلیم مہاتما گاندھی کی زبان سے سُنی، اُنھون نے دونون گالون پر طمانچون کی بوچھار ہی کو نہین بلکہ اپنے جسم پر لاٹھیون اور مختلف ہتھیارون کی موسلا دھار بارش کو آسانی

تیر کھائے، باوجود ان مسلسل صدمات کے تحمل و برداشت کی قوت اس لئے باقی تھی کہ تلوّن کے تھپیڑوں مین تھے، تلوّن کی زد مین تھے، اُچھلنے کودنے، چیخنے چلّانے سے "دھرم" کھلاجاتا تھا۔ اس لئے صبر کر کرکے قومی نعروں پر قربان ہوتے رہے۔ یہ اُس وقت ہو رہا تھا جب ہمنایان قوم کی صدائین وحی کا کام دے رہی تھین، جو فرزندان ملک دل سے ہندوستان کی آزادی چاہتے تھے اور دونون قوموں کا سنگم اکبر اعظم کی طرح ملانا چاہتے تھے اُن مین کا کوئی فرزند زندان فرنگ مین بکری کا دودھ پی کر اور "ترک لذات" کا مزہ چکھ چکھ کر روحانیت کا قابض ہو رہا تھا اور کوئی سر تسلیم خم کئے ہوئے اللہ کی یاد مین مصروف تھا اور اپنی اس سائی پر نازان کہ:- ع

"آپ ہونے لگین اُن سے خلوت مین ملاقاتین"

اغیار اس موقع کی تاک مین لگے ہوئے تھے کہ یکایک خاموش ریشہ دوانیون اور حکمت عملیون کا پردہ ہندوستان کے کسی روحانی مقام سے اُٹھتا ہے، صبح بنارس کا شیدائی اس منظر سے باغ باغ ہوکر اور اس پانسہ کو پلٹتا ہوا دیکھکر صرف اپنے "ترشُّم" سے مسرت کی بغلین بجاتا ہے، چارون طرف شدھی سنگھٹن کے درس شروع ہوجاتے ہین مسلمانون سے ہندوستان چھڑا دینے کے لئے جلسون مین خیالی پوریان بھی پکتی ہین اور اُبلی ترکاریان بھی، جہان کل تک اتحاد و اتفاق کے پلاؤ پک رہے تھے وہان آج ہندوستان کی دونون قومین اپنی اپنی ہانڈیان اور اپنی اپنی کڑاہیان گرم کئے ہوئے منافرت کی آگ بھڑکا رہی ہین، پچھلا سبق بھلا کر اگلے سبق پر دماغی قوت ہل ہل رہی کہ نہین صرف ہو رہی ہے بلکہ جسمانی کثرت کے داؤ پینچ بھی دونون کو دست و گریبان کئے ہوئے ہیں اور اس مستقل نزاعی سے زور آزمائی ہو رہی ہے کہ ملکی اخبارون کے کالم بجائے سیاسی رونا رونے اور جگ بیتی سنانے کے آپ بیتی سنانے اور اپنی ہی مصیبتون پر نوحہ پڑھنے کے کوئی مشغلہ ہی نہین رکھتے۔ یہ ہے اُس تلوّن کی ایک اجمالی فہرست جس سے ہماری ملکی کتاب مرتب ہو رہی ہے اور یہی ہین وہ خطرناک راستے، جن

ہم نے گام زنی کی ہے اور "ہوم رول" کے آزاد میدان میں دوڑین لگا کر تھک تھک کر سر بزانو بیٹھ رہے ہیں۔ مسلمان خمیازہ بھگتنے کے لئے پیدا ہوئے ہین بھگت رہے ہین اور نہ معلوم کب تک بھگتینگے، ہندوستانی ہندو اپنی کفایت شعاری اور سادہ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے دولتمند اور مسلمان اپنے اسراف بیجا اور امیرانہ ساز وسامان سے مفلس و نادار، ہندو اپنی ہزارون برس کی زندگی مین اپنی آبادی کو ۲۶-۲۷ کروڑ تک پہنچا سکے مسلمانون نے صرف چند صدیون مین سات کروڑ گنوا دیئے۔ اتنی صدیان بخیر و خوبی گزر جاتی ہین، ہندو کروٹ بھی نہین لیتے مغربی تعلیم جب اُنکو جونکاتی ہے تو یہ شدھی و سنگھٹن کے جلسون مین اپنی تقریرین سے انتقام کی آگ بھڑکاتے ہین اور اِس لئے برہی کا اظہار کرتے ہین کہ ہندؤن نے مسلمان ہو ہو کر مسلمانون کے مختصر گروہ کو عظیم الشان گروہ بنادیا۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی دولت سے اپنے خزانہ کو پھر بھرنا چاہتے ہین۔ مسلمان اِس پر اِس لئے کان نہین دھرتے، اور نہ سکوت ہی اختیار کرنے پر آمادہ ہوتے ہین کہ وہ حق کی دعوت دیتے ہین۔ مساوات و اخوت کی تعلیم دیتے ہین، سو کر اُٹھتے ہین تو یہی اُنکی زبان پر ہوتا ہے یہی اُن کا مقصد حیات ہے اور یہی اُن کا درس زندگی۔ لب ہلتے ہین تو اسی مقصد کے لئے آواز نکلتی ہے تو اسی زندگی کے لئے۔

"چندرما" مسلمانون کا قومی نشان ہے اور ہندؤن کا ایک حسین دیوتا اُسی روشنی کو دُھندلا کرنے کی فکرین کیجاتی ہین جو اُنکے لئے بھی "چراغ ہدایت" ہے۔ گاؤن گاؤن عیسائیت کا جو جال پھیلا ہوا ہے اور ہندو ہی اُس مین پھنس رہے ہیں اُس سے اُنکو بچایا نہین جاتا۔ ہم حملہ کرتے ہین مگر ہوشیار کر کے، ہم جال بچھاتے ہین مگر کھلے میدانون مین، ہم اپنے مین جذب کرتے ہین مگر خدا کا یقین دلا کر اور انسانیت پر رحم کھا کر، مسلمان عیسائیون ہی کے قبضہ مین آسکے اور نہ "بھگوت گیتا" ہی کا مذہبی درس لے سکے۔ اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ عزت والون کی عزت کرو، چھوٹون کو بڑا بناؤ، پست کو بلند کرو، بھوکون کو کھلاؤ، پیاسون کی تشنگی دور کرو، محتاجون کی خبرگیری کرو،

مریضوں کو دوائیں دو، اور ایک دوسرے کی ممکنہ اعانت اپنی زندگی کا فرض سمجھو، سیدھا راستہ دکھاؤ
بُرے راستہ سے بچاؤ۔

لڑائی بھڑائی افریقہ کے حبشیوں اور غیر معروف جزیروں کے باشندوں کا اب تک شعار ہے
وہاں انسانیت کی ہوائیں نہیں چلی ہیں، وہاں مدنیت کی خوشبوئیں نہیں پھیلی ہیں، ہندوستان کو
سات صدیوں سے مسلمانوں نے بہت کچھ تعلیم و تربیت اور تمدن و معاشرت کے سبق دیئے ہیں۔ دھوتیوں
کی جگہ پائجاموں کو دیدی، کمر کمر تک کے کرتہ کو شیروانی نے چھپا دیا، عداوت کو لطیف کر دیا، خسرو سا اُستاد
دیدیا، فیضی سے ادیب کو دکھا دیا، انگریزوں نے سمندر پار کی سیریں کرا دیں، نئی نئی زمینیں دکھلا دیں،
کیا سیر و سیاحت اور تعلیم و تربیت وسعت خیال نہیں بناتی، رواداری نہیں سکھاتی، بے تعصبی کا جوہر نہیں
پیدا کرتی۔ ہندوستانی اگر اپنی وضع میں پختگی اور خصلت میں استواری رکھتے ہیں تو رکھیں مگر دنیا کو
آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر دیکھیں، دُنیا اور دُنیا کے حالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے، بغیر اسکے انسانیت
کا منشا پورا ہو ہی نہیں سکتا، اپنی پچھلی زندگیوں، تنگ خیالیوں، دقیانوسی باتوں اور دبو پن کی
کہانیوں کو اب تو بھول جائیے اور کان لگا کر سُنیئے، دُنیا میں حقیقی فتح تہذیب و متانت کی ہے، تعلیم و
تربیت کی ہے، علم و فن کی ہے، کیا ان اسلامی خصوصیات کا ہندوستان گواہ نہیں ہے؟ گنگا کی
موجیں اب بھی اسکے اعتراف کے لئے بے چین نظر آئینگی! تاریخ کا ہر صفحہ پکار پکار کر کہے گا یہ تو
مسلمانوں کی فطری ہمدردی تھی اور اُنکا احسان کہ گرتے ہوؤں کو سنبھال لیا، ڈوبتے ہوؤں کو بچا
لیا، مرتے ہوؤں کو زندگی دیدی، کیا اُسکا اعتراف اسی طرح کیا جاتا ہے کہ لڑا لڑا کر انسانی جانوں
کی قربانی کرائی جاتی ہے یہ بربریت و جہالت کی قوت اگر اس زمانہ میں بھی باقی ہے، اگر عقل سلیم کا یہی
مشورہ ہے تو مسلمان بھی لبیک کہنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

صدیوں کی یگانگت اور مؤانست کا اگر یہی نتیجہ ہے کہ ہم سے ہندو ویسے ہی اجنبی ہیں جیسے

چھٹی صدی مین تھے توہم اِس بیگانگی پر تیرہ سو برس سے ایمان رکھتے ہین، ہمکو اُس وقت کے مناسب حال یہ خداوندی حکم پہونچا تھا کہ وَلَن تَرضٰی عَنکَ الیَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُم یعنی "یہودی اور نصرانی تم سے ہرگز راضی نہونگے جبتک تم انکی ملت پر نہ چلو" جب ہم اُنہیں کی شاہراہِ ملت پر نہ چل سکے تو "تسبیح و زنار" سے رشتہ کیونکر جوڑ سکین گے وہ تو سولھوین صدی کی حکومت کا دباؤ تھا یا اکبر اعظم کی خوش نیتی کا پھل کہ اُسکے عبادت خانے ایک وقت مین "حمد" کی بھی صداؤن سے گونجتے تھے اور "بھجن" بھی مندرون کے نعداؤن کو وجد مین لاتے تھے۔ علی گڑھ کا سرسید اگر اِس یگانگت پر عقیدہ رکھتا تو وہ اپنی مسجد (کالج) سب سے الگ کیون بناتا۔ دوسری قومین ہمکو مٹانے کی کوششین کر چکین، ہندؤں کی بھی حوصلہ افزائی ہم کرنے کے لئے تیار ہین مگر اتنا کہدینا چاہتے ہین کہ:- ع

آسان نہین مٹانا نام و نشان ہمارا

ہمارے ہمت و استقلال اور ضبط و صبر کے امتحان کے نتائج کربلا کے بیابان سے پوچھیے اور اندلس کے ویران کھنڈرون سے دریافت کیجیے یہ وہ واقعات ہین جو تاریخ کے حافظہ مین ابتک تازہ ہین۔

مین ہندؤن سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ کہکر اپنی ہمسائیگی کا حق ادا کر چکا، صرف دو باتین اپنے بھائیون سے عرض کرنا چاہتا ہون، جبتک وہ ان پر سختی سے کاربند نہ ہونگے وہ زندہ صف مین کھڑے ہونے کے بھی قابل نہین ہو سکتے، اُنکا بیدار قومون مین شمار ہی نہیں ہو سکتا وہ جراءت و دلیری کے جوہر ہی نہین دکھا سکتے، وہ اپنی قوم کو سنوار ہی نہین سکتے، وہ اپنے مذہب کو فروغ ہی نہین دے سکتے، ایک تعلیم ہے دوسرے اسراف بیجا سے احتراز یہی وہ باتین ہین جو نہ پست کر سکین گی اور نہ شرمندا اور نہ غیرت شرافت کو بدنام جب پوری تعلیم سے آراستہ ہو گے تو کوئی تمکو نظر حقارت سے دیکھ سکیگا جب جیب مین چار پیسے ہونگے تو دل غنی ہوگا، قوت ارادہ

ہوگی، ہمت بلند ہوگی، قرضہ سے پرہیز کروگے تو غیروں کی خوشامد نہ کرنی پڑیگی، ذلت اور
شرمندگی مول لینی پڑیگی، اپنی قومیت پر دھبہ نہ لگا سکوگے، چادر کی وسعت کا لحاظ کرکے پاؤں
پھیلاؤگے تو تمہاری بے تکلف عریانی کا پردہ فاش نہ ہوگا - تمہارے سربستہ راز نہ کھل سکیں گے
جبتک یہ دونوں باتیں مسلمانوں کی زندگی کا جزو نہ ہوجائینگی اور ہر مسلمان کا یہ وظیفہ اور ہر مسلمان کا
اوڑھنا بچھونا نہ ہوجائیگا - اُس وقت تک مصیبت ہی کی طوفانی کشتی میں تھپیڑے کھاتے رہینگے
متلاطم موجوں میں پھنسے ہوئے گھبراتے پھرینگے غیر قوموں کی نظروں میں ذلیل و خوار رہینگے - اغیار
قہقہہ لگائیں گے، اگر مسلمانوں کو ذلت و توہین گوارا ہے یہ بےحیائی و بےغیرتی پسند ہے تو تیار ہو
ہوجائیں کہ فنا کا دروازہ اُنکے لئے کھلا ہوا ہے - اگر مسلمان خود اُدھر کا رُخ کرنے میں ہچکچائیں گے
تو اُسکا مقناطیسی اثر خود کھینچکر ہاضم کرلیگا - خدا کے لئے جاگو اور سنبھلو، دنیا کی قوموں کو دکھادو کہ ہم
وہی ہیں جنکی غیرت و حمیت کے کارنامے جنکی دیانت و سیرچشمی کے افسانے، جنکی تہذیب و تمدن کی داستانیں
اب بھی ہم ایسے مردہ دلوں کو سناتی ہیں -

(۱۸ - جون ۱۹۲۵ء مطبوعہ روزنامہ ہمدم لکھنؤ)

حکومت آصفیہ مین
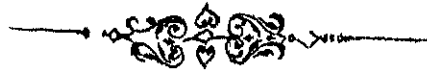
ایک بہترین اخبار کی ضرورت

فی زمانا مہذب اور ترقی یافتہ ممالک کی کامیابی کا ٹرا راز تجارت ہے تجارت کے مختلف اقسام مین سے ایک پیس بھی ہے پریس تجارت کی ایک مہذب شاخ ہے اور اخبار اُس سے مہذب تر ہے۔ یورپ اخبار ہی کے سہارے سے چلتا اور اُسی کی قوتون سے نشو و نما پا رہا ہے اسی کی رہبری اُسکے منازل ترقی کو طے کراتی ہے اور نیم تہذ قومون کے لئے خضر راہ کا کام دیتا ہے۔

یورپ و امریکہ اخبار کی ٹری منڈیان ہین وہان کے بازارون کی رونق بھی اخبار ہین اور گلیون کی زینت بھی اخبار، وہان اخبار ہزارون نہین لاکھون کی تعداد مین چھپتے ہین اور ایک جنس ہر لعزیز کی طرح ہاتھون ہاتھ نکل جاتے ہین یورپ و امریکہ کے بادشاہ، امیر، متوسط و غریب، ہر ایک اسکا شیدائی ہے ہر صبح کو ہر ایک پہلے اخبار ٹرھ لیتا ہے اُسکے بعد چا کے گرم گرم گھونٹ حلق سے اُتارتا ہے پہلے ملک و قوم کی حالت سے باخبر ہو لیتا ہے اُسکے بعد دوسری فکرون مین اُسکا دماغ مصروف ہوتا ہے۔ لندن ٹائمز تو ہوائی جہازون پر چھپتا ہے اور ہوا پر اُڑنے والے پرندون (مسافر) کو فضائے لطیف مین تازہ بتازہ نوع بنوع حالات سُنا سُنا کر سفر کی حالت مین بھی ملک یعنی مسافرون کو دُنیا کے حالات سے بے خبر نہین رکھتا۔

ہندوستان مین بھی ۱۸۳۶ء سے اخبار کا رواج ہوا اور سب سے پہلے دہلی نے اسکا خیر مقدم کیا، وہان سے یہ ہوا پھیلی اور عام ہوئی۔ اُس وقت سے اِس وقت تک سیکڑوں نے اخبار نکالے اور بند ہوئے کچھ مالی مشکلات کے شکار رہے، کچھ اہل ملک کی بدمذاقی پر نثار ہوئے کچھ حکومت و قانون پر قربان ہوئے اور بعض ایسے بھی ہین جو اب تک سسک سسک کر ایڑیان رگڑ رہے ہین لیکن افسوس ہے کہ اب تک ہندوستان مین اخبار بینی کا ذوق یورپ کی طرح سے عام نہیں ہوا ہے، وہان اسکا مطالعہ واجبات سے ہے یہان مستحب ہونے مین بھی شبہ ہے، وہان شوق و دلچسپی سے پڑھکر مفید نتیجے نکالتے ہین، یہان جو پڑھتے بھی ہین وہ بیشتر اوقات گزاری کے لئے یا اُن اشتہارون کی غرض سے جن مین "عود شباب" کا نسخہ ہو، یا بے روزگارون کی کسی گوشے سے مانگ۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو حقیقی ذوق تو ہے مگر اپنی مفلسی و کم مائگی کی وجہ سے مجبور ہین کس قدر عبرت و افسوس کا مقام ہے کہ اُس ملک کی حالت یہ ہے جو اپنی آبادی و زرخیزی کے لحاظ سے دُنیا مین ضرب المثل ہے۔ ۳۲ کروڑ کی وسیع آبادی مین جہلا کی کثرت اور تعلیم یافتگان کی قلت ہے اور ناداری اُس پر طرہ، فقدانِ تعلیم ہو، یا ناداری، بے حسی یا غفلت، کثیر التعداد آبادی کسی نہ کسی سبب سے یہ جانتی ہی نہین کہ ہمارے ملک کی کیا حالت ہے، حکومت کے نظام و اصول کیا ہین، حکومت کا طریقۂ انتظام کیا ہے، ملکی فلاح و بہبود کی کیسے صورتین پیدا ہوتی ہین اور پھر کیونکر مرجاتی ہین اور غریب رعایا کی صلاح و فلاح اور اُنکی خوشحالی کے لئے کیا تدبیرین ہو رہی ہین اور وہ تدابیر کس حد تک مفید ہین یا اور کہان تک مضر، ان ضروری باتون پر اخبار اپنے صحیح معلومات کی بنا پر حکومت اور رعایا کو توجہ دلاتا اور مفید مشورے دیتا ہے اور جائز حد کے اندر انکو رواج دینے یا مٹانے کی ہر ممکن کوشش عمل مین لاتا ہے۔

برٹش انڈیا مین انگریزی اخبار بھی نکلتے ہین اور اُردو بھی، ہفتہ وار بھی ہین اور سہ روزہ بھی مگر وہ ہندوستانی ریاستین جو امتیازی درجہ رکھتی ہین اور اصلاح و ترقی کے راستون سے بھی

گذر رہی ہین اپنے دورِ حکومت مین اخبارون کا مستقل و رشاندار وجود قایم کرنے سے غافل ہین۔ فن صحافت بھی دیگر فنون کی طرح زندگی کے لئے نہایت ضروری فن ہے ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست حکومت آصفیہ (دکن) ہے جہان دو روزانہ اخبار (مشیر دکن صحیفہ) اپنی زندگی کا یقین دلانے اور اخبار کی صف مین شمار ہونے کے لئے نکلتے تو ہین اور اخبار کی صورت بھی رکھتے ہین اور اپنے صفحون کو بھی خالی نہین رکھتے مگر ان پانچ ماہ لون مین بیدار کرنے والی چمک پیدا نہین ہوئی جس سے اخبار عبارت ہے ان سے یہ دونون کوسون دور ہین جہان عثمانیہ یونیورسٹی ہو، جہان تالیف و تراجم کا ایک وسیع محکمہ ہو، جہان وسیع النظر، وسیع الخیال اور قابل ترین اہل علم کا جماؤ ہو، جہان تعلیم کی ارزانی ہو، جہان سید کامون کا اخبار اور علم و فن کی معراج ہو وہان ایک بہترین "روزنامہ" کی کمی قابل تلافی کمی ہے اور ایسی ملکی ضرورت ہے جو رعایائے دکن کی بیدار کو اکسا سکیگی اور انکو اپنے ملک کے حالات سے باخبر رہنے کا واحد ذریعہ بن سکیگی صحیفہ و مشیر کو دربار آصفی سے مستقل امداد ملتی ہین اور ممالک محروسہ سرکار عالی مین انکی اشاعت بہت معقول اور کافی ہے مگر افسوس ہے کہ اسکی آمدنی کا بڑا حصہ اخبار کی ترقی مین صرف نہین کیا جاتا، اور نہ اسکی باگ کسی ماہر فن کے مشاق ہاتھون مین ہے۔ جن اخبارون کی عمرین دکن کی علمی فضا مین جوان ہوئی ہون، انکی جوانی کو دنیا دیکھ کر ہنستی ہے۔

ہندوستان مین برطانیہ کے بعد جسکا (دولت آصفیہ) شمار ہوتا ہو جسکی حکومت کیا بلحاظ رقبہ کیا بلحاظ آمدنی اور کیا بلحاظ انتظامات سلطنت یورپ کی بعض سلطنتون سے ٹکراتی ہو وہان ایک اخبار کی کمی تاسف انگیز کمی ہے۔ اگر عروس البلاد دکن سے حکومت آصفیہ کا نیم سرکاری اخبار جیسا کہ برٹش حکومت کا پاینیر اور انگلشمین مشہور ہے شایع ہوا کرے اور کسی قابل دماغ کے سایہ مین پرورش پاتا ہے تو اسکے ذریعہ سے ملک کی وہ کڑ گویا اعلیٰحضرت کی شاہانہ نظرون تک

پہونچ جایا کرینگی جنکی صلاح کے لئے بندگان عالی کی اصلاح پسند طبیعت ہر وقت متجسس اور جویان رہتی ہے۔ اُن بیشمار اصلاحات پر نظر کرتے ہوئے جن سے دکن مستفید ہو چکا ہے اور ابھی یہ معلوم "عثمانی برکات" کی بارش دکن کی سحر زمینوں کو کہاں تک سیراب کریگی ایک روزنامہ کا اضافہ بہترین اضافہ ہوگا جس کے لئے شمالی ہند کے کسی ماہر اخبار نویس کی خدمات چار چاند لگا دیگی یعنی دکن کا تنہا روزنامہ لکھنؤ کے "ہمدم" دہلی کے "ہمدرد" بمبئی کے "خلافت" اور پنجاب کے "زمیندار" کے دوش بدوش کھڑا ہو سکیگا۔ اسکے اجرا سے حکومت کو جو فوائد ہونگے اور اسکے ذریعہ سے اُن کارروائیوں اور ریشہ دوانیوں کا انکشاف جس متانت و سنجیدگی سے ہوجایا کریگا وہ دکن کی تاریخ میں یادگار رہیگا۔ خوش نصیب ہے وہ رعایا جسکا بادشاہ انہیں کی صلاح و فلاح میں مصروف رہے اور انہیں کی بہبودی کی تدابیر میں اپنی دماغی قوت اور عزیز وقت صرف کرے۔

(۲۵- جون سنہ ۱۹۲۵ء مطبوعۂ روزنامۂ "ہمدم" لکھنو)

کشمیری مسلمان اور ہم

مسلمان لیڈر جب اسٹیج پر کھڑے ہوجاتے ہیں تو اپنی طاقت لسانی سے پہاڑوں کو ہلا دیتے ہیں، انسانی جذبات میں ہیجان پیدا کر دیتے ہیں، در و دیوار سے صدائے بازگشت آنے لگتی ہے، قلم ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو ماضی کے کارنامے اور مستقبل کے واقعات آئینہ کی طرح سامنے کر دیتے ہیں۔ اُس وقت جوش کا دریا اُمڈ آتا اور قوتوں کی لہریں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اُسی وقت تک ہوتا ہے جب تک زبان جنبش کرتی رہتی ہے اور قلم حرکت! اِس میں سکون پیدا ہوا اور دریا اپنی اصلی سطح پر قائم ہوگیا۔ چند منٹ پہلے کا نہ وہ درد ملّی کا چڑھاؤ رہا اور نہ وہ ہمدردی اخوت کا جذبہ۔ کڑھی کا اُبال تھا جو آیا بھی اور دیکھتے دیکھتے غائب بھی ہوگیا۔ اگر استقلال اسی کا نام ہے، خصلت کی پختگی اسی کو کہتے ہیں۔ ہمت کی بلندی کا یہی زینہ ہے۔ قومی درد کا درمان اسی سے عبارت ہے۔ تو موجودہ مسلمان اپنے سلف پر فخر کرنے کے کیوں مدعی ہیں!۔

ٹرکی و ایران، مصر و عربستان، ریف و افغانستان کے خواب اگر ہر رات کو نظر آتے ہیں تو اُنکی نیک تعبیریں بھی ہر صبح کو دیتے رہیئے۔ یہ وسیع الخیالی اور ہمدردی عامہ کا ثبوت ضرور ہے مگر پہلے گھر کی خبر لیجئے، محلہ کا چکر لگائیے پھر ملکوں کی سیر کا ارادہ کیجئے۔ جب اپنے ہی گھر کی خبر نہ ہوگی اپنے ہی محلہ سے واقفیت نہ ہوگی تو ملکوں کے پیچدار راستے کیونکر معلوم ہو سکیں گے۔ ٹرکی پر مصیبت آتی ہے تو ہم بدحواس ہوجاتے ہیں۔ ریف جہاد کے لئے تلوار نکال لیتا ہے تو ہم اُنکی قلت کا لحاظ کر کے پریشان ہوجاتے ہیں مصر کی آزادی سلب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو ہم اپنی آزادی کو منزلوں

بیٹھے دیکھکر افسوس کرتے ہین - عربستان مین محاربہ جدال و قتال گرم ہوجاتا ہے تو ہمارا دل ہل جاتا ہے، افغانستان کو اٹالیہ صرف دھمکی ہی دیتا ہے تو ہم برافروختہ ہوجاتے ہین ایران مین اگر کسی طرف سے آگ کے شعلے بلند ہوجاتے ہین تو ہم اپنے آنسوؤں کے چھینٹوں سے بجھانا چاہتے ہین مگر انکی حالت پر کوئی آنسو نہین بہاتا اُنکے درد کی کوئی دوا تجویز نہیں کرتا، اُنکی امداد کے لئے کوئی کمر ہمت نہین کستا اُنکو طوفانی سمندر سے نکالنے کے لئے کوئی غوطے نہین لگاتا، اُنکے کرب و رنج پر کوئی قلم کو حرکت اور زبان کو جنبش نہین دیتا جو "پس دیوار" اپنی مصیبتون سے کراہ رہے ہین ایسی تکلیفوں پر رو رہے ہین - اپنے درد سے تڑپ رہے ہیں بھوک سے مر رہے ہین اور پیاس سے جی رہے ہین - موسمون کی ناقابل برداشت سختیین اپنے نحیف و کمزور جسمون پر اُٹھا رہے ہین، نہ انکی فریادین ہمکو متاثر کرتی ہین اور نہ انکی تکلیفوں کا احساس واقعی ہوتا ہے کیا ہمارے کان بھی آنکھون کی خاصیت رکھتے ہین؟ کہ کوئی نزدیک ہین ہے اور کوئی دور ہیں - کانون کو تو قریب کی صدائین نقارہ کا کام دیتی ہین کشمیر ہندوستان ہی مین واقع ہے اسکی آواز ہمارے کانون سے متصل ہے اور اسکی صورت ہماری آنکھون سے قریب، یہ ہندوستان ہی کا ایک خوبصورت محلہ ہے جہان "یوسف جمالون" کی آبادیان ہین اور "کنعان کشمیر" کی بستیان یہی انکی زندگی کے قید خانے ہین اور یہی انکی حیات کے سرچشمے -

یہ سب کلمہ گو مسلمان ہین - انکی تکلیف ہماری تکلیف، اُنکا درد ہمارا درد ہے - انکو مصیبتون سے بچانا ہمارا فرض! اگر مسلمانون کی قوت سلب ہو چکی ہے، اُنکی ہمتون نے جواب دیدیا ہے تو اسلامی ہمدردی کا نام لینا ہی چھوڑ دین - انکو اپنی برادرانہ صف سے خارج ہی کردیں کہ وہ صبر کرلیں اور ہم بھی خاموش ہوجائین - لڑنے بھڑنے اور شور و غل مچانے سے کام نہیں چل سکتا - تہذیب کی بقا اور صبر کا وقار ہمارا آبائی ورثہ ہے، مایوسی ہمارے مذہب مین کفر ہے - ناامیدی ہمارے مشرب میں گناہ،

کیا اپنے مصیبت زدہ بھائیون کو ان خوفناک گھاٹیون سے نکالنے کی کوشش بھی نہین کر سکتے جو کشمیر کے مظالم سے نالان اور ہر وقت کی جسمانی و روحانی مصیبتون سے تنگ آکر جان دینے کے لئے تیار ہین - اگر محلہ کی حالت ہم درست کر سکے - اپنی قوت کو ایک مرکز پر لا سکے اپنی مدد آپ کر سکے تو دنیا اندازہ نہین یقین کر لے گی کہ اس قوم کے ایک فرد کی بھی "پکار" سب کو جگا دیتی ہے ہزارون میل کی صدائین بھی اس قوم کے لئے وہی کام دیتی ہین جو محلہ کی خاموشیان اپنا اثر رکھتی ہین - اگر کشمیر کی حکومت اپنی آبادی کے ان ۹۰ فی صدی مسلمانون سے بیزار ہے انکو تباہ کر دینے کا بیڑہ اس نے اٹھا لیا ہے تو ہماری تنہا چیخ پکار "حسّیت رضی" کے لسنے والون کو جو بکا بھی تو نہ سکیگی، سوا اس کے کہ ہماری متانت کو صدمہ پہنچے، کوئی قوت نہین رکھتے کہ اسکا اعلان کرین، کوئی زور نہین رکھتے کہ اسکو دکھائین، بندگی و بیچارگی صبر و شکر پر ہمارا ایمان ہے، یہی ایمان اپنے مظلوم بھائیون کو مجبور ہو کے ہجرت کا مشورہ دینا چاہتا ہے جنکے مصائب نے ہماری نیندیں اڑا دیں جنکی تکلیفون نے ہمارے آرام مین خلل ڈال دیا - اگر کشمیر کی آب و ہوا سے صحت و تندرستی کی امید ہوتی تو آبائی وطن چھوڑنے کی کیون ترغیب دی جاتی -

مسلمانون کا ٹھکانا مسلمانون ہی کا ملک ہو سکتا ہے قربت کے لحاظ سے تو ایران کی سرحد کشمیر سے ملی ہوئی ہے اور ہندوستان مین سب سے بڑا اسلامی خود مختار ملک "دولت عثمانیہ آصفیہ" (حیدرآباد دکن) ہے - ایران کا قائد اعظم سردار رضا خان[1] بھی اپنے پڑوسیون کو پناہ دے سکتا ہے اور "دولت آصفیہ" کا تاجدار بھی (آئی مردہ) کی کا مسیحا ہو سکتا ہے، جو مظلومون کا دوست اور بیکسون کا ہمدرد ہے اسکی اسلامی رواداری سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہین کہ وہ انکا خیر مقدم کریگا - دکن کی سرزمین جسکے خمیر مین "محبت" کا عنصر غالب ہے اپنے لاوارث فرزندون کو اپنے آغوش محبت مین

---

[1] اب شاہ ایران ۱۲

جگہ دیگی اور اس مین کا تنہا مالک (اعلیحضرت سابع) جسکا دل اسلامی درد سے دھڑکتا ہے اور
کلمہ گویون کی تکلیف سے متاثر ہوتا ہے مدد کریگا۔ اُنکی مصیبتون کو دُور کریگا۔ قلمرو نظام کا غیر آباد رقبہ
اسکے حسین چہرون سے ڈھک اُٹھیگا جنوبی ہند کی سیاہ فام قومین انکو خوبصورت دیوتا سمجھکر پرستش
کرینگی۔ کیا رہنمایان ملت سے یہ بھی نہین ہو سکتا کہ وہ کشمیری مسلمانون کے مرض کا علاج "حکیم دکن"
کی تجویز کے حوالہ کردین؟ اور قلمرو نظام مین آباد ہونے کا پتہ لکھوا دین جب بارگاہ عثمانی مین ہمارا یہ
ملت کا متفقہ معروضہ پیش ہوگا تو ان بیکس مسلمانون کا آخری ٹھکانا شاہی فرمان سے ہو جائیگا۔
اگر موپلے سرزمین دکن پر اپنی اپنی چادرین تان کر ڈیرے ڈال سکتے ہین تو کشمیر کے مسلمان بھی
اپنی لطیف کشمیری چار کا سماور گرم کر سکتے ہین جن کے لئے کشمیر اس وقت اڈمان سے بدتر ہے
اور جو مصائب کے آخری زینہ پر تھک تھککر بیٹھ رہے ہین اور موت کا بےچینی سے انتظار کر رہے ہین۔
کشمیر کے مسلمان تنہا نہین آئینگے بلکہ اپنی صنعتون اور دستکاریون کو بھی قلمرو نظام مین
ساتھ لیجائینگے اور وہان اپاہج ہو کر نہین بیٹھ رہین گے بلکہ ہاتھ پاؤن سے کام لیکر دکن کی صنعت
و زراعت کو تقویت پہنچا سکین گے۔ ان مین موروثی کاشتکار بھی ہین اور فطری صناع بھی، یہ
جس طرح بنجر زمینون کو اپنی جسمانی مشقتون سے کارآمد بنا سکتے ہین اسی طرح اپنی دستکاریون
سے بھی اہل دکن کو حیرت مین ڈال سکتے ہین۔ یہ مسلمان بھی ہین اور کاشتکار و صناع بھی۔ ان کو
صرف رحم کا سہارا اور اطمینان کی جگہ درکار ہے

مطبوعہ ذوالقرنین بدایون - ۱۱ - اگست ۱۹۲۵ء

قومی ہفتہ

قومون کے اپنے اپنے سال اپنے اپنے مہینے اور اپنے اپنے مخصوص دن ہوا کرتے ہین
اور اپنے ہی قومی زبانون مین بولے بھی جاتے ہین اِسی طرح ہر قوم کا اپنا مذہب ہوتا ہے اور اپنے
ہی مخصوص عادات و اطوار ہر قوم اپنے ہی معتقدات کی پابند ہو کر غم و مسرت کی مذہبی تقریبون
مین حصّہ لیتی ہے ایران اپنا نوشیروانی سال "نوروز" سے شروع کرتا ہے اور آذر آبان کے
نامون سے اپنے زرتشتی بادشاہون کے آتشخانون کو ٹھنڈا نہین ہونے دیتا۔ عیسائی حضرت عیسیٰؑ
کی پیدائش سے اپنے سال کو "خوش آمدید" کرتے ہین اور جنوری و دسمبر کے نامون سے اپنی
قومیت کا اعلان کرتے ہین، مسلمان ہجرت نبویؐ سے اسلامی سال کا بنیادی پتھر رکھتے ہین
اور محرم و ذی الحجہ کے نامون سے خوشی و غم کے جذبات اُبھارتے ہین۔ ہندو "اکادسی"
سے بکرماجیتی سمبت کو اُجین کے آثار سے تلاش کر لاتے اور چیت بیساکھ کے ہندی نامون سے
اپنے ہندی ہونے کا یقین دلاتے ہین غرضکہ ہر قوم اپنے ہی عادات و خصائل سے تنذشہ ہے اور اپنے
ہی مذہب و زبان کے ساتھ شہرت پذیر۔

ہندوستان مین جب سے مسیحیت کا دَور دَورہ ہوا اس نے ہندو مسلمانون کے سال کو
باقی رکھا، اور نہ مہینون کو، نہ دن یاد رہے اور نہ تقریبین، مغلوب غالب کا اثر قبول کرتا ہے
محکوم حاکم کا تابع ہوتا ہے، مگر نہ اتنا، حتٰی کہ ہندوستانی قومون نے اپنی قومی روایات کو عیسائیت
مین ضم کر کے اپنی قومیت کو مٹا دیا۔ اگر مسیحی دنیا "بڑے دن" مین عید رات شب برات مناتی

ہے تو وہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش کے زمانہ کا احترام کرتی ہے۔ اگر کھیل کود اور سیر و تفریح میں اپنا دل بہلاتی ہے تو یہ اسکی زندگی کا ثبوت ہے۔ اگر وہ ایک جگہ جمع ہو کر کھاتی پیتی اور گلچھرّے اُڑاتی یا تبادلۂ خیالات کرکے "مسیحؑ" کا ترانہ گاتی ہے تو اسکی پیغمبر پرستی اور مذہبی زندگی کا پہلا اور مبارک دن ہے مگر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسلمان اِس ہفتہ کو اپنا قومی ہفتہ کیوں سمجھتے ہیں؟
اگر اِس سبب سے کہ مسیحؑ کے صدقہ میں یہ زمانہ بڑے دن کی تعطیلوں کی وجہ سے فرصت کا ہوتا ہے اور غلامانِ مسیحؑ اپنے اپنے فرائض سے آزاد ہو کر قومی جلسوں میں شرکت کر لیتے ہیں تو کیا اِس سے ہماری فراغت کا اظہار ہو جاتا ہے؟ کیا فرصت کا دوسرا زمانہ نکلنے سے بھی نہیں نکل سکتا؟ ہر کام ارادہ کی پختگی اور عزم کی استواری سے انجام پاتا ہے اگر ہم پیروی مسیحؑ ہی پر مٹے ہوئے ہیں اگر ہمارا تثلیث ہی پر ایمان ہے تو نہ ہمارا مذہب ہے اور نہ ہماری قومیت۔
دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے پیغمبر اسلام نے بھی کوئی خاص مہینہ یا کسی مہینہ کے ہفتہ یا عشرہ کو اجتماع قوم کے لئے مقرر و مخصوص کیا ہے یا نہیں؟ سنہ ہجری سے بھی پہلے دین حنیف کے پیرووں نے، توحید کے ماننے والوں نے اُس وقت مخصوص کر دیا تھا جب حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں سے خدا کے گھر (کعبہ) کی پہلی بنیاد پڑ رہی تھی، فریضۂ حج کو ادا کرنے کے لئے سال کا آخری مہینہ اور اسی مہینہ کی نویں تاریخ بھی مقرر کر دی تھی، یہی تو ذی الحجہ کا مہینہ ہے جسکی نویں دنیا کے مسلمانوں کو اپنے مقناطیسی اثر سے مقامات بعید سے کھینچ کر اور "مرکز ایمان" پر سمیٹ کر جمع کر دیتی ہے۔ اِن کھنچ آنے والوں میں غلامانِ مسیحؑ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ فرض کی بجا آوری غیر ضروری پابندی کو ٹھکرا دیتی ہے اور غلامی بھی آزادی کا پروانہ محسوس کر کے لکھوا لیتی ہے۔ مگر اسی وقت جب فرض کو فرض اور کام کو کام سمجھ لیا جائے۔
ذی الحجہ ہی کا تو وہ مہینہ ہے جس میں پیغمبرِ اسلام اپنا آخری حج اور اسلام کی تکمیل کرتے

ہمیں لوٹے تھے اور اپنے آخری خطبہ کی فصاحت و بلاغت کہاں دون کے منبر پر یادگار چھوڑ دی
تھی ہم جبتک اپنی ہی باتوں کو یاد نہ رکھیں گے، اپنے ہی پیغمبرؐ کی شاہراہ پر نہ چلیں گے یہ ہمارا
کوئی مہینہ ہو سکتا ہے اور نہ سال، نہ موسم کی خوشگواری سے ہم لطف اندوز ہو سکتے ہیں، اور نہ
"قومی ہفتہ" کی چہل پہل سے ہمیں کوئی مسرت، چھوٹی چھوٹی باتوں کی پابندی سے بڑے
بڑے کام سنورتے ہیں، پہلی ہی سیڑھی آخری سیڑھی پر پہنچا سکتی ہے اور جزہی کل کی خبر دیتا ہے
جب ہمارے قومی خصوصیات ہی باقی نہ رہیں گے تو نہ ہم رہیں گے اور نہ ہمارے قومی نشانات
دوسرون کی تقلید تو ہم اس وقت کریں جب اس کا ہمارے یہاں فقدان ہو، ہمارے بزرگوں کا
بھی دماغ اس سے خالی رہا ہو۔ اپنے پیغمبرؐ کی زبان بھی ترجمان سے نہ سنتا ہو، واقفیت کے مدعی ہو کر
اپنے قومی عادات و خصائل کو دوسروں میں مخلوط، اپنے قومی رسم و رواج کو غیروں میں تحلیل، اپنی
قومی وضع و معاشرت کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف بڑھنا، اپنا عربی گھوڑا ترک کر کے گدھے پر سوار
ہو جانا، قوم کی ناواقفیت پر ناواقفیت کا دھبہ لگتا ہے انکی تقلید کیجئے اس بات کو اختیار کیجئے
جو ہماری زندگی کا سہارا، ہمارے پنپنے کا سبب اور سنورنے کا باعث ہو، نہ کہ اندھی تقلید کر کے
قعر ذلت میں گر کر اپنی قومیت کو "زندہ درگور" کر دینا ہے۔

کانپور میں "خلافت" اور علی گڑھ میں "تنظیم" وغیرہ کی کانفرنسیں کب ہوئیں جب عیسیٰؑ کنواری
مریمؑ کے بطن سے شام میں صبح کا تڑکا کر دیتے ہیں انکے پیرو ہمارے ان افعال پر حسین خلوت خانوں میں
نہیں، بلکہ سبزپوش میدانوں، لہلہاتی کھیتوں، پہاڑ کی برفانی چوٹیوں اور کلبوں کی عمارتوں میں ہنستے
بلکہ قہقہہ لگاتے ہیں جس قوم کے جذبات قومی فنا ہو جائیں، جسکی ذہنیت دوسروں کا سہارا
ڈھونڈھنے لگے جسکے اخلاق دوسروں کی تاسی کرنے لگیں، جو ہر چھوٹے سے چھوٹے کاموں میں
دوسروں کی محتاج ہو جائے، اسکی پامالی خود اسکی تقدیر ہے اور اسی کی ذہنی و دماغی تربیت کا اثر۔

ربیع الاوّل ہمارا پہلا مبارک مہینہ اور ذی الحجہ ہمارا آخری مبارک ترین مہینہ ہے۔ پہلے نے ہمارے پیغمبرؐ کو گودیوں میں کھلایا۔ آخری نے اپنے بھائی ربیع الاوّل کی گودیوں کے کھلائے ہوئے کی زبان سے کہاؤوں کے منبر پر خدائی احکام سُنے اور سمجھائے اجتماع قوم کے فوائد بھی سکھلائے اسی میں ہمارے "قومی ہفتہ" کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہو سکتی ہے، اسی میں ہمارے قومی جلسے ایک مقام کو سالانہ مخصوص کر کے ہو سکتے ہیں ہر شخص ایک جگہ آسانی سے جا سکتا ہے، ادھر اُدھر بھٹکنے اور ایک دل کو دو دو جگہ منتقل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی —

کیا یہ سنت ہوئی قوم کے لئے قابل عمل نہیں؟ سنتیں ہمارے مذہب کی اگر جزو اوّلین نہیں تو کیا "فرض ثانی" بھی نہیں ہیں؟ کیا محمدی سنتوں کو چھوڑ کر عیسوی سنت ہمارے فلاح کا ذریعہ ہو سکتی ہے؟ آنکھوں کو خوبصورت بنانے یا بصارت کو تیز کرنے کے لئے بوڑھے بوڑھے سُرمہ لگاتے اور یہ کہہ کر راتوں کو سلائی پھیر لیتے ہیں کہ یہ پیغمبرؐ کی سنت ہے، اپنے نفس کی پیاس بجھانے کے لئے "عقد زوجیت" کا رشتہ بغلگیر ہو ہو کر جوڑتے ہیں اور سعدیؒ کی زبان سے یہ کہہ بھی دیتے ہیں کہ ع

"در گلویم سنت پیغمبر است"

جب ہیؐ کی مراد ہمارے لئے سنت ہے تو کیا چند سنتوں کو اختیار کر کے باقی کا ترک اگر گناہ نہیں تو قابلِ ملامت بھی نہیں ہے؟ غیروں کو یہ کہنے کا موقع نہ دیجئے کہ —

"یہ وہ قوم ہے جس کا نہ مذہب باقی ہے اور نہ قومی عادات و اطوار"

مطبوعہ رنگار مشین پریس "نظیر آباد" لکھنؤ
باہتمام سید مقبول حسین وصل بلگرامی